UNIVERSAL LIBRARY
OU_224556
UNIVERSAL LIBRARY

DAMAGE BOOK

مجلہ عثمانیہ

مجلۂ عثمانیہ

طلبہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ

مدیر: عبد العلی خاں بی۔ اے عثمانیہ
نائب مدیر: محمد شمس الدین فاروقی بی۔ اے عثمانیہ

مطبوعہ شمس المطابع مشین پریس نظام شاہی روڈ حیدرآباد دکن

جلد (۱۲) | **مجلس انتظامی** | شمارہ (۱) اور (۲)

سال تعلیمی ۴۸-۱۳۴۷ف

صدر

قاضی محمد حسین صاحب

ایم۔اے۔ال ال بی (کینٹب) نائب معین امیر جامعہ عثمانیہ

مشیران حصۂ اردو

ڈاکٹر مولوی عبدالحق بی۔اے (علیگ) ڈی لٹ
پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ام۔اے پی ایچ ڈی (لندن)
ریڈر اردو جامعہ عثمانیہ

مشیر حصۂ انگریزی

مسٹر ایف۔جے۔اے ہارڈنگ ام۔اے (آکسن) پروفیسر انگریزی جامعہ عثمانیہ

خازن اعزازی

مولوی وحید الرحمن صاحب بی۔ایس سی پروفیسر طبیعیات جامعہ عثمانیہ

معتمد

عبدالعلی خاں بی۔اے (عثمانیہ) مہتمم مدیر و مدیر حصۂ اردو مجلّہ عثمانیہ

اراکین

میر عباس علیخاں صاحب بی۔اے صدر انجمن اتحاد

محمد شمس الدین صاحب بی۔اے مدیر حصۂ اردو

میر عابد علی خاں صاحب مدیر حصۂ انگریزی متعلم بی۔اے (آخری)

مجلّہ عثمانیہ

جلد (۱۲) شمارہ (۱) اور (۲)

مجلس مشاورت

صدر

قاضی محمد حسین صاحب

ایم۔ اے۔ ال ال بی (کینٹب)

نائب معین امیر جامعہ عثمانیہ

مشیران حصّہ اُردو

ڈاکٹر مولوی عبدالحق بی۔ اے (علیگ) ڈی لٹ پروفیسر اُردو جامعہ عثمانیہ

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ ایم۔ اے پی ایچ ڈی (لندن) ریڈر اُردو جامعہ عثمانیہ

مشیر حصّہ انگریزی

مسٹر ایف۔ جے۔ اے ہارڈنگ ام۔ اے (آکسن) پروفیسر انگریزی جامعہ عثمانیہ

خازن اعزازی

مولوی وحید الرحمٰن صاحب بی ایس سی پروفیسر طبیعیات

چندہ سالانہ پیشگی

(۱) سرکار آصفیہ و برطانیہ سے	عـلـہ ۱۲/ روپیہ
(۲) ارباب جامعہ اصحاب مقتدر اور اداروں سے	۸ے/ ″
(۳) عام خریداروں سے	۶ے ″
(۴) طلبائے قدیم رفاہیہ انجمنوں اور دار المطالعوں سے	۵ہ/ ″
(۵) طلبائے جامعہ عثمانیہ سے	۳ہ/ ″
(۶) ممالک بیرون ہند سے	۱۵ شلنگ
(۷) بلاد یورپ کے طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ سے	۱۰ شلنگ
(۸) فی رسالہ	عار/ روپیہ

ملنے کا پتہ

دفتر "مجلہ عثمانیہ" جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

مجلہ عثمانیہ

جلد دوازدہم سنہ ۱۳۴۷-۴۸ف شمارہ اول و دوم

فہرست مضامین

صفحہ	مضمون نگار	مضمون	نمبر شمار
۱	محمد علی صاحب نیر (عثمانیہ)	تاجدار حریت	۱
۳	محمد شمس الدین صاحب فاروقی	اتاترک غازی مصطفےٰ کمال	۲
۱۱	امجد	رباعیات	۳
۱۳	محمد عمر صاحب مہاجر متعلم سال چہارم	ادب کا ترقی پسند نظریہ اور اردو	۴
۲۵	امجد	قطعہ	۵
۲۶	ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب	اک حسرت دل میں رہتی ہے جس حسرت کا کچھ نام نہیں	۶
۲۹	محمد عبدالرحیم خان صاحب متعلم ایم۔ ایس۔ سی۔ (آخری)	جوہر کی ساخت	۷
۴۰	ساز	مری ایک رات	۸
۴۳	محمد عبدالقیوم خان صاحب باقی	پیرہن	۹
۵۸	صاحبزادہ میر محمد علی خان صاحب پیکش	ہندوستان	۱۰
۶۲	محمد احمد صاحب سبزواری بی۔ اے (عثمانیہ)	ایک گاؤں کی فی کس سالانہ آمدنی	۱۱
۶۳	سکینہ	رباعیات	۱۲
۶۴	محمد اسداللہ سعید صاحب ایل۔ ایل۔ بی (ابتدائی)	موجودہ عمومتیں اور ان کی خامیاں	۱۳
۸۵	باقی	آئین اضطراب	۱۴
۸۶	سلطان احمد صاحب (عثمانیہ)	بیسویں صدی کا سینزر	۱۵
۹۶	جلیل قدوائی صاحب	غزل	۱۶
۹۷	محمد دلاور خان صاحب مہدوی بی۔ اے سال سوم	لافانی محبت	۱۷

نمبرشمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱۸	آگے آگے	پنڈت ونشی دھر وویالنکار صاحب (جامعہ عثمانیہ)	۱۰۲
۱۹	مرحوم مشاہیر	محمد حبیب اللہ اوج صاحب	۱۰۴
۲۰	التجا	عزیز احمد صاحب	۱۰۷
۲۱	زیر زمین پانی کا عمل	سید محمد احمد الدین صاحب بی۔اے (عثمانیہ)	۱۱۹
۲۲	حسن	طیب	۱۲۵
۲۳	دکن بٹن فیکٹری	احمد خان صاحب متعلم سال چہارم	۱۲۹
۲۴	غزل	امجد	۱۴۵
۲۵	مشرقی لندن کی سیر	محشر عابدی	۱۴۷
۲۶	وداع	محمد محبوب حسین صاحب متعلم بی۔اے۔ (عثمانیہ)	۱۷۱
۲۷	اشکِ نظر	نظر	۱۷۲
۲۸	فلسفہ ابن خلدون	عبداللہ العمادی صاحب	۱۷۳
۲۹	آنکھ مچولی	تمکین	۱۷۹
۳۰	بلند قوہ۔ پیدائش اور استعمال	حامد علی عباسی صاحب متعلم یم۔ایس۔سی (عثمانیہ)	۱۸۱
۳۱	پنگھٹ	حبیب اللہ صاحب اوج	۱۸۹
۳۲	ریاست حیدرآباد کے معاشی ذرائع کیا ہیں	محبوب علی صاحب بی۔اے۔ (عثمانیہ)	۱۹۰
۳۳	کسان	فصیح	۱۹۹
۳۴	طواف قمر	ظہیر الدین صاحب رونق متعلم بی۔ایس۔سی	۲۰۱
۳۵	ایک یادگار رات	رشید	۲۱۵
۳۶	سماج کی جے	مرزا ظفر الحسن صاحب بی۔اے۔ (عثمانیہ)	۲۱۷
۳۷	چشمہ	سید وہاج الدین احمد صاحب شمیم	۲۲۵
۳۸	کلیہ کی خبریں	عبدالعلی خان۔ بی۔اے (عثمانیہ) مدیر	۲۲۸

تاجدارِ حُرّیّت

مجاہدِ اعظم نجات دہندۂ ترکی غازی مصطفیٰ کمال اتاترک کے رُوح فرسا سانحۂ ارتحال پر

نیرؔ صاحب کو مقابلہ نظم گوئی جامعہ عثمانیہ میں اس نظم پر انعام اول دیا گیا۔ (مدیر)

اے عظیم المرتبت مردِ مجاہد الوداع
تاج دارِ حُرّیتِ مشرق کے قائد الوداع

الوداع اے ملتِ بیضا کے رہبر الوداع
الوداع اسلام کے تابندہ گوہر الوداع

الوداع اے قوم و ملت کے فدائی الوداع
قادرِ مطلق کے اے سچّے پجاری الوداع

موت تیری سانحہ ہے روح فرسا سانحہ
جس کو سُن کر اوڑھ لی فطرت نے اک غم کی رِدا

خرمنِ دل پر گریں میرے بھی غم کی بجلیاں
اور اثر سے برق کے اٹھنے لگا دل سے دھواں

اے عَلَم بردارِ ترکی حُرّیّت کے تاجدار
مادرِ گیتی ہوئی ہے تیرے غم میں سوگوار

جانتی ہے تیرا رتبہ آج ساری کائنات
منکشف تو نے کئے دنیا پہ اسرارِ حیات

موت کے زانو پہ ترکی لے رہا تھا سسکیاں
تو نے بخشی اس کو غازی پھر حیاتِ جاوداں

بدنما ہونے کو تھی داغِ غلامی سے جبیں
تو نے عزت رکھ لی قومی آفریں صد آفریں

اس "مریضِ جاں بہ لب" کو تو نے زندہ کر دیا
تو نے انگورہ کو ہمدوشِ ثریّا کر دیا

تو نے پھونکا صورِ آزادی نئے انداز سے
تو نے مُردوں کو جِلایا نطق کے اعجاز سے

کاٹ دی زنجیرِ باطل تیغ جوہردار سے
قوم کی کایا پلٹ دی قوتِ کردار سے

توُنے دوڑایا رگوں میں قوم کی خونِ عمل — دیو استبداد کے سر کو دیا توُنے کچل
اک نئے سانچے میں ڈھالا توُنے ترکی کا نظام — اور دیا عزم و عمل کا قوم کو توُنے پیام
توُنے تازہ کردیا پھر قصۂ دار و رسن — اور مٹا ڈالی وطن سے توُنے ہر رسمِ کہن
تھی رگوں میں خون کے بدلے رواں حُبِ وطن — تیرے دل میں تھے فقط جذباتِ قومی موجزن
تیرا دل ہوتا نہ تھا ہرگز مصائب سے ملول — تیرے عزمِ مستقل کے سامنے کانٹے تھے پھول

پدرِ ترکی تھا حقیقت میں تو شیرِ کردگار
تیری ہمت اور شجاعت سے ہے واقف روزگار

تیرا مٹ سکتا نہیں ہرگز پیامِ زندگی — نقش ہے ملت کے دل پر وہ بہ الفاظِ جلی
اس جہانِ آب و گل سے آہ اب توُ چل بسا — توُ ہمیشہ کے لئے ترکی سے رخصت ہوگیا
آہ! ترکوں کی یتیمی الاماں والحذر!! — آہ رخصت ہوگیا جاں بازوہ قومی پدر
کارناموں پر ترے نازاں تھی ملت اے کمال — تجھ سے مل کر شاد ہوگا خود خدائے ذوالجلال

ہو رہی ہے اب زمانے کی فضا ناسازگار
کاش! رہتا اور زندہ رہبرِ شب زندہ دار

نیرؔ (عثمانیہ)

اتاترک غازی مصطفیٰ کمال

ماضی قریب میں عالم اسلام نے جو چوٹی کے اکابر و مشاہیر پیدا کئے اگر یہ سوال ہو کہ بہ لحاظ جمعیت ان میں سرفہرست کس کو بنایا جائے اور کون ایسا شخص انتخاب کیا جائے جس کی سوانح حیات کے اندر اجمالاً پوری عصر ہذا کی تاریخ آجائے تو جواب میں صرف ایک نام لیا جا سکتا ہے اور وہ رسول عربی کے محبوب نام مصطفیٰ اور کمال کا مجموعہ ہوگا۔

غازی مصطفیٰ کمال کی شخصیت صرف ترکی ہی میں نہیں بلکہ تمام دنیائے اسلام پر چھائی ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے انتقال پر ملال پر دنیائے اسلام سوگ وار ہے۔ اور تمام مشرقی ممالک میں رنج و الم کی ایک بے پناہ لہر دوڑ گئی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اتاترک اپنے زمانے کی ایک بہت ہی عظیم الشان اور بلند مرتبت ہستی تھی جس کی ذات میں وہ تمام خوبیاں سمٹ کر آگئی تھیں جو ایک بدحال ملک کو اوج ثریا پر پہونچانے کے لئے ضروری ہیں اور یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان کی ابتدائی تربیت ایسے گھرانے میں ہوئی تھی جس میں مذہب اسلام سے گہری عقیدت اور پیغمبر اسلام سے دلی محبت تھی۔ اور ان تمام کوششوں میں جو انھوں نے اپنے ملک کی حفاظت کے لئے کی ہیں حب وطن کے ساتھ جوش ایمان بھی موجود ہے جو ان کی عالی حوصلہ ماں زبیدہ خانم کی حسن تربیت کا نتیجہ ہے۔

مصطفیٰ کمال کے دل میں ملک کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور آج صرف ترکی ہی نہیں بلکہ تمام دنیائے اسلام ان کی ذات پر جس قدر فخر کرے کم ہے۔ انسانی کمزوریاں مصطفیٰ کمال میں موجود تھیں ان کے پہلو میں بھی دل تھا وہ واقعات سے متاثر ہوتے تھے لیکن ان کے کردار کا روشن پہلو اس قدر منور ہے کہ اس میں ان کی کمزوریاں چھپ جاتی ہیں۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جنگ عظیم کے بعد ترکی کی حالت سنبھالنے اور سنوارنے میں مصطفیٰ کمال کے تدبر و فراست اور عزم و ارادہ کو بڑا دخل ہے ان کے اس احسان سے ان کا وطن عزیز کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا بلکہ تمام دنیائے اسلام ان کی مرہون منت ہے

جنگ عظیم کے متلاطم دور میں اگر ایک طرف برطانیہ مغربی رائے عامہ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرنا چاہتی تھی اور ترکی علاقوں کو لے کر مسلمانوں کو اپنا دشمن بنانا بھی پسند نہ تھا۔ دوسری طرف وہ اپنے پہلو میں جنگ جو ترکوں کو رکھنا پسند نہ کرتی تھی جو ایسا نہ ہو کہ پھر قوت حاصل کر کے مغربی ایشیا میں برطانوی مفاد کو صدمہ پہونچائیں اس مشکل پر غالب آنے کے لئے حکومت برطانیہ نے یونان کو ترکی علاقوں کا خواب دکھا کر اسے قربانی کے لئے آگے آگے رکھا اس کے علاوہ برطانیہ کا یہ بھی ارادہ تھا کہ درہ دانیال پر ایک بڑا مورچہ قائم کر دیا جائے جس طرح اس نے نہر سویز اور جبرالٹر پر قائم کر رکھا تھا۔

عہد نامہ مدانیہ جس کی رو سے جنگ عظیم میں ترکی کا خاتمہ ہوا تھا۔ ۳۰ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو آدھی رات کے وقت اس پر دستخط ہوئے تھے اور اس کی شرائط کی بنا پر متحدین نے فوراً قسطنطنیہ اور درہ دانیال پر قبضہ کر لیا تھا اور اناطولیہ کی ترکی فوج کو بے ہتھیار کر دینے کی کارروائی شروع کر دی تھی۔

یہ زمانہ ترکوں کے لئے بہت ہی نازک تھا اس لئے کہ ان کے ملک کی پامالی پر متحدین تلے ہوئے تھے اور حالات یہ تھے کہ متحدین کی فوجوں نے درۂ دانیال کے اہم مقامات پر قبضہ کر لیا تھا ان کے جنگی جہازات ارمورہ میں گشت لگا رہے تھے اور باسفورس میں لنگر انداز ہو چکے تھے اور ان کی فوجوں نے قسطنطنیہ کو مورچہ بند کر لیا تھا۔

عہد نامہ مدانیہ پر دستخط ہونے کے بعد انور بے اور ان کے ساتھی دارالسلطنت سے بھاگ نکلے لیکن مصطفیٰ کمال ہی کی شخصیت تھی جو اپنی مختصر سی جماعت کے ساتھ نہایت پامردی اور دلیری سے قسطنطنیہ آ دھمکی جس کو دشمنوں کی فوج نے گھیر رکھا تھا۔

ایسے پر آشوب زمانہ میں جبکہ اتحادیوں کو اپنے ملک سے نکال باہر کرنا تھا مصطفیٰ کمال پر ایک اور مصیبت یہ آ پڑی تھی کہ اس وقت پر سلطنت ترکی دو جماعتوں میں منقسم ہو گئی تھی۔ ایک جماعت جس کا سرگروہ فرید تھا اپنے آپ کو موحد خلافت کہتی تھی۔

یہ جماعت چاہتی تھی کہ ترکی کو متحدین کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے دوسری جماعت جس کے ہیرو مصطفےٰ کمال تھے بعد کو جماعت ملی کہلائی۔ اس جماعت نے جنھوں نے ترکوں پر یونانی سپاہ کے مظالم کے سبب قومیت اور حب الوطنی کی آگ سے مشتعل ہوکر عزم بالجزم کر لیا تھا کہ غنیم کو ملک سے باہر نکال کر ہی رہیں گے۔ اس ارادے کی تکمیل کے لئے مصطفےٰ کمال نے ایک ایسے ملک سے جو جنگ سے تھک کر چور ہو گیا تھا مفلس ہو گیا تھا اور اجڑ گیا تھا نئی فوج بھرتی کرکے مسلح یونانی فوج کے مقابلے میں کھڑا کر دیا اور نتیجتہً ایشیائی کوچک کے ساحل مارمورہ سے لے کر کردستان کے پہاڑوں تک سارے علاقے کو پھونک ڈالا۔

اور بعد میں چل کر نومبر ۱۹۲۲ء میں ایک ایسا معاہدہ ہو گیا جس سے ترکی کو ایک خود مختار قوم تسلیم کر لیا گیا۔ ایسی خود مختار جو بیرونی اثر سے بالکل آزاد رہے۔

مصطفےٰ کمال نے ۱۹۲۱ء ہی میں یونانیوں کو پسپا کرنے کے بعد غازی کا لقب حاصل کیا۔ اور دس برس کے بعد جب فوجی خطابوں کو ترک کر دیا گیا تو ان کے نام سے بھی دریا پاشاہ، حذف ہو گیا اور جب ۱۹۳۴ء میں ہر ترک کے لئے "جدی" نام لازم قرار دیا گیا تو خود اپنے لئے اتاترک کا نام تجویز کیا واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے نام کے ساتھ ملت ترکیہ کی ساری زندگی کو ایک نئے سانچے میں ڈھال دیا اور جدید ترکی زبان کو بھی دوسری زبان بنا دیا اور حقیقت میں ترکی کے باپ کہلائے۔

کمال اتاترک صرف ایک کامیاب سپاہی ہی نہیں تھے بلکہ ایک مصلح قوم کی حیثیت سے بھی ان کا درجہ بہت ارفع و اعلیٰ ہے اور سلطنت ترکی میں وہ زبردست اصلاحات کئے کہ ترکی دیکھتے کے دیکھتے یورپی دول کے ہم پلہ بن گئی اور یورپ کی سلطنتیں ہر صلح و جنگ میں ملت ترکیہ کی طرفداری اور مخالفت کو اپنے لئے باعث فلاح و خطر تصور کرنے لگیں۔

. . . . مصطفےٰ کمال نے جدید اصلاحات کئے، قومی لباس کی اصلاح کے علاوہ انھوں نے قدیم توہم پرستی کی بنیاد اکھاڑ کر پھینک دی اور مردوں کے ساتھ ساتھ ترکی خواتین کے حقوق کا کافی لحاظ رکھا اور ان کی قدرتی قابلیتوں کو منظر عام پر آنے کا کافی موقع دیا۔ بلکہ اکثر اوقات تو انھیں مردوں کے دوش بدوش کھڑا کر دیا چنانچہ اس بات کے اظہار سے بڑی مسرت ہوتی ہے کہ ترکی میں بہت ہی اہم اور گراں بہا خدمات کی ذمہ داری

بھی ترکی عورتوں کے سپرد ہیں اور وہ ان خدمات کو نہایت تن دہی اور خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دے رہی ہیں اس طرح آتاترک نے اپنی زندگی کے مختصر عرصہ میں ہزاروں اصلاحیں ایسی کیں جنھوں نے ترکوں کی کایا پلٹ دی مرحوم کی سیاسی دوراندیشی کا یہ ایک ادنی کرشمہ ہے کہ قسطنطنیہ کو چھوڑ کر اناطولیہ کی پہاڑیوں میں ایک جدید پائے تخت آباد کیا اور ملک کے کاروبار کا بیشتر حصہ غیر ملکیوں کے ہاتھ سے نکال کر قومی کمیٹی کے ہاتھ میں دے دیا۔

ارادہ، عمل، جوش، تدبر اور فراست کے اعتبار سے کوئی ڈکٹیٹر بھی آتاترک کا مقابلہ نہیں کر سکتا یہ عجیب اتفاق ہے کہ عہد حاضر کے چاروں آمروں نے اپنی زندگی کے مراحل نہایت فلاکت اور غربت میں طے کئے لیکن اپنی ذاتی محنت اور دماغی قابلیت سے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور ملک و قوم کے لئے غیر معمولی خدمات انجام دیں جس کے بارے قومیں ہمیشہ سر تسلیم خم کئے رہیں گی لیکن وہ مشکلات جس سے آتاترک کو مقابلہ کرنا پڑا ان کی نوعیت دوسرے آمروں کے مشکلات سے بالکل جداگانہ تھیں ان آمروں کے ہاتھ میں عنان حکومت اس وقت آئی جب کہ ملک کی حالت سکون پذیر نہ تھی تو متلاطم بھی نہ تھی اور ان حالات میں انھوں نے اپنے ملک کے لئے ترقی کا سامان مہیا کئے تو کوئی کمال نہ کیا لیکن ذرا مصطفے کمال کی گوناگوں دقتوں کا تو خیال فرمایئے کہ ایک طرف ظالم یونانی ملک میں بڑی دور تک گھس آئے تھے اور سلطنت برطانیہ الگ اس کی جڑیں کھوکھلی کرنے کی فکر میں تھی اور متحدین نے ترکی کے حصے بخرے کرنے کی ٹھانی تھی اور خود ملک میں دو سیاسی جماعتیں موجود تھیں جن کا قلع قمع کرنا آتاترک کے لئے ہمت شکن تھا لیکن آتاترک کی ہمت بلند عارضی پریشانیوں کو کب خاطر میں لاتی تھی وہ دھن کا پکا چٹان کی طرح یکا و تنہا میدان کارزار میں ڈٹا رہا گولیوں کی بوچھار میں بھی کیا مجال کہ ذرا بھی ارادہ میں تزلزل واقع ہوا ہو اس نے میدان سے اس وقت تک ہٹنے کا نام نہ لیا جب تک دشمن کی فوج کو مناسب حد تک اپنے قابو میں نہ کر لیا یہی وہ اٹل ارادے اور غیر محدود جنگی قابلیت ہے جو آتاترک کو دوسرے ڈکٹیٹروں کے مقابلے میں امتیازی حیثیت دیتی ہے۔ جب اتحادیوں نے دیکھا کہ وہ شخص جس کے پاس نہ آگ اگلنے والی مشینیں تھیں اور نہ بم برسانے والے طیارے تھے اور نہ نشانہ شناس بندوقیں تھیں اور نہ منظم و ترتیب یافتہ فوج تھی اور نہ اسباب و سامان کس طرح بازی لے گیا وہ ایک انقلابی طاقت تھی جو فتنہ بن کر اٹھی اور قیامت بن کر چھا گئی۔ اس کے سینے میں درد سے تڑپتا ہوا دل تھا اس کے بازوں میں خون اور شجاعت جوش زن تھی اس کے دماغ میں حکمت و بصیرت کا نور موجود تھا۔ اس کے عزایم سمندر کی لہروں کی طرح مضطرب مگر پہاڑوں کی چٹانوں کی طرح اٹل تھے۔ انہیں معنوی قوتوں سے اس نے کام لیا اور ملت ترکیہ کے بکھرے ہوئے اجزا کو ایک مرکز پر لا کر اعلان جہاد کر دیا یہی وہ حیرت انگیز کارنامے تھے جنھوں نے دیگر آمروں کی رہنمائی کی۔

. . . . اس لحاظ سے بلا خوف و تردید یہ کہا جا سکتا ہے
کہ وہ ترکوں کا باپ ہی نہ تھا بلکہ دوسرے آمروں کا رہنما بھی تھا اور ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ مصطفےٰ کمال کی مسیحائی نے یورپ کے
مرد بیمار کو موت کے آغوش سے اٹھایا اور زندگی کی اس بلندی پر پہونچا دیا جہاں قوموں کو معنوی دولتیں حاصل ہوتی ہیں لیکن یہ
انتہائی متانت اور خودداری کا ثبوت ہے کہ آتاترک نے باوجود اپنے حربی اور معاشی استحکام کے ہٹلر اور مسولینی کی طرح اپنی قوت کے
گھمنڈ میں انسانیت کے دائرے سے باہر قدم نہ رکھا اور کمزور قوموں کی پامالی سے اپنی شخصیت کو آلودہ نہیں کیا انھوں نے اپنی
قوت اس وقت تک استعمال نہیں کی جب تک کہ اس کی شدید ضرورت نہ پڑی اور وہ ایسا کرنے پر مجبور نہ ہوئے چنانچہ جس وقت
عہد نامہ ورسائی " کے پرزے اڑائے جا رہے تھے آتاترک کو اپنی قوت کے استعمال کا کافی موقع ہاتھ آیا تھا اور وہ بھی ہٹلر و مسولینی
کی طرح بڑے بڑے دعاوی کر سکتے تھے لیکن مصطفےٰ کمال کی غیور طبیعت نے اس عہد شکنی کو خلاف اصول تصور کیا اور ناجائز
فائدہ اٹھانے کے بجائے مجلس اقوام سے دردانیال کی قلعہ بندی کی اجازت حاصل کی ۔

مصطفےٰ کمال نے صرف سیاسی و عسکری انقلاب پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ترکوں کی توہم پرستی پست ذہنیت اور قومی
ادبار کی کالی گھٹاؤں کو جو افق ترکی پر بری طرح محیط ہو گئی تھیں اپنی بے پناہ مستعدی اور بہادری سے ہٹا دیا اور ترقی اور قسمت
کے ستارے کو ایسا چمکایا کہ ساری دنیا کی آنکھیں خیرہ ہو کر رہ گئیں آتاترک نے سیاسی کامیابی کے بعد سب سے بڑا کام یہ کیا کہ
رائے عامہ کو ان قوتوں سے کام لینے کے قابل بنا دیا جن پر ترکانہ استبداد نے " خلافت " کے نام سے قبضہ کر رکھا تھا ۔ کم فہم لوگوں کا
یہ خیال ہے کہ کمال پاشاہ نے خلافت کو ختم کر کے اسلامی سیاست کو نقصان پہونچایا لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس خلافت کو غازی
مرحوم نے دفن کیا وہ خلافت نہیں تھی بلکہ جبر و استبداد کا خونخوار دیوتا تھا جس نے خلافت کی مقدس قبا اوڑھ رکھی تھی وہ خلافت
نہیں تھی بلکہ مطلق العنان حکومت اور خود پسند آمریت تھی جس کی موجودگی میں اسلام کے جمہوری اصول عمل پذیر نہیں ہو سکتے
تھے اس سیاسی اور ذہنی انقلاب کے بعد مصطفےٰ کمال کے وہ شاندار کارنامے شروع ہوتے ہیں جن کو معاشی اور تمدنی اصلاحات
سے موسوم کیا جاتا ہے اس میدان میں بھی انھوں نے اپنے دل و دماغ کے بہترین جوہر دکھائے اور پندرہ
سال کے قلیل عرصے میں جو قوموں کی تاریخ میں ایک دن سے بھی زیادہ اہمیت نہیں رکھتا وہ وہ اصلاحات اور تحریکات
کئے کہ سلطنت ترکی پر بھی دول یورپ کا دھوکا ہونے لگا اور ہمسایہ قومیں ترکی کو رشک کی نگاہوں سے دیکھنے لگیں اور تمدن
کے ہر شعبے میں حیرت انگیز ترقی کر دکھائی اور ملک کیا بلحاظ صنعت کیا بہ لحاظ زراعت کیا بہ لحاظ تعلیم اور کیا بہ لحاظ بحری و

ہوائی اسکیم کا مالک متمدنہ کے دوش بدوش کھڑا ہو گیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مصطفےٰ کمال انقلاب کا پیام بر ہونے کے ساتھ ساتھ آزادی کا بلند، اسلام کا مجاہد، امت مرحومہ کا سوگ دار، اور قومی بقا اور تعمیر کا علم بردار تھا جس نے سلطنت ترکی میں زندگی کے ہر شعبے کو معراج کمال پر پہونچا دیا اس طرح سے آتا ترک گوشت پوست کے مجموعہ کا نام نہیں بلکہ وہ نام ہے ایک قوم کی نشاۃ ثانیہ کا اور اس کی زندگی آئینہ دار تھی اس حیات نوع کی جس کا وہ پیام بر تھا۔ کاش ہم اس آگ کو جو اس کے سینے میں سوزاں تھی اپنے سینے میں منتقل کر سکیں۔

غرض پندرہ سال کے اندر اندر ایک گئے گذرے ملک نے جس کے حصے بخرے کرنے کی دول یورپ نے ٹھان رکھی تھی یہ عروج حاصل کیا ہے کہ اب اس کا شمار یورپ کی اہم طاقتوں میں ہونے لگا ہے اور سلطنت ترکی اپنی وسعت قدرتی وسائل کی مالا مالی اور تمدن کی بوقلمونی کے اعتبار سے تاریخ عالم کی بزرگ ترین سلطنتوں کا ہم پلہ بن چکی ہے۔

ترکوں میں قدرتی طور سے تقلید (اندھی نہیں) اور انجذاب کا ایک عجیب وغریب ملکہ ودیعت کیا گیا ہے جس کی وجہ سے وہ دوسری اقوام کی روح اور کارناموں کو اپنے اندر جذب کر کے ان سے اپنے حسب مطلب کام لے سکتے ہیں۔ اپنے کارناموں سے انھوں نے ثبات عزم اور قوت ارادی کی ایسی مثال دنیا کے سامنے پیش کردی ہے کہ اگر دوسری مشرقی قومیں اسے سمجھیں اور تہذیب وتمدن کے شعبوں میں اس سے کام لیں تو ان میں خودی کا احساس اور خود اعتمادی کی صفت پیدا ہو جائے۔

مصطفےٰ کمال نے ترکی جمہور کو نیند سے چونکایا اور نوجوان ترکوں میں خودی کا احساس پیدا کیا اور مستقبل کی بنیاد دینے رکھنے کے لئے ماضی کو مسمار کرنے میں ذرا تامل نہیں کیا آتا ترک نے اپنے دل کو سخت اور ارادے کو مضبوط بنا کر اپنے وطن عزیز کے لئے جو قربانیاں کی ہیں وہ آیندہ کی تاریخ کے لئے بطور ایک مثال کے ہے اور اس کے بعد سے ہم برابر یہی دیکھتے آئے ہیں کہ ترکوں نے اپنی مٹی ہوئی عظمت اور شوکت کے کھنڈروں میں ایک تازہ روح اور ایک نئی زندگی کی بنیاد رکھی ہے اور ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ اب ترکی تاریخ محض زوال کی رام کہانی نہیں بلکہ جمہور کی روحانی زندگی اور تخلیقی قوت ارادی کی زندہ مثال ہے اور ایک مقررہ منزل مقصود کی طرف برابر ترقی کرتے رہنے کی روئیداد ہے جس کے سپوتوں نے مصطفےٰ کمال کی بے جگر بہادری اور بے نظیر رہنمائی کے زیر اثر لڑائی کے میدانوں میں ایسی ایسی بہادری دکھائی کہ ان کے جانی دشمن بھی ان کا لوہا مان گئے۔ ایک طرف آتا ترک نے ظالم یورپ کے سیاسی حوصلوں کا مقابلہ تلوار سے کیا تو دوسری طرف ان کی ذہانت اور فراست نے ماضی کے نقوش کو ذہنوں سے محو کر کے یورپ کے مایۂ ناز مفکرین اور سیاس کو اپنے اندر جذب کر لیا

مصطفٰے کمال کی یہ جنگ مذہب کے واسطے نہیں بلکہ آزادی وحریت کے لئے تھی۔ جس میں کمال ہمت اور استقلال سے کام لے کر عہد رفتہ کے بہتر سے بہتر سرمایہ کو مستقبل کے فایدے کے لئے بے دریغ قربان کردیا گیا۔

دنیا کمال اتاترک کے نام سے اس طرح واقف ہے کہ اس مرد غازی نے سلطنت عثمانیہ کے آخری لمحوں میں ملت ترکیہ کی تجدید حیات کا ایک ایسا کرشمہ دکھایا جو فنون جنگ کی تاریخ میں ایک عدیم المثال کارنامہ سمجھا جاتا ہے لیکن وہ غازی موصوف کا سب سے بڑا کارنامہ نہیں ہے بلکہ سب سے بڑا کارنامہ تنظیم ملی کا وہ عجیب وغریب تخیل ہے جو انھوں نے نہ صرف اپنے ملک میں بلکہ اکثر مشرقی ممالک میں پیدا کردیا عہد حاضر میں قوموں کی زندگی کے وہ صرف مصلح ہی نہیں بلکہ مجدد بھی تھے اور مجتہد بھی۔ اپنے ابتدائی دور میں جب انھوں نے نوجوان ترکوں کے اس تخیل کو جو تحریک اتحاد اسلامی کے نام سے موسوم تھا نظر انداز کردیا تو اکثر مشرقی ممالک میں ان کا اقدام اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا لیکن آج دنیا دیکھ رہی ہے اور اس حقیقت کی معترف ہے کہ مشرقی ممالک میں تحریک اتحاد کے متعلق انھیں کا زاویہ نظر صحیح تھا۔

اس وقت بھی جب غازی ممدوح نے منصب خلافت کو منسوخ کرنے کی جرات کی اور نام نہاد ترکی علمار کو بے اختیار کردیا عورتوں کو پوری آزادی دے دی، رسم الخط بدل ڈالا، عورتوں کے لباس میں حکماً تغیرات کردیئے تو مشرقی واسلامی ممالک میں یہ جارحانہ اصلاح کو جو زندگی کے قدیم تخیل کو یکسر مٹارہی تھی تحرلیس واجتہاد کا ہدف بنایا گیا لیکن آج ملت ترکیہ کی اس تجدید سے جو لوگ ناخوش تھے وہ بھی یہ دیکھ کر خاموش بیٹھے ہیں کہ افغانستان وایران جیسے قدامت پرست ممالک بھی اتاترک کی تقلید کررہے ہیں اور حیات نو کا یہ سیلاب جو ترکی کی طرف سے بڑھا چلا آرہا ہے دوسرے اسلامی ممالک کو بھی اپنے ساتھ بہائے لئے جارہا ہے۔

بین الاقوامی سیاست کے وسیع تر حلقے میں اتاترک کی موثر سیاست نے ایسے نقوش چھوڑے ہیں جس کا دائرہ اثر تمام اسلامی اور مشرقی ممالک کو اپنے اندر کھینچ رہا ہے حال ہی میں ترکی وزیر خارجہ ڈاکٹر رشدی اراس بغداد اور طہران گئے ہوئے تھے کہ مجوزہ اتحاد مشرق کی تکمیل کرادی جائے۔ دو برس ہوئے جب کہ افغانستان، ایران، عراق اور ترکی نے دوستی اور اتحاد کے معاہدے کا ایک مسودہ طیار کیا تھا اس مسودے کو چاروں ممالک نے بھی منظور کرلیا لیکن اب ترکی حکومت کی یہ خواہش تھی کہ اس معاہدے کی فوراً تکمیل ہوجائے اور مشرقی واسلامی ممالک کے ان دیرینہ اختلافات کو رفع کردیا جائے جو اتحاد کی راہ میں اب تک حایل ہورہے تھے افغانستان، ایران اور عراق کے اختلافات بہت قدیم سے چلے آتے تھے اور یہ واقعہ ہے کہ اتاترک کا تدبر ان کو مٹانے میں تقریباً کامیاب

ہو چکا تھا اور دورِ حاضر کی بین الاقوامی سیاست کا ایک اہم واقعہ ہے لیکن افسوس ہے کہ اس اسکیم کے عملی نتائج ظہور پذیر ہونے سے قبل اتاترک اس دنیا سے چل بسے۔

قانون قدرت کے مطابق ہر ہستی اپنے لئے کوئی نہ کوئی مقصد ساتھ لاتی ہے اور ایسی ہستی کو فضیلت حاصل ہوتی ہے جس کا مقصد دوسروں کے کام آنا ہو مصطفےٰ کمال انہیں ہستیوں میں سے تھے جن کی راحت و آرام ملک و قوم کی فلاح و بہبود کے لئے وقف تھا۔

قدرت نے گو مرحوم کو جسمانی حیثیت سے علیحدہ کر دیا مگر وہ جذبہ اور وہ خیال جس کے ماتحت آپ نے جسد فانی چھوڑنے تک بنی نوع انسان کے لئے کوشش کی، انسانوں کے دلوں میں اس طرح سرایت کر گیا ہے کہ ہمیشہ ہمیشہ تک قایم رہے گا مرحوم کی وہ راہ عمل اور ان کا نصب العین ملک و ملت کے لئے مشعل راہ کا کام دے گا۔

تاریخ نام و نشان مٹا سکتی ہے لیکن جذبہ عمل کو نابود نہیں کر سکتی قانون فطرت کے مطابق رفتار زمانہ بدلتی رہے گی اجسام فانی ہیں اور روح غیر فانی اس معنی میں مرحوم زندہ ہیں گو ان کا جسد فانی خاک میں مل گیا مگر ان کے کارنامے قیامت تک باقی رہیں گے۔ دنیا کہتی ہے کہ مصطفےٰ کمال نہیں رہا مگر یہ صحیح نہیں کیونکہ مصطفےٰ کمال نام تھا ایک سیرت کا، ایک عمل کا، ایک عقیدہ کا اور ایک خلق کا، اور یہ اس وقت تک فنا نہیں ہو سکتا جب تک کہ نظام عالم قایم ہے۔ اتاترک جس کی ساری زندگی کی ہر ساعت اپنی مردہ قوم کو زندہ کرنے میں گذری اور جس نے پورے جوش و خروش کے ساتھ موت و حیات کے فیصلہ کن گھڑیوں میں مٹنے کا فیصلہ کیا لیکن ہٹ نہ سکا اور بالآخر طبعی موت مرا بھلا کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ وہ فنا ہو گیا جس نے تمام عمر کرب و درد کی زندگی گذاری اور راہ حق میں ہر مصیبت کو مجاہدانہ طور سے برداشت کیا ؎

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق　　ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

مصطفےٰ کمال کی موت بھی یقین ہے کہ زندگی کا کام دے گی اور ہزاروں کام کرنے والے پیدا کر دے گی۔ مرحوم کا عالم گیر ماتم خود قوم کی زندگی کی علامت ہے۔

محمد شمس الدین فاروقی

رُباعیات

اس پھُول کا رنگ اُڑ کے بُو رہ جائے　　سر جائے تو جائے آبرو رہ جائے
ثابت ہو مری نفی سے تیرا اثبات　　میں اتنا مٹوں کہ صرف تو رہ جائے

ہیں مستِ مئے شہود، تو بھی میں بھی　　ہیں مُدعیِ نمود، تو بھی میں بھی
یا تو ہی نہیں جہاں میں یا میں ہی نہیں　　ممکن نہیں دو وجود، تو بھی میں بھی

تن کی ہستی کو چھُو، نہ کردوں تو سہی　　میدانِ ہوا کو، ہو نہ کردوں تو سہی
ملتا نہیں مجھ سے اگر خیر نہ مل　　میں بھی اس مے کو تو نہ کردوں تو سہی

امجد

ادب کا ترقّی پسند نظریہ اور اُردو

ادب زمانے کے معاشرتی حالات، سیاسی عقائد اور اخلاقی رجحانات کا آئینہ ہوتا ہے۔ اگر ایک طرف ادب کے ذریعے انسانیت کی باطنی حالت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے تو دوسری طرف خود انسانیت اس میں اپنے لئے راہ عمل ڈھونڈھ لیتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقوام کی تعمیر حیات میں ادب کا بڑا حصّہ ہوتا ہے۔ تاریخ عالم کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اجتماعی فکر ہمیشہ غیر شعوری طور پر ادب سے متاثر رہی ہے اور قوموں نے اسی کی روشنی میں اپنی راہِ عمل متعین کی ہے۔ ادب کا مقصدِ اولین انسانیت کی اجتماعی فکر کو ایک ہی راستے پر ڈال دینا ہے۔

ادیب کا خیال جب ایک بار ظاہر ہوجاتا ہے تو پھر وہ اس کا خیال باقی نہیں رہتا بلکہ ساری قوم کا خیال ہوجاتا ہے، اور چونکہ ادیب عام انسانوں کی طرح ایک خاص ہیئت اجتماعی اور نظامِ تمدن کا پروردہ ہوتا ہے، وہ ہماری معاشی، سماجی اور سیاسی زندگی سے اسی طرح متاثر ہوتا ہے جس طرح دنیا کے سارے انسان ہوا کرتے ہیں۔ ایک ادیب یا شاعر جو کچھ لکھتا ہے وہ اگرچہ اس کی انفرادی قوت تخلیق کا نتیجہ ہوتا ہے لیکن اس کی یہ تخلیقی قوت ہمیشہ غیر محسوس طور پر زمانے کے رجحان سے متاثر رہی ہے اور اس کی زبان جسے ہم الہامی زبان سے تعبیر کرتے ہیں دراصل زمانے کی زبان رہا کی ہے۔

تاریخ ادب کے مطالعے کی سب سے بڑی غایت یہی ہوتی ہے کہ انسانی زندگی کے تمدنی ارتقاء کا حال ادب کے ذریعے پڑھا جائے۔ ہیگل فلسفے کو تاریخ قرار دیتا ہے، جس طرح فلسفے میں زماں و مکاں کی تبدیلی کے ساتھ انسانی خیالات و افکار میں بھی انقلاب و تغیر ہو جاتا ہے اسی طرح ادب میں بھی اقوام عالم کے بدلتے ہوئے تمدن اور انسانیت کے ذہنی رجحانات کے نقوش نظر آتے ہیں جو ہر زمانے کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔

یہ کہنا غلط ہے کہ ادب عالیہ (Classics) خواہ وہ کسی دور کا ہو، ہر زمانے میں اور ہر قوم میں ادب عالیہ ہی رہے گا۔ ایمرسن نے سچ کہا ہے کہ ہر دور اپنا ادب عالیہ خود آپ تیار کر لیتا ہے، ہر ادبی کارنامے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس میں وہ سارے عصری میلانات اور خصوصیات موجود ہوں جن سے وہ دور بنا ہے کوئی ادبی کارنامہ اس وقت تک مکمل نہیں سمجھا سکتا جب تک اس میں زمانے کی روح موجود نہ ہو۔ اب حسن محض کا نام ادب نہیں رہا ہے، اقوام عالم کا اجتماعی وجدان آج ادب میں حسن کو حقیقت اور نیکی کے جذبات کے ساتھ ہم آہنگ دیکھنا چاہتا ہے اور سب سے کامیاب ادیب وہی ہے جو بہ یک وقت ہمارے ذوق حسن، ذوق فکر اور ذوق عمل کو مطمئن کرے، اس میں کوئی شک نہیں کہ آرٹ کی کوئی راست اور قطعی غرض و غایت نہیں ہوتی لیکن بالواسطہ آرٹ میلاناتی ہوتا ہے اور اس میں ایک چھپا ہوا (Purpose Bias) غایتی میلان ہوتا ہے۔ غالباً اسی خیال اور جذبے کے زیر اثر حضرت علامہ اقبال مرحوم نے تاج محل کے متعلق فرمایا تھا کہ اس عمارت میں حسن، نزاکت، نفاست اور دلکشی تو بدرجہ اتم موجود ہے لیکن قوت، شوکت اور جلال کا اس کی تعمیر میں کوئی عنصر نظر نہیں آتا۔

قدامت پرستوں کا یہ خیال کہ ادبی پیداوار کے اعتبار سے موجودہ دور، دور تنزل ہے اور ادب کے وہ پارے جو قدیم شاہکاروں کے نمونوں سے مطابق نہ ہوں ادب کہلانے کے مستحق نہیں ہیں ایک بنیادی غلط فہمی پر مبنی ہے ادیب یا شاعر زماں و مکاں سے کبھی منحرف نہیں ہو سکتا، اب وہ زمانہ نہیں رہا ہے کہ ہماری اجتماعی فکر، رامائن، مہابھارت ایلیڈ ڈوائن کامیڈی اور شاہنامہ جیسی کتابوں سے مطمئن ہو جائے۔ اگر آج الف لیلہ اور انوار سہیلی کے سے قصے تصنیف ہونے لگیں تو موجودہ نسل ان رجعت پسندانہ اقدامات کو کبھی اچھی نظر سے نہیں دیکھے گی، کیوں کہ اس میں روح عصر موجود نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ روح عصر کے بغیر ہر ادب قالب بے جان ہے۔

ہم قدیم ادب کا مطالعہ صرف اس لئے کرتے ہیں کہ اس کی حیثیت ہمارے موجودہ عصری میلانات کے تاریخی پس منظر

کی سچ ہے، ہومر، ڈانٹے، کالی داس، فردوسی اور سعدی سب اپنے اپنے زمانے کی پیداوار ہیں ان میں سے کوئی وقت سے بعد پیدا نہیں ہوا، یورپ کی ادبیات میں رزمیہ دور کے بعد رومانی دور کی ابتدا ہوئی، ہندوستان میں دلی کی شاعری کے زوال کے بعد لکھنؤ کی شاعری کو فروغ ہوا۔ یہ سب تاریخ کی یا وقت کی تقدیریں ہیں جو کسی طرح ٹل نہیں سکتی تھیں، تاریخی جبر کے اسی اٹل قانون کی بنا پر کوئی ادبی کارنامہ اپنے وقت کے بعد شاہ کار تسلیم نہیں کیا جا سکتا اور نہ اسے کوئی تاریخی اہمیت اور منزلت دی جا سکتی ہے۔ اب میں آپ کے سامنے اسی نظریے کی روشنی میں مختصراً ادبیات عالم کا تاریخی تجزیہ کروں گا۔

میں نے ابھی ذکر کیا ہے کہ ادب ان ہی حالات اور اسباب سے بنتا ہے جن میں مجموعی طور پر ہمارے نظام تمدن کی پرورش ہوتی ہے، ادب دراصل ہمارے جذبات اور احساسات کا آئینہ دار ہوتا ہے اور چوں کہ جذبات ہمیشہ معاشرت اور ماحول سے متاثر رہتے ہیں اس لئے ادب بھی زمانے اور ماحول کے ساتھ رہتا ہے، تاریخ تمدن کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدا ہی سے انسانوں کی منتخب اور محدود جماعت ہدایت اور رہبری کی آڑ میں عوام پر مسلط رہی ہے تہذیب کے قدیم ترین دور میں انسان قدرت کے ہر اس مظہر کی پوجا کرتے تھے جس سے دل میں خوف اور استعجاب کے جذبات پیدا ہوتے تھے۔ ان بے شمار دیویوں اور دیوتاؤں کے لئے جو بھجن اور گیت تیار ہوتے تھے وہ اسی جماعت کے افکار سے ہیں یہ دراصل ایک قسم کی ادبی اعیانیت (Aristocracy in literature) کا دور تھا، زندگی کے دوسرے اہم شعبوں کی طرح مقتدر جماعت نے ادب کی پیدائش کو بھی اپنا موروثی حق قرار دے لیا تھا یہ رجحان ہم کو بہت زمانے بعد تک بھی نظر آتا ہے، ابتدا میں مصری کتابیں ایک خاص رسم الخط میں لکھی جاتی تھیں جن کو صرف کاہن ہی پڑھ سکتے تھے ویدوں کی زبان کا نام دیو بانی زبان تھا، یہ زبان اتنی پاک اور مقدس سمجھی جاتی تھی کہ عموماً غیر برہمن اور خصوصاً شودروں کے لئے حکم تھا کہ یہ اس مقدس زبان کا ایک لفظ بھی سننے نہ پائیں۔ اگر کوئی شودر بدنصیبی سے اس زبان کا کوئی لفظ سن پاتا تھا تو اس کے کان میں سیسہ پگھلا کر ڈال دیا جاتا تھا۔ ادبیات میں اس دور کو ہم "پروہت کال" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

قریباً اسی دور کے ساتھ ساتھ یا اس کے کچھ ہی عرصہ بعد رزمیاتی تہذیب (Epic Civilization) کی بنیاد پڑی۔ اس دور میں ستیزہ کاری کو انسانیت کا سب سے بڑا جوہر سمجھا جاتا تھا، غازیوں اور بڑے بڑے سورماؤں کی کامیابی اور کامگاری کو خاص تائید الٰہی سے منسوب کیا جاتا تھا، ان بہادروں کے کارنامے منظوم کئے جاتے تھے اور قوم ان کو پڑھ کر فخر کرتی تھی، دنیا کی اکثر و بیشتر کتابیں مثلاً ایلیڈ، اوڈیسی، رامائن، مہابھارت وغیرہ اسی تہذیب کی نمائندگی

کرتی ہیں۔

اس کے بعد تاریخ کی ایک کروٹ نے سولہویں صدی عیسوی سے سرمایہ داری کے دور اور جاگیری نظام کو انسانیت پر مسلط کر دیا۔ اس وقت تمدن کی نمایندگی مذہبی پیشوا اور بڑے بڑے سامنتوں کے ہاتھ میں تھی، اس زمانے کا معاشرہ ان جاگیرداروں اور مذہبی پیشواؤں کی زندگی کو احترام اور عزت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ مذہبی نظام اور سامنتی نظام دونوں نے ایک دوسرے کو سہارا دے رکھا تھا، اور اس طرح عوام کے خیالات اور جذبات پر ان کی گرفت بڑی مضبوط تھی۔ اس زمانے کا ادب دو حصوں میں منقسم ہے، ایک ادب تو صوفیوں اور درویشوں کے خیالات کی نمایندگی کرتا ہے جو ہم کو رہبانیت ترک اور تپسیا کی تلقین کرتے ہیں، اور دوسرا ادب وہ ہے جو دنیائے امارت کے زیر اثر پرورش پا رہا ہے، اور جس میں عصری میلان یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دولت مندی ایک مستقل نیکی ہے، دانتے کی ڈیوائن کامیڈی، چاسر کے (Canterbury Tales) سعدی کی گلستاں، ملک محمد جائسی کی پدماوت سب اسی تہذیب کی یادگاریں ہیں۔ خیام، حافظ، کبیر اور میرا بائی وغیرہ کے ادبی کارنامے اسی دور کے ایک خاص رجحان کی نمایندگی کرتے ہیں۔

جاگیری نظام کے ساتھ ساتھ ایک اور طبقے کو بھی آہستہ آہستہ فروغ حاصل ہوتا تھا۔ یہ مہاجنوں اور ساہوکاروں کا طبقہ تھا۔ یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ انسانی معاشرے میں اس طبقے کے تسلط اور اقتدار کی بنیاد کب پڑی لیکن ایک حقیقت نفس الامر ہے کہ ایک زمانے میں تمدن اور معاشرت کی پوری باگ اس طبقے کے ہاتھ میں آگئی اور اس نے عصری میلان و رجحان کو بے حد متاثر کیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس دور میں کلیسا کا اقتدار اپنی آخری سانس لے رہا تھا اور زرعیہ تہذیب تقریباً نیست و نابود ہو چکی تھی لیکن انسانیت، کارخانوں کے استبداد کے بوجھ سے دبی جا رہی تھی۔ یہ دور تقریباً اٹھارویں صدی عیسوی تک جاری رہا، اور اسی زمانے میں رومانی تحریک (Romantic revival) کی بنیاد پڑی۔ یہ تحریک دراصل مادیت اور ثروت پرستی کے خلاف ایک خاموش اور پرامن احتجاج تھی جس نے عالمی ادبیات کا رخ بالکل بدل ڈالا۔ گئٹے ورڈس ورتھ، کیٹس، شیلی، بائرن دراصل سب یک آواز ہو کر معاشرے کے اس تصنع اور بناوٹ کی پردہ دری کرتے ہیں جو سرمایہ داری کے نظام کے ساتھ معاشرے کی رگ و پے میں جاری ہو گیا تھا لیکن ان لوگوں نے زندگی کی ان تلخ حقیقتوں کا مقابلہ کرنے کی بجائے ان سے پناہ ڈھونڈی اور اپنے لئے اور دوسرے کے لئے ایک ایسی خیالی دنیا تعمیر کی جہاں صرف

جذبات اور احساسات کی رہنمائی کا کام کرتی ہے، اس زمانے کے ادبی کارنامے انسانی فکر کے لئے شراب کا کام کرتے ہیں، جہاں تک محبت کے جذبات اور حسن کے احساسات کا تعلق ہے اس ادب کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ اس نے ہماری ایک بڑی روحانی ضرورت کو پورا کیا اور ہمارے وجدان کے لئے مسرت فراہم کی، اس قسم کے ادب سے انسانیت کبھی بے نیاز نہیں رہ سکتی یوں ہر وقت اور ہر زمانے میں اس کی قدر و منزلت باقی رہے گی، لیکن زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ ہم ادب میں زندگی کے دکھ کو دور کرنے کا راستہ ڈھونڈھتے ہیں اور یہ راستہ ہم کو مصیبت اور تکلیف سے بچ کر ایک ذہنی حصار تعمیر کر لینے میں نہیں مل سکتا بلکہ ہم ادب سے اپنے میں اس دکھ کا مقابلہ کرنے کی قوت اور تاب پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اور ہم کو یہ قوت اس وقت تک نہیں مل سکتی جب تک ادب میں واقعیت (Realism) نہ ہو اور ادب ان سارے نقوش اور رجحانات کی نمایندگی نہ کرے جس سے اس وقت انسانیت دوچار ہو رہی ہے، ادب کا ترقی پسند نظریہ یہی ہے کہ جس طرح ہر ادب اپنے عصری میلانات کا آئینہ ہوتا ہے، ہمارا موجودہ ادب بھی ہماری ضرورت اور ہماری اجتماعی فکر کی مکمل نمایندگی کرے جدید ادب کا کوئی راستہ معین کرنے سے پہلے ہم کو موجودہ دور کے ان رجحانات کا اندازہ کر لینا چاہئے، جن سے ہماری زندگی کے تقریباً سارے کے سارے شعبے متاثر ہو رہے ہیں۔

انقلاب فرانس کے بعد سے انسانی ضمیر میں بھی ایک انقلاب پیدا ہو چکا تھا اور انسانیت کو محسوس ہونے لگا تھا کہ صنعتی تہذیب نے اس کے لئے بہت سی سوگواریاں پیدا کر دی ہیں اور اس کو بالکل بے دست و پا بنا کر چھوڑ دیا ہے۔ انسانوں کو یہ بھی محسوس ہو چلا تھا کہ کلیں گو بظاہر ان کے اشاروں پر چلتی ہیں لیکن درحقیقت وہ خود کلوں کے تابع اور غلام ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس احساس سے ساری دنیا میں بے چینی، انتشار اور ناآسودگی کی لہریں اٹھنے لگیں لیکن ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم تک اس تہذیب کا پورے طور پر خاتمہ نہ ہو سکا۔ جنگ عظیم نے پرانی دنیا کے نظام کو قریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے، بقول علامہ اقبال مرحوم، اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت، زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے، اقوام عالم اس وقت جس عہد اضطراب سے گزر رہی ہیں یہ دراصل ایک بہت بڑے سیاسی اور تمدنی انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔ ایسی صورت میں ادب کا ترقی پسند نظریہ یہی چاہتا ہے کہ ادب میں وہ سارے میلانات پیدا کئے جائیں جن سے یہ دور بن رہا ہے۔ اب تک ہمارے ادبی کلیساؤں کی سامنتیوں کی اور سرمایہ داروں کی زندگی سے بحث کی اور ان کے رسم و رواج ان کی تہذیب اور ان کی معاشرت

کو مقبول بنانے کی خدمات انجام دیں ۔ لیکن اب ہمارا جذبۂ انسانیت ہم کو دعوت دیتا ہے کہ ہم اِس سطح سے اُتر کر غریبوں مزدوروں اور کسانوں کی زندگی کا مطالعہ کریں کیونکہ انسانی آسائش ان ہی کی جاں کاہیوں سے عبارت ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ سماج کی عمارت کا سنگ بنیاد غریب طبقہ ہے ۔ ابتدائے آفرینش سے اس وقت تک اس نے جو قربانیاں کی ہیں ، سختیاں جھیلی ہیں ، اور سماج کے کھیت کو اپنے خون سے سینچا ہے ۔ اس کا تقاضہ یہ ہے کہ اب اسے ان جاں گسل صدموں سے نجات دلائی جائے ۔ جلد یا بدیر سارا عالم اس انقلاب سے متاثر ہوگا ۔ زمانے کا یہ اٹل فیصلہ ہے اور اس فیصلے کے مقابلے میں دنیا کی کوئی مزاحم قوت یا تحریک نہیں ٹھیر سکتی ۔ زندگی کے سارے شعبوں مثلاً سیاسیات ، عمرانیات اور معاشیات میں اس عظیم الشان تحریک کے لئے فکر کی راہیں کھول دی گئی ہیں ۔ اس لئے ادب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ۔ اور یہی گویا ادب کا ترقی پسند نظریہ ہے ۔ جس کے علم بردار میکسم گورکی ، دستوئسکی ، ٹالسٹائی ، ترگنیف اور چیخوف وغیرہ ہیں

اب میں اپنے مضمون کے دوسرے حصے کی طرف متوجہ ہوتا ہوں ۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ اردو ادب اس ترقی پسند رجحان سے کس حد تک متاثر ہے ۔ ہم کو ان مختلف اصلاحی تحریکوں کا حال جاننا چاہئے جن سے ہند جدید بن رہا ہے ۔ ہندوستان میں سیاسی شعور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے شروع ہوتا ہے ۔ اور اسی زمانے سے عوام میں بیداری کی روح پیدا ہونے لگی ہے ۔ یہ بیداری دنیا کی رفتار ترقی کا کس قدر ساتھ دیتی رہی یہ ایک مستقل بحث ہے ۔ بہرحال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زمانے کی تاریخ جس سرعت سے بدل رہی ہے اور اقوام عالم دیکھتے کے دیکھتے جن عظیم الشان انقلابات سے دوچار ہو رہے ہیں ۔ ان کا اثر ہندوستانی صورت حال پر بھی بتدریج پڑ رہا ہے ، یہاں ان اسباب وعلل سے بحث کرنے کی گنجایش نہیں ہے جن سے ہندوستان میں کوئی فوری انقلاب پیدا نہیں ہوسکتا اور جن سے یہاں کی سوسائٹی کے قدیم اور رجعت پسند عناصر فوراً ہی مٹائے نہیں جا سکتے ۔ لیکن یہ ماننا ضروری ہو کہ تقدیر وقت رفتہ رفتہ ان سارے اسباب وعلل پر غالب آتی جا رہی ہے اور یہاں کی زندگی کے ہر شعبے میں جدید رجحانات کی جھلکیاں نظر آنے لگی ہیں ۔

اُردو میں مولانا حالی پہلے آدمی سمجھے جاتے ہیں جنھوں نے ہمارے شعر وادب کے لئے ایک نیا راستہ بنانے میں پہلا دلیرانہ اقدام کیا ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حالی سے بہت پہلے نظیر اکبرآبادی نے بھی اردو شاعری کی روایتی رسم پرستی کو چھوڑ کر ایک نئی روش اختیار کی تھی لیکن حالی نے سب سے پہلے اس قسم کی کوششوں کو ایک مستقل حیثیت دی

اور اپنے نظریۂ شعر و ادب کو مقبول بنانے کے لئے انھوں نے اپنا سارا آرٹ بلکہ اپنی ساری زندگی وقف کردی، اس میں کوئی شک نہیں کہ حالی نے خود جو کچھ لکھا ہے وہ غریبوں کے لئے نہیں ہے بلکہ ان کے پیش نظر سماج کی چند اخلاقی برائیوں کی اصلاح تھی اور انھوں نے اپنا سارا آرٹ ان ہی برائیوں کو دور کرنے کی کوشش میں صرف کیا، یہ بھی صحیح ہے کہ حالی کی نظر صرف مسلمان طبقے کی فلاح و بہبود پر تھی، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حالی نے اردو کے ادیبوں اور شاعروں کی فکر کے لئے نئی راہیں کھول دیں اور ان میں ادب کے ذریعے سے انسانیت کی سودمند خدمت انجام دینے کا احساس پیدا کر دیا۔

حالی نے ابتدا میں جو بیج بو دیا تھا اور جس عمارت کا سنگ بنیاد رکھا تھا اس کی تکمیل اقبال کے ہاتھوں ہوئی۔ اقبال کی عظیم الشان شخصیت ان کی زندگی ہی میں بجائے خود ایک ادارہ بن گئی تھی اور اس کا اثر سارے ہندوستانی ادب پر پڑ رہا تھا، اقبال کے متعلق جس قدر مختلف اور متضاد رائیں ہیں وہ غالباً اردو ادب میں کہیں اور نہ ملیں گی، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کے پیام نے نہایت شدت کے ساتھ لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا ہے اور سارے کے سارے لوگ وہ خواہ اقبال کے حامی ہوں یا مخالف شعوری یا غیر شعوری طور پر اس سے متاثر ہو رہے ہیں، یہ بات شاعری کی اور ادب کی فطرت میں داخل ہے کہ جس قدر زیادہ کسی ادب کا اثر ہوگا اور اجتماعی وجدان جس قدر زیادہ اس کے افکار اور نظریوں کو قبول کرے گا اسی قدر زیادہ اس پر گفتگو ہوگی اور تنقیدیں کی جائیں گی، یہی حال اقبال کی شاعری کا ہے، ہر اس تنقید سے جو ان کی شاعری پر اور ان کے فلسفے پر کی جائے گی ان کی عظمت اور ان کے پیام کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اقبال نہ صرف ہندوستان کا بلکہ ساری دنیا کا سب سے بڑا ترقی پسند شاعر ہے، وہ نہ صرف ایک عظیم المرتبت شاعر ہے بلکہ ایک بلند پایہ حکیم، مفکر اور فلسفی بھی ہے۔ اقبال کی یہی خصوصیت ان کو تاریخ ادبیات عالم میں ایک نہایت ممتاز اور رفیع مقام دیتی ہے۔ ان کی شاعری کے مرکزی تخیل ([illegible]) کا مطالعہ کرنے کے لئے ان کے فلسفے کو جاننا ضروری ہے۔ ان کے فلسفے کے مطالعے کے لئے ان کی ذہنی تربیت اور نشو و نما میں جو حالات معاون ہوئے ہیں ان کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اقبال نے عام اردو شاعروں کی طرح پہلے غزلیں کہیں لیکن وہ بہت جلد ان سے سیر ہو گئے۔ بقول پروفیسر سروری زبان کی چاشنی سے ہٹ کر گرامی مضامین کے جو ان غزلوں میں کیا تھا جو اس فلسفی شاعر کی توجہ کو الجھائے رکھتا۔ اب اقبال نے ان

موضوعوں کو اپنی شاعری کے لیے منتخب کیا جن کا گہرا تعلق اسی زندگی اور ماحول سے تھا جس میں ان کی شاعری پرورش پا رہی تھی، اقبال اُس زمانے میں ہند قدیم کی عظمت سے بے حد متاثر تھے، ان کے اسی تاثر نے ان سے ہمالہ، ترانۂ ہندی، شوالہ، ہندستانی بچوں کا قومی گیت جیسی نظمیں لکھائی تھیں اور اسی احساس سے مجبور ہو کر انھوں نے "خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے۔ اور "نسب فلسفی ہیں خطۂ مغرب کے رام ہند" کہا تھا۔ اسی زمانے میں اقبال یورپ گئے یہاں انھوں نے قدیم اور جدید فلسفے کا مطالعہ کیا ان کو اس باطنی اضطراب کا صحیح اندازہ ہوا جس سے اقوام عالم گزر رہی تھیں، یہاں انھوں نے سوگوار انسانیت کو دیکھا جو مغربی تہذیب کے بوجھ سے دبی جا رہی تھی۔ ان کے تصورِ حیات میں اب ایک تبدیلی پیدا ہوئی اور انھوں نے اپنی قوت فکر سے مغربی استعماریت کے خلاف احتجاج کیا اور عالمی جذبۂ اخوت کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ مغربی فریب کاریوں سے بچنے کے لیے اقبال انسانیت کے لئے کوئی مکمل نصاب اخلاق پیش کرنا چاہتے تھے اور چوں کہ ان کے سامنے اسلام کا اخلاقی نظام موجود تھا اسی کو انھوں نے اپنی شاعری کا مرکزی تخیل قرار دیا اور انسانیت کی رہبری کرنے لگے۔ اقبال نے وطن پرستی کے نغمے الاپنے بند کر دیئے انسانیت کے لئے انھوں نے ایک شاہ راہ عمل تیار کی اور اسی کو انھوں نے اپنی شاعری کا محور بنا لیا۔

اقبال کے اس نئے ذہنی رجحان پر ہر طرف سے لے دے ہوئی، وطن پرستوں نے ان پر ہر طرف سے لعن طعن کی بوچھار کی اور ان پر فرقہ واریت کا الزام رکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے جہاں کہیں اسلام کا ذکر کیا ہے وہ دراصل ایک ایسے نظام کے لئے استعارہ ہے جو بنی نوع انسان کی فلاح کی راہیں تجویز کرے، وہ اگر کہیں بندہ مومن کے متعلق کچھ کہتے ہیں تو اس سے ان کی مراد کردار کی وہ بلندی ہوتی ہے جو دنیا میں نیکی کی حمایت اور بدی کے خلاف بغاوت کرنے پر ہر فرد کو آمادہ کر دے۔ ان کے نزدیک مومن کا تصور یہ ہے کہ کش مکش زندگی میں مومن کی قوی سیرت اس کی انفرادیت کو قایم رکھتی ہے مومن زمان و مکان کا غلام نہیں ہو جاتا بلکہ زمانہ خود اس کا پابند ہو جاتا ہے اور اس کے وجود میں جذب ہو جاتا ہے، مومن اپنے زمانے کا معمار اور کارساز حقیقی ہوتا ہے لیکن کافر اور کافر سے یہاں مراد وہ انسان جس کا کردار قوی نہیں ہے، اپنے آپ کو وقت کے رحم وکرم کے حوالے کر دیتا ہے اور اپنی انفرادی ہستی کو کھو دیتا ہے۔

کافر کی نشانی یہ کہ آفاق میں گم ہے   مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہے آفاق

غرض یہ کہ یورپ کے سفر کے بعد اقبال نے وطن پرستی کے محدود دائرے سے نکل کر ایک عالمی زاویہ نگاہ اختیار کیا اور اپنے پیام کو اور زیادہ وسیع کر دیا۔ مغربی تمدن کے مستقبل کے متعلق ایک پیغمبرانہ انداز میں اظہار خیال فرماتے ہیں کہ :-

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے   کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی   جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

اقبال کی اس دور کی شاعری میں ہم کو سرمایہ داری نظام اور مغربی تہذیب کے سراب کی حقیقتیں بے نقاب نظر آتی ہیں۔ انہوں نے اپنی ایک مشہور نظم میں کہا ہے کہ :-

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی   یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا   جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

اس کے بعد انہوں نے دو شعر کہا ہے جس سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ اقبال نے اپنی شاعری میں اسلام کا تصور کسی فرقہ واری جذبے کے تحت پیش نہیں کیا بلکہ اس کو ایک (Symbol) یا استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے جس سے ان کی مراد نیک عمل اور قوی کردار ہے۔ فرماتے ہیں ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی   یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

اقبال کی شاعری کے قلب ماہیت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اقبال اپنے وطن کی قسمت اور زبونی سے غافل تھے، وہ آزادی کو تو ہر فرد اور ہر قوم کا پیدائشی حق سمجھتے ہیں، غلامی ان کے نزدیک بدترین لعنت ہے جو انسان سے زندگی کی ساری راحتیں چھین لیتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ اس کے جمالی احساس اور وجدانی عظمت کو بھی فنا کر دیتی ہے۔

غلامی کیا ہے ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی   جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا
بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر   کہ دنیا میں فقط مردانِ حر کی آنکھ ہے بینا

اسی زمانے سے اقبال نے ہندوستانیوں کے سامنے فرنگی سیاست اور حکمرانوں کی عیاری کا پردہ فاش کیا ہے فرماتے ہیں

مجلسِ اصلاح و آئین و رعایاتِ حقوق   طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر   پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

یہاں تک ہم نے اقبال کی شاعری کا ابتدائی مطالعہ کیا، اس کے بعد اقبال کچھ دنوں تک فارسی میں کہتے رہے،

فارسی میں ان کی شاعری کا کیا رجحان رہا اس کا تعلق ہمارے موضوع سے نہیں ہے، لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان کا یہی رجحان پھر اُردو میں بال جبرئیل اور ضرب کلیم کی صورت میں جلوہ گر ہوا۔ اس مدت میں اقبال کے فلسفے نے ایک اور منزل طے کر لی تھی۔ ان کا ذوق آگہی صرف فریاد کرنے اور احتجاج کرنے سے مطمئن نہیں ہو جاتا بلکہ وہ اس کے آگے بھی کچھ اور ڈھونڈھنا چاہتا ہے، اقبال کی اس تلاش اور جستجو کا نتیجہ ان کا وہ نظریہ ہے جسے انھوں نے فلسفۂ شاہین کی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کیا ہے، یہ فلسفہ انفرادیت، خودی کی تعمیر قوت عمل اور زندگی کی تلقین کرتا ہے، اقبال کی مراد شاہین سے وہ خوددار اور باہمت فطرت ہے جو جب زندگی میں کسی کی ممنون رہنا نہیں چاہتی بلکہ اپنا راستہ آپ بنالیتی ہے۔ مجھے بعض ذمے دار حضرات کا یہ بیان پڑھ کر بڑی حیرت ہوتی ہے کہ اقبال ظلم، استبداد اور جارحانہ قومیت کا حامی ہے اقبال کی قوت کی تعلیم یا تلقین کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ وہ غریبوں اور کمزوروں کے مقابلے میں استعمال کی جائے، اقبال اس قوت کو مظلوم اور کمزور انسانیت کے ہاتھ میں اسے حربہ بنا کر دینا چاہتے تھے جو دنیا کے ہر استبدادی دستور اور جابرانہ نظام کو ملیامیٹ کر سکے۔ اپنی نظم خدا کا فرمان فرشتوں کے نام میں انھوں نے صریحاً اس بات کا اعلان کیا ہے کہ وہ کبھی غریبوں کے مقابلے میں استبداد ظلم ناروا کو کبھی روا نہیں رکھ سکتے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

اُٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگادو — کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر ہو نہ روزی — اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلادو

اقبال نے مسولینی پر ایک نظم لکھی ہے، اس میں انھوں نے ایطالوی بیداری کی بڑی تعریف کی ہے اور ایطالیہ کو اس کی قسمت پر مبارک باد دی ہے کہ اس کو مسولینی جیسا قائد اعظم میسر ہے۔ ایک نقاد نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے کہا ہے کہ "یہ فیض مسولینی کا ہے جو ایطالیہ کے لئے ساری دنیا کو فنا کر سکتا ہے، جو ایطالیہ کے سرمایہ داروں کا سپہ سالار ہے، جو جنگ کو انسانیت کے لئے شیر مادر بتاتا ہے"[1] اقبال پر اس قسم کے اعتراضات وہی لوگ کرتے ہیں جنھوں نے ان کی شاعری کے اصل (Theme) یعنی مرکزی تخیل کو نہیں پایا، اقبال کبھی اس نظام تمدن کے حامی نہیں ہو سکتے جس کی بنیادیں اس طرح انسانی تخریب پر قائم کی گئی ہوں۔ وہ دراصل حرکت، زندگی قوت اور عمل کو انسانی کامگاری کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھتے ہیں اور ان کو جس کسی کردار میں یہ خصوصیات نظر آتی ہیں اس کو ایک نصب العینی نمونہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ مسولینی کی تعریف وہ صرف

---

[1] ادب اور زندگی اختر حسین رائے پوری

اسی لئے کرتے ہیں کہ اس نے اپنی قوت عمل سے حیات ملی میں زندگی کی لہر دوڑا دی ہے۔ ورنہ ان کا پیام ہمیشہ غریبوں اور مزدوروں کے لئے ہے اور ان کی شاعری ہمارے موجودہ عصر کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔ اقبال نے خود ایک غیور اور خوددار طبیعت پائی تھی اور وہ دنیا کے ہر انسان کو اسی صفت سے متصف دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک غربت بجائے خود کوئی بری نہیں ہے وہ تو اس غربت میں بھی اپنی انفرادیت کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کی اگر غریب کے متعلق خدا سے کوئی دعا ہوسکتی ہے تو وہ یہی ہے کہ:-

جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے　　　اسے بازوئے حیدر بھی عطا کر

اقبال اپنی فقیری غربت کو اس امارت سے بدلنے کیلئے تیار نہیں ہیں جو ان سے ان کی ضمیر کی پاکی ان کی روحانی سربلندی اور ان کی فطرت کی خودداری چھین لے وہ ایک الہامی شان کے ساتھ اپنی فطرت غیور سے دریافت کرتے ہیں کہ

اے مرے فقر غیور کیا ہے تیرا فیصلہ　　　خلعت انگریز یا پیرہن چاک چاک

مختصر یہ کہ اقبال کی شاعری نہ صرف اردو ادب میں بلکہ ساری دنیا کی ادبیات میں ہمارے عصری رجحانات کی مکمل ترین نمایندگی کرتی ہے۔ اقبال سے پہلے آج تک کسی شاعر نے اس قدر قوت اور تکمیل کے ساتھ اپنے پیام کے ذریعے انسانیت کی خدمت انجام نہیں دی۔ اب نہایت اختصار کے ساتھ اردو کے دوسرے شاعروں اور ادیبوں کے رجحانات کا ذکر کیا جاتا ہے کسی دوسرے موقع پر تفصیل پیش کی جائے گی۔

اقبال کے بعد اردو ادب میں جوش اور علی اختر ادب کے ترقی پسند نظریہ سے بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں جوش کی انقلابی شاعری پر بنگال کے مشہور انقلابی شاعر قاضی نذرالاسلام کا بہت اثر ہے، نذرالاسلام کی شاعری کا اصل مرکزی خیال یہی ہے کہ کسی نہ کسی طرح سے کوئی فوری انقلاب رونما ہو جو انسانیت کی مجبوریوں اور حرماں نصیبیوں کا خاتمہ کردے۔ نذرالاسلام نے اس انقلاب کے پیدا کرنے کی بہت قوت کے ساتھ تلقین کی ہے۔ وہ انقلاب کا سب سے بڑا نقیب ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے نہ صرف اپنی شاعری سے عام احساس کو بیدار کردیا بلکہ اس نے اپنے مقلدین کی ایک مستقل جماعت تیار کرلی۔ نذرالاسلام کے دبستان کے سب سے سرگرم اور نمایاں رکن جوش ملیح آبادی نظر آتے ہیں، جوش نذرالاسلام کی پیروی کے باوجود ایک انفرادیت کے مالک ہیں اور انھوں نے اردو ادب میں اپنے لئے ایک نمایاں جگہ پیدا کرلی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جوش کی شاعری کا نذرالاسلام یا اقبال کی طرح کوئی مستقل (Theme) نہیں ہے

انھوں نے تقریباً ہر موضوع پر نظمیں کہی ہیں اور ہر قسم کا انداز بیان اختیار کیا ہے، لیکن ان کے پاس عصری میلان یا ماحول کا اثر بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ان کا شاعرانہ (Mission) اگر کبھی بھٹکنا بھی چاہے تو جوش اس کو پھر اسی راستے پر لگا دیتے ہیں جوش نے بھی اپنا یہی مقصد قرار دیا ہے کہ قوم میں ظلم کے خلاف تاب مقاومت پیدا کریں اور اس کے جذبۂ عمل کو حرکت دیں۔ وہ اپنی شاعری کو قوم کے بیدار کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں۔

خواب کو جذبۂ بیدار دیئے دیتا ہوں قوم کے ہاتھ میں تلوار دیئے دیتا ہوں

علی اختر بھی قوم کی قوت فکر کی اصلاح کرنی چاہتے ہیں، علی اختر کی شاعری جوش کی نسبت زیادہ پرسکون اور سنجیدہ معلوم ہوتی ہے علی اختر جوش کی طرح بالکل انقلابی نہیں ہیں بلکہ وہ سوسائٹی کی بنیادی خرابیوں کو دور کرنے کے لئے قوم کو دعوت فکر دیتے ہیں غرض یہ کہ ہر بڑے شاعر کی طرح علی اختر بھی انسانیت کے اندرونی اضطراب سے متاثر ہیں۔

احسان بن دانش بھی انقلاب کے ایک بڑے نقیب ہیں وہ خود زندگی کے ان تمام مراحل سے گزر چکے ہیں جن سے انسانیت کی ساری الم انگیزیاں عبارت ہیں یعنی احسان کو اپنی زندگی کی کش مکش میں غربت سے بہت زیادہ سابقہ رہا ہے، وہ کسی زمانے میں مزدور بھی رہ چکے ہیں۔ اس لئے ان کے خیالات اور جذبات میں جو صداقت پائی جاتی ہے وہ دراصل ان کے ذاتی تجربے اور مشاہدے کی بنا پر ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی طبیعت پر جوش کا تتبع باقی رنگ غالب ہے لیکن ان کا آرٹ ان کے ترقی پسند رجحان میں زیادہ قوی اور موثر نظر آتا ہے۔

جامعہ عثمانیہ کے ہونہار شاعر مخدوم محی الدین نے بھی اپنی فکر کی جولانیوں کے لئے خاص طور پر یہی میدان منتخب کیا ہے مخدوم کی شاعری میں بھی نذر الاسلام کا اثر بہت زیادہ نظر آتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ قوم کے جذبات کو بیدار کرنے اور اس میں عمل کی قوت پیدا کرنے کے لئے جس طرز خیال اور انداز بیان کی بنیاد نذر الاسلام نے ڈالی وہ بجائے خود بے حد موزوں اور مکمل ہے۔

ماہر القادری نے ایک ہمہ گیر طبیعت پائی ہے، وہ جس طرز میں بھی فکر کرتے ہیں وہ بجائے خود مکمل نظر آتی ہے۔ ان کی انقلابی نظموں میں کم سن مزدور، اور والد مرحوم کی قبر پر، خاص طور پر قابل ہیں۔ کم سن مزدور میں آھرنے وقت کے فیصلے کو صاف صاف الفاظ میں بیان کر دیا ہے کہ:۔

اطلس و دیبا کہ پردے چاک ہو جانے کو ہیں کرسیاں، گل دان صوفے خاک ہو جانے کو ہیں

اب کسی کے سامنے مزدور جھک سکتا نہیں   آنے والا انقلاب آئے گا رک سکتا نہیں

ادب کے ترقی پسند رجحان سے تقریباً اردو کے سارے ممتاز ادیب اور شاعر متاثر ہوئے ہیں میں نے یہاں صرف ان شاعروں کا ذکر کیا ہے جنھوں نے اس رنگ کو مستقل حیثیت سے اختیار کر لیا، ماہر القادری، مجاز، میکش، وجد، صمد رضوی ساز، الطاف مشہدی، عدم وغیرہ سب غیر شعوری طور پر ادب کے اس نظریہ سے متاثر ہو رہے ہیں۔

اردو کے ادیبوں میں پریم چند ہماری زندگی کا سب سے سچا ترجمان ہے، پریم چند کی کہانیوں میں ہمارے ماحول کی اور ہماری زندگی کی مکمل تصویر نظر آتی ہے، ان کے افسانے جس قدر کامیاب مکمل اور غایتی ہوتے ہیں اسی قدر مقبول اور دل چسپ اور ہر دل عزیز بھی ہوتے ہیں، پریم چند کا تقریباً ہر افسانہ کسی نہ کسی نیکی کے جذبے کو حرکت میں لاتا ہے۔ "میدان عمل" میں پریم چند نے ہندوستانی نوجوان کے لئے ایک لائحہ عمل بنایا ہے جو ہر طرح نصب العینی معلوم ہوتا ہے، ان کے آرٹ میں جس قدر واقعیت اور صداقت شعاری موجود ہے وہ اردو کے کسی ادیب میں نظر نہیں آتی۔

اختر حسین رائے پوری اردو نوجوان ادیبوں میں ایک نہایت ممتاز حیثیت کے مالک ہیں، اختر اردو میں غالباً پہلے اور آخری ادیب ہیں جنھوں نے نذر الاسلام کی شاعری کو اردو دنیا سے روشناس کرایا، اس سے ان کے طبعی رجحان کا پتہ چلتا ہے، اختر نذر الاسلام کی طرح کسی فوری انقلاب کے شدید حامی ہیں اور اسی وجہ سے ان کے آرٹ میں ہم کو عظمت اور قومیت زیادہ نظر آتی ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں کا مجموعہ "محبت اور نفرت" کے نام سے شائع کیا ہے اور غالباً اس کے دیباچے میں اس کا اعلان کیا ہے کہ اس کا آرٹ محبت سے شروع ہو کر گھوم گھام کر نفرت پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ یہ نفرت گویا سرمایہ دار طبقہ کی ان ستم گاریوں کا نتیجہ ہے جن سے انسانیت کچلی جا رہی ہے۔

نیاز فتحپوری نے ایک ہمہ گیر طبیعت پائی ہے، یوں تو ایک صاحب طرز ادیب کی حیثیت سے نیاز غیر فانی شہرت کے مالک ہیں، لیکن ان کی تحریروں میں عصری میلانات بہت زیادہ ملتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کی غیر معمولی مقبولیت کی اصل وجہ یہی ہے کہ ان کے جذبات اجتماعی ضروریات سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔

مجنوں گورکھپوری شوپنہاری فلسفے سے بہت متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ ہارڈی کے ناولوں کی طرح مجنوں کے قصوں میں قنوطیت کی جھلک نظر آتی ہے لیکن ان کے مضمون کا موضوع، اور ان کے ماحول کا پس منظر عموماً دیہات کے غریبوں کی زندگی ہے۔

ان کے علاوہ پروفیسر مجیب، رشید احمد، اعظم کریوی، انصار ناصری، شاہد احمد، سجاد ظہیر، جلیل قدوائی، عابد حسین، فیاض محمود وغیرہ عصری میلانات سے بے حد متاثر ہیں۔ بلا شبہ آج اردو زبان زمانے کی زندگی کا ساتھ دے رہی ہے اور ایک زندہ زبان کی طرح ان شاعروں اور ادیبوں کو پرورش کر رہی ہے جن سے ایک مستقل دور رہنے والے مستقبل کی ادبیات عالم میں اردو نے بھی اپنے لئے ایک جگہ پیدا کرلی ہے۔ میری درخواست نوجوانوں سے اور خصوصاً جامعہ عثمانیہ کے ابنا سے یہی ہے کہ ہماری زبان میں جس نئی روایت کی بنیاد پڑ چکی ہے اس پر مستقل عمارتیں تیار کریں اور ادب میں زندگی کی روح پیدا کرکے مستقبل کے لئے اپنی حیات ادبی کا ثبوت چھوڑا جائے۔ ادب کا جدید نظریہ زمانے کی ودیعت ہے اور اس ودیعت کو آنے والی نسلوں تک پہونچانے کے ذمہ دار ہم اور صرف ہم ہیں۔[1]

محمد عمر مہاجر متعلم سال چہارم

قطعہ

ہے اور یقینی ہے یہی سب کی صدا ہے
لیکن نہیں معلوم، کہ وہ کون ہے کیا ہے؟
کیا کوئی کہے اس کی حقیقت کہ وہ کیا ہے
ہاتھ آئے تو بت، ہاتھ نہ آئے تو خدا ہے

امجد

---

[1] اس مضمون کی تیاری میں حضرت مجنوں گورکھپوری کے مضمون "ادب اور زندگی" سے مدد لی گئی ہے۔

اک حسرت دل میں رہتی ہی جس حسرت کا کچھ نام نہیں

گو لاکھ انسان کو دنیا میں راحت عیش اور آرام ملے یا ہستی کے میخانے سے تلخابۂ غم کا جام ملے
بے لطف مشقت میں گزرے یا من بھاتا کچھ کام ملے گمنامی میں آسودہ ہو یا شہرت پا کر نام ملے
اک درد سا دل میں رہتا ہے جو دردِ غمِ ایام نہیں
اک حسرت دل میں رہتی ہے جس حسرت کا کچھ نام نہیں

شاہوں پہ بھی وہ وقت آتا ہی جب دولت سے بیزاری ہو گو ان کا سات اقلیموں میں فرمان اور سکہ جاری ہو
جب لذت اور غم دونوں سے انسان کی طبیعت ہاری ہو نیرنگِ زمانہ دیکھ چکے اور یاس سی دل پر طاری ہو
ظاہر میں نہیں کچھ محرومی، کچھ رنج نہیں آلام نہیں
اک حسرت دل میں رہتی ہی جس حسرت کا کچھ نام نہیں

گو علم و ہنر میں شہرہ ہو اور انساں کسب کمال کرے
پھر عزت سے کچھ دولت سے ہر لحظہ رفع ملال کرے
دنیا میں پیدا مال کرے یا فکر حال و قال کرے
پر دل خاموش سا رہتا ہے جب دل سے کوئی سوال کرے

جس وقت طبیعت پر طاری کوئی بھی خیال عام نہیں
اک حسرت دل میں رہتی ہے جس حسرت کا کچھ نام نہیں

کوئی مسجد میں نمازی ہے کوئی میدان میں غازی ہے
کام اس کا دین کی خدمت ہے یا محض اک دنیا سازی ہے
پہنچے گا حقیقت پر آخر وہ رومی ہے یا رازی ہے
دنیا اک شیشہ بازی ہے یہ ساری چیز مجازی ہے

محسوس یہ روح کو ہوتا ہے یہ میری جائے قیام نہیں
اک حسرت دل میں رہتی ہے جس حسرت کا کچھ نام نہیں

جیسے برسات میں دور کہیں کوئل کی کوکو ہوتی ہے
لے جاتی ہے اور اک عالم میں آواز یہ جادو ہوتی ہے
جس طرح ضبط سے چشم دل روکے ہوئے آنسو ہوتی ہے
جیسے گم کردہ یوسف کی پیراہن میں بو ہوتی ہے

چشمہ ہے اس صہبا کا دل اور کوئی شیشہ و جام نہیں
اک حسرت دل میں رہتی ہے جس حسرت کا کچھ نام نہیں

خوشبو جیسے بھینی بھینی کلیوں کی قبائے تنگ میں ہے
خوابیدہ ہے یہ دل میں رہتی جس طرح شرارہ سنگ میں ہے
گاہے یہ سکوت شام میں ہے گاہے یہ شفق کے رنگ میں ہے
اور گاہے اس حسرت کی جھلک نے اور نوائے چنگ میں ہے

یہ رنگ ہے دل کی دنیا کا، یہ کفر نہیں اسلام نہیں
اک حسرت دل میں رہتی ہے جس حسرت کا کچھ نام نہیں

بازاروں کی رونق میں بھی بیگانہ سا رہتا ہے من جس طرح مسافر کے دل میں چٹکی لیتی ہے یادِ وطن
جس طرح سے پت جھڑ کی رت میں مبہم امید بہارِ چمن جیسے حسرت اور عبرت کا نقشہ ہو کوئی تعمیرِ کہن

اس حسرت کا معلوم ہمیں آغاز نہیں انجام نہیں
اک حسرت دل میں رہتی ہے جس حسرت کا کچھ نام نہیں

پردیس میں جیسے کوئی سنے چھوٹے ہوئے دیس کا گیت کوئی ساون کی ہوا میں یاد آئے بچھڑا ہوا من کا میت کوئی
حیراں سی اداسی جب کہ سماں سکھ کا جاتا ہو بیت کوئی اس طرح کی اک میٹھی سی کسک لے ہے من میں پریت کوئی

یہ مرغِ قفس کا نالہ ہے، یہ نغمۂ طائرِ بام نہیں
اک حسرت دل میں رہتی ہے جس حسرت کا کچھ نام نہیں

کہسار کے ہنگام میں پھنس کر ملتا کچھ اس کا سراغ نہیں آفات جہاں کی آندھی میں بجھتا من کا چراغ نہیں
پھر پردہ دل میں اس کا اثر آگاہ کچھ اس سے دماغ نہیں کیا اہلِ چمن کو دکھلائیں یہ لالۂ باغ کا داغ نہیں

چھپ کر رہنا ہے پسند اس کو اور ذوقِ نمودِ عام نہیں
اک حسرت دل میں رہتی ہے جس حسرت کا کچھ نام نہیں

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

یہ خموشی، یہ اُداسی، یہ جمودِ بے حسی!!
موت کی آغوش میں سوتی ہے گویا زندگی!!

ایک سناٹا سا ہے ہر چیز پر چھایا ہوا　　اے خدا! سوتے ہیں کیا اس وقت سب میرے سوا
ایک دنیا جو خمارِ خواب میں مخمور ہے　　ایک میں ہی ہوں کہ مجھ سے نیند کوسوں دور ہے

چٹکیاں لیتی ہے دل میں یاد اُن ایام کی!!
دفن ہے اک داستاں جن میں دلِ ناکام کی!!

دل میں ہے موہوم اور مبہم خیالوں کا ہجوم　　اور تڑپاتے ہیں اس کو ڈوبنے والے نجوم
دور نامعلوم، دھندلی سی فضاؤں میں کہیں　　تھی مری تخیل کی رنگین و روشن سرزمیں
اس جہانِ رنگ و بو سے اس فضائے نور سے　　شعر و موسیقی کی رنگیں جلوہ گاہِ طور سے

(۲)

وہ کہ جو ہے مطربِ مضرابِ سازِ زندگی　　وہ کہ جو ہے بانیٔ سوز و گدازِ زندگی
وہ کہ نہلایا ہے میں نے اپنے اشکوں سے جسے　　وہ کہ پایا ہے میں نے اپنے غموں سے جسے

اک سیہ چادر میں سارا جسم لپٹائے ہوئے
حسن کی رقصیدہ وہ جبیں اس میں سمٹائے ہوئے

ریشمیں زلفیں کمر تک اپنی لٹکائے ہوئے
پشت پر، اور کچھ سینہ پہ بکھرائے ہوئے

مست آنکھوں سے مئے گلفام چھلکاتا ہوا
جنبش لب سے حسیں نغمات برساتا ہوا

ہر قدم پر سحر موسیقی کو ٹھکراتا ہوا
ذرّے ذرّے میں فضا کے روح دوڑاتا ہوا

آپ ہی اپنی اداؤں میں وہ بل کھانے لگا!!
مسکراتا، جھومتا میری طرف آنے لگا!!

چپکے چپکے قلب کی گہرائیوں میں آگیا
رفتہ رفتہ روح کی بنیادیوں پر چھا گیا

نیند بن کر چھا گیا وہ میری چشم تر پر
اور ڈھلک کر گرم آنسو آگئے رخسار پر

بند آنکھیں ہو رہی ہیں، نیند اب آنے لگی!!
صبح کا تارا وہ ڈوبا، اور سحر گانے لگی!!

سازؔ

"پیرہن"

از

کلفورڈ بکس

مترجمہ

محمد عبدالقیوم خاں باقی ایم۔ اے (عثمانیہ) ریسرچ اسکالر

[عام طور پر سوائے درسی کتب کے یہ یاد نہیں رکھا جاتا کہ سارے ڈراموں کی اصل انسان کے مذہبی جذبات ہیں۔ یہ نہ صرف انگریزی، بلکہ یونانی اور چینی ڈراموں کے متعلق بھی صحیح ہے ....

پیرہن ایک جدید پُر اسرار ڈراموں میں سے ہے۔ مسٹر بکس نے فرشتے کی زبان سے کہلوایا ہے ——

ہم اس وقت آپ کو سرور بخشنے کا ارادہ نہیں رکھتے بلکہ

اگر ہوسکے تو بتانا چاہتے ہیں کہ

انسان کتنا عجیب ہے اور

وہ کون سی چیز ہے جو زمین پر زندگی چلاتی ہے۔"

یہ ڈرامے کی کلید ہے۔ اس پر بھی ڈرامہ بالکل جدید ہے اس میں قدامت کی کوئی جھلک نہیں پائی جاتی۔ موجودہ مصنف کی توجہ اس کی طرف اس وقت ہوئی جب کہ اس نے اس کی تاثیر کے متعلق ایک گاؤں کا قصہ سنا۔ واقعہ یہ تھا کہ یہ ڈرامہ کسی سیاح جماعت نے چلتے ہوئے دکھایا تھا۔ گاؤں میں ایک شخص نے اسے دیکھا اور اس کے دماغ پر اتنا اثر ہوا کہ اسے دوبارہ دیکھنے کے لئے یہ دس میل پیدل گیا جبکہ دوسرے گاؤں میں یہ تماشہ ہو رہا تھا۔"

باقی

اشخاص ڈرامہ
- ایک فرشتے کی رُوح
- ایک نو آزاد رُوح یعنی وہ جس کا ابھی انتقال ہوا ہے
- ایک نا آفریدہ رُوح

[**منظر**۔ چٹانوں میں ایک سبز و شاداب بلند مقام: دونوں جانب داخلے۔
پس پشت ایک نشست گاہ، اس پر ایک فرشتہ بیٹھا ہوا ہے —]

فرشتے کی رُوح (بیٹھے ہوئے)۔ ہنسی کا ایک وقت ہوتا ہے اور ایک وقت
سنجیدہ فکر اور مقدس دھیمی لے کے نغموں کا۔
ہم اس وقت آپ کو سرفراز کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے بلکہ
اگر ہو سکے تو بتانا چاہتے ہیں
کہ انسان کتنا عجیب ہے؟ اور
وہ کون سی چیز ہے جو کرۂ ارض پر زندگی کو رواں کر دیتی ہے؟
اس لئے سب سے پہلے میں آپ سے یہ کہنے کی خواہش رکھتی ہوں کہ
ہمارے اسٹیج اور ہمارے مناظر میں کوئی ایسی سرزمین نہیں ہے جہاں
جہاز یا ریل گاڑی آ سکے۔ اس کے بجائے
ہماری دنیا ایک روحوں کی دنیا ہے —— اُن کی جو ناآفریدہ اور ان کی جو مر چکی ہیں۔
پھر اس میں اداکار ہم ہیں ——
ہم کو عدم اور فنا کے دائرے سے باہر سمجھا جائے۔

اُن کے لئے جو گفتگو کر سکتے ہیں، ہمارا تماشہ
آب و گل یا خاکِ فانی نہ ہوگا
بلکہ پہلے اُن روحوں سے متعلق ہوگا ——— جو ناآفریدہ ہیں اور نفس حیات کی آرزومند
اور پاکی کی تمنا رکھتی ہیں، دوسرے وہ جو موت کے بعد جاگتی ہیں۔
میں آپ سے اتنا کہہ دیتی ہوں کہ ہمارے الفاظ کو
پورے طور پر سمجھے جانے کی فتح ضرور نصیب ہوگی .... اچھا اب تماشہ شروع ہو۔

{فرشتے کی رُوح اُٹھ کھڑی ہوتی ہے اور بائیں جانب دیکھتی ہے۔ سیدھی
جانب سے روح ناآفریدہ داخل ہوتی ہے گویا کوئی تاریک کمرے میں اپنا
راستہ ڈھونڈھ رہا ہو۔ اس کی آواز سُن کر فرشتے کی رُوح ادھر پلٹتی ہے}

ناآفریدہ ۔ گم ہوگئی ——— میں بھٹک گئی! کس طرف؟
راستہ کہاں ہے؟
کیا میں آنکھ بند کئے بڑھتی جاؤں یا واپس ہو جاؤں؟
راستہ کس طرف ہے؟ میں ایک قدم بھی
آگے نہیں دیکھ سکتی ——— کیا تاریکی اس لئے زیادہ معلوم ہوتی ہے کہ
میں آسمان کی طرف سے آرہی ہوں؟ اگر میں
تھوڑی دیر یہاں ٹھہر جاؤں تو میری نظر
شاید یہ کمزور روشنی استعمال کرنا سیکھ لے۔
ہاں! سچ ہے: اب یہ جگہ میرے حواس پر اُجاگر ہوتی اور بڑھتی جارہی ہے
یہ ایک کوہستانی درہ ہے۔ میرے سر پر آسمان کی نیلی چوٹیاں ہیں
اور نیچے گلپوش سبزوں کے غار۔
کیا واقعی میں آسنا راستہ اُتر آئی؟

اور اتنی تھوڑی سی دیر میں ؟ میں اب،
انسانوں کی بستی سے بہت دور نہیں رہ سکتی
جہاں میں کبھی تھی اور جہاں اگر ممکن ہو تو
میں آج واپس جا سکتی ہوں۔
کیا میری یاد مجھے دھوکا دے رہی ہے یا میری آنکھیں
وہاں ایسا حسن دیکھیں گی جو اُن کے ظرف سے بہت زیادہ ہے؟
کیونکہ مجھے یاد ہے، نہیں میرا خیال ہے کہ وہاں
تاریک جنگل اور شفاف آسمان ہیں،
سمندر پر صبح کی دھوپ کے موتی بکھرے ہوئے ہیں۔
غروب آفتاب کے نظارے بھی ہیں
جو ایسے معلوم ہوتے ہیں گویا جنتیں فضا میں گھل مل گئی ہیں۔
وہاں مرد اور عورتیں ہیں جو خوش، ذی ہوش اور مہربان ہیں۔
آہ، زمین پر پھر آباد ہونا ——
پھر مرد اور عورت بن جانا!
مگر یہ کیسے سوچوں کہ راستہ کس طرف ملے گا ؟

فرشتہ ۔ زمین یہاں سے ایک دن دور ہے

ناآفرید ۔ کون ہے یہاں ؟ ایک فرشتہ!

فرشتہ ۔ ہاں

ناآفرید ۔ میں ابھی آسمان کے قریب ہوں، اس لئے
میں آپ کو اُن لوگوں کے شیریں انداز میں جن کے ساتھ
کل میں سیر کر رہی تھی سلام کرتی ہوں (دونوں بوسہ لیتے ہیں)

پیاری بہن تم جانتی ہو کہ میں یہاں
دنیا کا پتہ چلانے بھیجی گئی ہوں۔ بتاؤ میں کس طرف جاؤں ؟

ناآفریدہ کیا تم زندگی کی خواہاں ہو؟ کیا تمھیں کافی برکتیں نہیں ملیں ؟

فرشتہ میں وہ خُم ہوں جس میں آسمان نے
محبت کی شراب لبالب بھردی ہے
اب میں بھر چکی ہوں اس لئے
کیا تعجب ہے کہ میں کسی اور کو اپنا حصہ دار بنانا چاہوں ؟
گو زمین کی یاد میرے دل میں بہت خوشگوار ہے،
مگر ہو سکتا ہے کہ بعض چیزیں میرے ذہن سے اُتر جائیں
اور اکثر، ایک عجیب حیرت اور استعجاب میں
ان لوگوں کو جو ابھی ابھی اس طرف سے آئے ہیں یہ کہتے سُنا ہے
کہ زمین کو انسانوں نے ہنوز اتنا
پاک اور حسین نہیں بنایا ہے جتنا آسمان پاک اور حسین ہے۔
اس لئے شاید کسی قدر فخر کے ساتھ ـــــ میں اُمید رکھتی ہوں
کہ وہاں عشق و محبت کی جگہ باقی ہے۔
اگر میں سچ کہتی ہوں تو بتائیے میں وہاں کس رستے جا سکتی ہوں ؟
میں جانتی ہوں، بعض رُوحیں، جب وہ زمین کے قریب ہوتی ہیں
تو سہم سی جاتی ہیں ـــــ صرف سونے اور جاگنے کے لئے سہم جاتی ہیں!
مجھے تو کبھی آفرینش کا اتنا خوف نہیں ہوا۔

فرشتہ ۔ آؤ بہن۔ اس چوٹی سے
تم ایک سیارہ دیکھ سکتی ہو جس کی تمھیں تلاش ہے ۔

نا آفریدہ - کہاں ہیں تو اتنے تارے دیکھتی ہوں کہ شمار نہیں کر سکتی۔
وہ شب جاوید میں بلبلوں کی طرح نظر آرہے ہیں۔
ان میں زمین کون سی ہے میں نہیں جانتی ؟ وہ تو نہیں۔
جو بھڑکتے ہوئے شعلوں کا چشمہ ہے ؟

فرشتہ - نہیں، وہ اتنا فروزاں نہیں ....
وہ ایک چھوٹا سا کرہ، ایک معمولی مقام ہے
جو دور کے آفتابوں میں مشکل ہی سے نظر آتی ہے۔
اس دائرۂ عظیم کو دیکھو (لوگ اسے سیرلس کہتے ہیں)
جس پر لا انتہا رنگوں کا رقص ہو رہا ہے جیسے کوئی
ہفت رنگی جامہ پہنا ہو ؟
اُس سے مشرق کی طرف دیکھو اور اپنے نظارے کو
راہ کہکشاں سے اُس پار لے جاؤ۔

نا آفریدہ - ادھر تو کچھ نظر نہیں آتا۔ سب تاریک ہے۔

فرشتہ - پھر ایک بار دیکھو

نا آفریدہ ایک جھپکتا ہوا شرارہ ......
کیا یہی دنیا ہے ؟

فرشتہ - اب تم کو دنیا کا کچھ پتہ مل رہا ہے ...... وہ انسان کا چوندھیا دینے والا آفتاب ہے۔

نا آفریدہ - ہاں اور اس کے اردگرد دھندلی سی چرخیاں دکھائی دیتی ہیں۔
ایسا معلوم ہوتا ہے میری تھکی ہوئی آنکھوں میں تارے ٹوٹ رہے ہیں۔

فرشتہ - تیسری چرخی کو دیکھو ...... نظر آرہی ہے تمھیں ؟

نا آفریدہ ہاں ...... ؟

فرشتہ ۔ وہی زمین ہے ...... کتنی چھوٹی
کتنی موہوم! .... گر تم سمجھو اس میں
بہت بڑا حسن ہے ـــــ پھر الم بھی ہے جو برداشت نہیں ہو سکتا!

ناآفریدہ ۔ اور یہاں پیدائش کس طرح ہوگی؟

فرشتہ ۔ ایک تدریجی خواب، ایک لغزش آمیز نزول ۔
طاقت کی ایک بڑھتی ہوئی موج جسے تم روک ہی نہیں سکتیں ۔
یہاں تک کہ تم اس زندگی میں ڈوب کے جاگتی ہو ـــــ احتیاج کے لئے اور رونے کے لئے!

ناآفریدہ ۔ قسم ہے، اب بھی وہ میرے اس عزم کو نہیں روک سکتی کہ
میں رہتی دنیا تک محبت پھیلاتی ہی رہوں ۔

فرشتہ ۔ زمین پر ہزاروں یہ ارادہ کر جاتے ہیں ـــ
تم کو بھی شاید اس پر قائم رہنے کی طاقت مل جائے ـــ مگر میں آگاہ کئے دیتا ہوں کہ
پیدائش وسیع آسمانی دل کو سکیڑا دیتی ہے ۔

ناآفریدہ ۔ مہربانی کرکے مجھے دوسری منزل پر پہنچا دیجئے ۔

فرشتہ ۔ تم ایک ساعت پہلے ہی کی استدعا کر رہی ہو۔
مجھے ایک دشوار تر کام لاحق ہے ۔

ناآفریدہ ۔ کیا ہے وہ؟

فرشتہ ۔ میں یہاں ایک عورت کی رہنمائی کے لئے کھڑی ہوئی ہوں ۔
جس کی ابھی ابھی وفات ہوئی ہے ۔ کیونکہ
وہ جب اپنے جسم اتار پھینکتی ہیں جسے روح انسانی موت کہتی ہے ۔
تو سارے انسانی ارواح کو اسی رستے گذرنا پڑتا ہے ۔
وہ تمہاری طرح آسمان سے سیدھا سادا لباس پہنے ہوئے جاتی ہیں ۔

لیکن جوں جوں دن گزرتے ہیں وہ اپنے دماغ سے
ایسے ہی خیالات کی تار بانی کرتی ہیں جن میں
خودی کی نمود اور خودی ہی کا فائدہ ہو۔
یہ خیالات گو نگاہ فانی کو نظر نہیں آتے
مگر ایک پیرہن، ایک گہرا منقش پیرہن بن جاتے ہیں۔
اور اس سے ان کا حقیقی نا اس طرح چھپ جاتا ہے جیسے دھوئیں میں شعلہ
اسے زمین پر، وہ اتنا پہنتے ہیں کہ
اُتارنے کا نام نہیں لیتے اور
یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی ہستی خود وہی لباس ہے جو وہ پہنے ہوئے ہیں۔
یہاں میری خدمت اُسے یہ تعلیم دینا ہے کہ
آسمان میں داخل ہونے سے پہلے اس کی
یہ خودی بیگانہ مرجانی چاہئے۔ پھر وہ دوبارہ
تمہاری طرح سادہ بن جاتی ہے۔

ناآفرید ۔ میری ایک تمنا ہے، پوری کیجئے۔

فرشتہ ۔ کیا ہے وہ؟

ناآفرید ۔ مجھے یہ ثابت کرنے دیجئے کہ
محبت کا ذکر میں نے بڑھا چڑھا کر اور بے کار نہیں کیا تھا
آپ اپنا کام میرے سپرد کر دیں۔
اور میں (اس نو آزاد روح کو) آزاد کر دوں گی۔

فرشتہ ۔ یہ کام جتنا آسان معلوم ہوتا ہے اتنا آسان نہیں ہے۔

ناآفرید وہ کس طرح؟ اس پر اثر ڈالنا اور مجبور کرنا

کہ وہ پیرہن اُتار دے اور اپنی خودی حاصل کرلے کوئی مشکل کام ہے؟

فرشتہ۔ اچھا تمہاری تمنا منظور .... اُدھر دیکھو۔ وہ چلی آرہی ہے
فکرِ حیات ابھی اُس سے دور نہیں ہوئی
وہ نیم خواب اور نیم بیداری کے عالم میں چل رہی ہے
گویا وہ ایسی نیند میں ہے جسے توڑا نہیں جاسکتا۔

[بائیں جانب سے رُوح ابھی انتقال کرکے چلی آرہی ہے اور اپنی ہیئت پر ایک پیچیدہ نقش کا پیرہن اوڑھی ہوئی ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے اس کی حرکتیں اور انداز ایک بیہوش کی طرح معلوم ہوتے ہیں ——————]

فناشدہ رُوح۔ نہیں ——— ٹھیرو۔ تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاسکتے
میرے سر میں اب درد نہیں ہے، بخار بھی کم ہوگیا ہے،
مگر میں یہ نہیں سمجھ سکتی کہ میں ابھی فریش ہوں۔
ایسا معلوم ہوتا ہے میں کسی مقام پر
ایک بلندی سے دوسری بلندی پر چڑھ رہی تھی
اور رُک نہ سکتی تھی۔ پھر بھی مجھے آرام کی ضرورت ہے!
(وہ زمین پر بیٹھ جاتی ہے)

فرشتہ۔ (نوآزدیدہ سے) دیکھنا، اس کے خیالات ابھی صاف نہیں ہوئے
یہ اس زندگی میں اُلجھے ہوئے ہیں جسے وہ ابھی چھوڑ آئی ہے

نوآزاد۔ قریب آؤ ———
میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ کیا تم سن سکتے ہو؟
میں اپنی بہن کی قرض دار ہوں۔ اُسے ڈر ہے کہ
اگر میں کچھ دن اور بیمار رہوں تو قرض ادا نہ کرسکوں گی۔

اُسے ضرور کہنا کہ میں قرض ادا کرہی دوں گی۔ ایک ایک پیسہ۔
میں مروں گی نہیں........ کاش پہلے ہی فیصلہ ہو گیا ہوتا۔
کیوں ٹھیک ہے نا؟........ جواب نہیں دیتے...... کیا میں سو گئی ہوں؟

فرشتہ ۔ (حسب سابق) یادِ گذشتہ کا یہ افسوں۔
جو اس کی ساری قوتوں پر حاوی ہے۔
لحظہ بہ لحظہ کم ہوتا جائے گا۔

نوآزاد ۔ یہ سب ایک خواب ہے ——— پہاڑ، آفتاب جو بلندی پر ہے
اور جو ابر میں چھپ کر آدھے آسمان کو موتی بنا دیتا ہے
اور وہ کبھی حرکت نہ کرنے والے پھولوں کے شاداب نشیب
آؤ، قریب آؤ ——— اگر آج بھی وہ اس کا ذکر کرے
تو کہہ دینا کہ میں نے حلف اُٹھا کر رقم ادا کرنے کا وعدہ کیا ہے۔
ایک دفعہ میں اچھی تو ہو جاؤں۔ تم کہاں چلے گئے؟
تم ہزاروں کوس دور معلوم ہوتے ہو؟
اے لو، وہ پھر اُبھر آئے ——— وہ خواب کے پہاڑ!
مجھے چلے چلنا چاہیے ——— آہ میں کتنی ناتوان ہو گئی ہوں۔
میرے پیراہن کا وزن تک بار ہو رہا ہے۔
(وہ تکلیف کے ساتھ اُٹھ کھڑی ہوتی ہے)

فرشتہ ۔ اب وہ جاگ گئی ——— جاؤ ——— وہ افسوں دور کردو
جو اُسے گھیرے ہوئے تاکہ اُس کا پیراہن اُتر جائے۔ جلدی جاؤ
(سیدھی جانب چلی جاتی ہے)

ناآفرید بہن میں تمہاری مدد کے لئے آئی ہوں۔

نوآزاد ۔ کیا مجھے مدد کی ضرورت ہے؟ میں نے ہمیشہ فخر کے ساتھ
دوسروں کی مدد کو ٹھکرایا ہے ـــــ مگر ہاں،
تم ہو کون؟

ناآفریدہ ۔ کیوں؟ میں ایک رُوح ہوں جو ابھی پیدا نہیں ہوئی

نوآزاد ۔ ایسی کوئی شے تو نہیں ہوتی۔

ناآفریدہ ۔ مگر اب تمھیں یقین کیسے آئے۔
دیکھو ـــــ میں موجود ہوں!

نوآزاد ۔ بغیر کسی ہیئت کے، روحوں کا وجود
ناممکن ہے ـــــ نغمہ تو ہو، مگر ساز اور تار نہ ہوں۔ کیا خوب!
اور پھر، یہ جو تمہاری ایک صورت ہے؟

ناآفریدہ ۔ میں اب جو پہنے ہوں وہ
۔ میرے وہاں کے جسم کا ایک نمونہ ہے

نوآزاد ۔ وہاں کے، یعنی زمین کے؟

ناآفریدہ ۔ میں آج وہاں جانے والی ہوں

نوآزاد ۔ یہ سچ نہیں ہے ....؟
اگر تم وہی ہو جو تم کہتی ہو تو
پھر میں کون ہوں؟

ناآفریدہ ۔ تمہارا جسم ابھی ابھی فنا ہوا ہے

نوآزاد ۔ ہاں، مگر کس طرح؟ اگر بشر کی مرضی سے نہیں
تو محض اتفاق سے۔

ناآفریدہ ۔ میرا خیال تھا کہ بشر رحم دل اور منصف مزاج ہوتے ہیں۔

نو آزاد ۔ وہ کیوں ایسے رہیں؟ جب وہ جانتے ہیں کہ وہ خاک محض ہیں؟

نا آفریدہ ۔ مگر وہ تو روح ہیں!

نو آزاد ۔ پھر بھی لوگ زندگی کو حماقتوں
میں یا محنت میں گنواتے ہیں۔

نا آفریدہ ۔ آہ اگر یہ سچ ہے تو میں سمجھتی ہوں
زمین ایسا خوفناک مقام ہے۔ مجھے اپنی آفرینش سے ڈر سا ہونے لگا ہے

نو آزاد ۔ اگر تم یہاں کی طرح وہاں بھی سیدھی سادھی رہو
اور یہی خیال کرتی رہو کہ فضائے بسیط میں عشق ہی کی سلطانی ہے
تو تم کو اہل دنیا جیسا کہ ہمیں اندیشہ ہے یقیناً جفا کار اور فریبی معلوم ہوں گے۔
جو بے دلوں اور زبردستوں کو ابھارتے
اور نیک مزاجوں کو انتہائی برائیاں سہنے پر مجبور کرتے ہیں۔
ذرا عقل سے کام لو ——
اپنے لئے ایک حفاظت کا سامان، ایک بھیس تیار کرو۔
اور یقین رکھو —— یا تو تمھیں
دوسری کی مرضی پر چلنا ہے یا اپنی مرضی پر چلانا
اگر تم مدارات اور رحم دل سے دور کر کے
پہلے ہی قدم پر
اپنی ضرورت معلوم کرو، اور دوسری کو ہٹا کر
اسے حاصل کرو تو —— یقیناً
تم خوش رہ سکتی ہو اور یہ سمجھ سکتی ہو کہ دنیا ایک کھیل ہے
کافی دلچسپ۔ اس کے سوائے کوئی چارہ نہیں۔

ناآفرید ۔ تمہارے یہ کہنے سے قبل —— میرا خیال تھا کہ انسان کو عشق کا تحفہ دوں
نوآزاد ۔ عشق اور سادگی سے دنیا میں کچھ نہیں ملتا
ناآفرید اس لئے تم نے شاید یہ پیرہن بنا لیا
نوآزاد اب تم کو اس کی قدر معلوم ہو رہی ہے
مگر میں کون راستہ جاؤں ؟ یہاں سب
ناآفرید ۔ اپنا یہ پیرہن اُتار پھینکنے تک تم یہیں اسیر رہوگی
نوآزاد ۔ آہ، اب تم بھی غرض کی بات کرنے لگیں۔
یہ پیرہن مجھ سے لے کر خود پہننا چاہتی ہو خوب !
اچھا راستہ نہ بتاؤ میں خود ہی کوئی نہ کوئی
ڈھونڈھ لوں گی —— خدا حافظ

(وہ سیدھی جانب حرکت کرتی ہے مگر فرشتہ رُوح کا راستہ روک لیتی ہے)

فرشتے کی رُوح ۔ کہاں جاؤگی ؟
نوآزاد ۔ مجھے جنت کی تلاش ہے
فرشتہ ۔ پہلے خودی کا فخر و ناز یہاں الگ کر دو
نوآزاد ۔ تم بھی یہی کہتی ہو ؟ تو معلوم ہوتا ہے کہ
یہاں ہماری شخصیتیں ——
فرشتہ ۔ صرف دنیوی خواب ہیں۔
نوآزاد ۔ اچھا اور عقل ؟
فرشتہ ۔ ہم طبقات سماوی میں علم
کچھ اور طریقوں سے حاصل کرتے ہیں —— اور بہت جلد بھی
اس کا انسان کو گمان تک نہیں ہو سکتا۔

نوآزاد ۔ وہ کیا ہے؟

فرشتہ ۔ ہم کسی سے محبت کرتے ہیں اور
فوراً ہی ہم کو اس کی ماہیئت اور باطن کا علم ہوجاتا ہے

نوآزاد ۔ میرا پیرہن ـــــ یہ تو میں ہوں ـــــ اور تم کہتی ہو
میں اُسے نہیں پہن سکتی

فرشتہ ۔ تو پھر اس وقت تک برزخ میں رہو۔
یہاں تک کہ وقت تم کو عقل و ہوش دے
اور تم اپنی خود نمائی سے باز آجاؤ

نوآزاد ۔ افسوس، میں اس وقت تک انتظار نہیں کرسکتی!

فرشتہ ۔ تو پھر پیرہن اُتار دو۔

نوآزاد ۔ میرا خوف اور میری تمنا دونوں ایک ساتھ قائم ہیں
مگر نہیں ـــــ خواہ کچھ ہو میں اسے پورا ہی کروں گی

[وہ پیرہن اُتار کے نشست گاہ پر پھینک دیتی ہے۔ اب روح نا آفریدہ
کی طرح وہ سادہ لباس میں نظر آتی ہے ـــــــــ]

اب میں آزاد ہوں
اب میں جانتی ہوں مسرت کیا شے ہے؟
بہت دنوں کے بعد اپنے گھر واپس آئی ہوں۔ کائنات کی اور میری
لَے دونوں ایک ہیں جیسے سمندر پر کف رہتا ہے
چلو دوسری چوٹی کی طرف چلیں۔

فرشتہ ۔ (نا آفریدہ کی طرف پلٹ کے) اور تم؟ .... یہیں خدا حافظ

[فرشتہ اور روح نوآزاد سیدھی جانب چلے جاتے ہیں۔ نا آفریدہ روح کھڑی
ہوکر انھیں جاتے ہوئے دیکھتی ہے۔ پھر پلٹتی ہے اور اس کی نظر پیرہن پر پڑتی ہے]

ناآفریدہ ۔ میری منزل بہت کٹھن ہے۔ دیکھو نا، خود اس نے
میری سادگی کی ہنسی اُڑائی اور کہا کہ اہل دنیا
مجھے اپنے مذاق اور ہنسی کا ذریعہ بنائیں گے۔
مگر یقیناً......... اگر میں اس کا پیرہن اوڑھ لوں ——— تو کیا ہوگا؟
پھر میں اُن سے بھی طاقت ور جاونگی
میرا داغ اُن سے زیادہ رسا ہو جائے گا ——— سب سے زیادہ طاقتور، کسی سے کم نہیں
میں ضرور اسے پہن لوں گی۔

(پیرہن پہن لیتی ہے)

جو شخص چاہے اپنی قسمت اور لطف کے اجزا پر قناعت کرے
میں کل کے لئے ساری کائنات گھنگول ڈالوں گی
میں کبھی ایک حال پر قایم نہ رہوں گی۔ میں بار ڈالوں گی بار نہ اُٹھاؤں گی
اس وقت ساری دنیا جان لے گی کہ میں، میں ہوں!

(وہ بائیں جانب چلتی ہے۔ سیدھی جانب سے فرشتے کی رُوح داخل ہوتی ہے)

فرشتہ ۔ (عقب کی نشست گاہ کی طرف جاتے ہوئے) وہ ناکام رہ گئی......... وہ یہاں موجود نہیں ہے
مگر وہ کون آرہا ہے؟ اس کا انجام کیا ہوگا؟
جب وہ اس حالت سے گذر جاتی ہیں تو
بعض روحوں کو میں نے دیکھا کہ اُن میں محبت شعلہ بن کر چمکتی ہے
اور لوگ اس کی روشنی دیکھ کر یاد کرتے ہیں کہ وہ کہاں سے آتی ہیں؟

محمد عبدالقیوم خاں باقی یم اے عثمانیہ

ہندوستان

خار و خس کے جھونپڑے، مٹی کے بوسیدہ مکاں　　جیسے اندھوں کے اشارے، جیسے گونگوں کی زباں
جس طرح اُترے ہوئے چہرے پہ آنسو کے نشاں　　جس طرح سوکھی ہوئی ٹہنی پہ اُجڑے آشیاں

داغ جن کے ساز و ساماں، درد جن کا پاسباں
کیا اسی دُنیا میں تُو پلتا ہے اے ہندوستاں

ایک ڈھانچہ ہڈیوں کا، ایک چلتی پھرتی لاش　　جس کو قبرستان میں ہے زندگانی کی تلاش
جس کے دل کی دھڑکنوں میں غم کے کانٹوں کی خراش　　بے کسی جس کا سہارا، مفلسی جس کی معاش

دستِ بازو جس کے شل جس کا سفینہ پاش پاش

کیا اسی کو پالتی ہے مادرِ ہندوستاں

دھوپ سے جھلسے ہوئے بچے پہ فاقوں کے ستم
جس کی ننھی سی زباں سوکھی ہوئی اور آنکھ نم

جیسے کچی نیند سے نازک پپوٹوں پر ورم
جیسے مینائے تہی کے دل میں فکرِ بیش و کم

جیسے بے رس پھول، جیسے بند مٹھی کا بھرم

کیا اسی کو پالتی ہے مادرِ ہندوستاں

اک سسکتا سانس، اک ٹوٹا ہوا تارِ رباب
جیسے گہری سونج میں پچھلے پہر کا ماہ تاب

جیسے باسی پھول کی بو، جیسے پت جھڑ کا گلاب
جیسے دن میں چاند تارے جیسے دریا میں حباب

جیسے دیوانے کی جنت، جیسے مفلس کا شباب

کیا اسی کو زندگی کہتے ہیں اے ہندوستاں

موت کی پرچھائیوں میں پلنے والی زندگی
آندھیوں سے ٹمٹما کر جلنے والی زندگی

ظلمتوں میں اپنی آنکھیں ملنے والی زندگی
تھام کر لغزش کا دامن چلنے والی زندگی

غم کے سانچے میں مسلسل ڈھلنے والی زندگی
کیا اسی کو زندگی کہتے ہیں اے ہندوستاں

قسمتوں کے دائرے میں گھومنے والی سماج　　ڈسنے والی ایک ناگن، ایک زہریلا مزاج
ننگ ہستی سر پہ اک اوہام کی پستی کا تاج　　مفلسوں سے جو لیا کرتی ہے گن گن کر خراج
دفن ہو جاتا ہے جس کے ہاتھ سے ہر روز "آج"

کیا اسی کے ہاتھ میں ہے پرچم ہندوستاں

اس جفا پروردہ اُمت کے جفا پرور امام　　قصر و ایواں کے خدا، دولت کے بندے وہ غلام
خونِ دہقاں سے ہے رنگیں جن کی عظمت کا مقام　　جن کے مذہب میں صداقت اور ہمدردی حرام
کیا انھیں کے ہاتھ میں ہے تیری قسمت کی لگام

شرم اے ہندوستاں، افسوس اے ہندوستاں

ایک ارمانِ مسرت، ایک ارمانِ قرار　　جیسے بے پایاں سمندر کے کنارے جوئبار
جیسے ریگستان میں بھٹکی ہوئی موجِ بہار　　جیسے وہموں کی پرستش، جیسے سایوں کا شکار

ارض پر جیسے فرشتے شہر میں جیسے گنوار

کیا یہی ہے اضطراب آرزو ہندوستاں

ایک آہِ نارسا، بیگانۂ ذوقِ سخن　　جیسے پہلی شام کو مہتاب کی مدھم کرن
جیسے اک اندھی کنواری کا ادھورا بانکپن　　جیسے مرجھائی ہوئی کلیوں میں روداد چمن
جیسے اک سوئے ہوئے کافر کی ابرو میں شکن

کیا یہی ہے قوتِ فریاد، اے ہندوستاں

آنسوؤں کے نام سے کب تک گرایا جائے گا　　نالہ و فریاد میں کب تک سنایا جائے گا
پردۂ تقدیر میں کب تک چھپایا جائے گا　　ایک گہری نیند میں کب تک سلایا جائے گا
تو ستایا جا چکا، کب تک ستایا جائے گا

جاگ اے ہندوستاں ہاں جاگ اے ہندوستاں

میکش

ایک گاؤں کی فی کس سالانہ آمدنی

کسی ملک کی خوش حالی کا دار و مدار زیادہ تر اس دولت پر ہے جو ملک کے مختلف ذرائع سے پیدا کی جاتی ہے۔ اور یہی ملک کی قومی آمدنی کہلاتی ہے۔ قومی آمدنی کی مختلف تعریفیں کی گئیں ہیں مثلاً پروفیسر اے ۔سی پیگو کہتا ہے کہ " ان تمام اشیار اور خدمات کو قومی آمدنی میں داخل کرنا چاہئے جو کہ واقعی طور پر زر کے معاوضے میں فروخت کی جاتی ہوں لیکن اشیا کو دو مرتبہ شامل کرنے سے گریز کرنا چاہئے[۱]"۔ پروفیسر الفرڈ مارشل کا خیال ہے کہ " ملک کی محنت اور اصل سے ہر سال ایک خاص مقدار میں مادی اور غیر مادی اشیا پیدا ہوتی ہیں، جن میں ہر قسم کی خدمات بھی شامل ہیں یہی کسی ملک کی صحیح قومی آمدنی ہیں[۲]"۔ اسٹیمپ تعریف کرتا ہے کہ " قومی آمدنی میں ان اشیا اور خدمات کو شامل کرنا چاہئے جن کا نہ صرف زر سے مبادلہ ہو سکے بلکہ جو حقیقی طور پر زر سے تبادل ہوتی ہوں[۳]"۔

قومی آمدنی سے قوم کی معاشی خوش حالی کا اندازہ ہو سکتا ہے، مختلف سالوں کے اعداد سے معلوم ہو جاتا ہے کہ آیا

۱ه " دی اکنامکس آف ویلفیئر"، پروفیسر اے، سی پیگو مطبوعہ ۱۹۳۲ء صـ۳۲

۲ه " اصول معاشیات" الفریڈ مارشل صـ۵۲۴

۳ه " برٹش انکم اینڈ پراپرٹی"، اسٹیمپ صـ۴۱۶

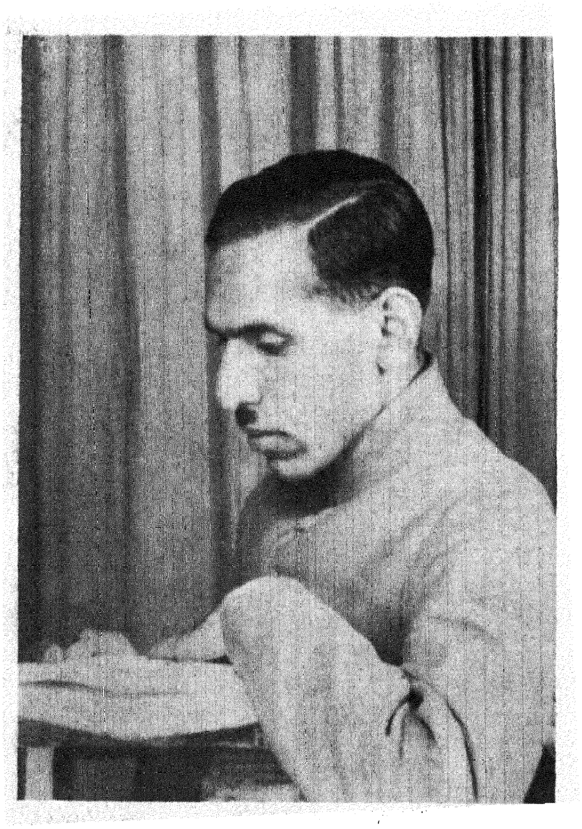

MR. MD. AHMED SUBZWARI, B A. (OSMANIA).

He has contributed many articles on economics to first rate Magazines and journals of India.

قوم کی خوش حالی میں اضافہ ہو رہا ہے یا تخفیف۔ نیز اضافے یا تخفیف کا رجحان تیز رو ہے یا سست رو۔ صحیح اور قطعی اعداد معلوم ہونے کے بعد ان تدابیر پر بھی غور کیا جا سکتا ہے کہ کس طرح ملک کی گھٹتی ہوئی آمدنی میں اضافہ کیا جا سکتا ہے یا بڑھتی ہوئی آمدنی میں مزید اضافے کی گنجایش نکالی جا سکتی ہو۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ دیکھنا بھی بہت ضروری ہے کہ ملک کی معمولی آمدنی ملک کے مختلف معاشی طبقوں میں کس تناسب سے تقسیم ہو رہی ہے۔ کیوں کہ پیدا شدہ دولت کی تقسیم غیر موزوں عدم مساوات بھی ملک کی عام خوش حالی کو متاثر کرتی ہے۔ جس طرح ہم اس ملک کو مرفہ الحال نہیں سمجھ سکتے جس کی قومی آمدنی کا فی کس اوسط بہت کم ہوتا ہو، اسی طرح ہم کو اس ملک کی خوش حالی میں بھی شک ہوگا جہاں پیدا شدہ دولت کا بڑا حصہ آبادی کے تھوڑے سے حصے کے قبضے میں چلا جاتا ہو، اور آبادی کے بڑے حصے میں دولت کی مقدار کم آتی ہو۔

قومی آمدنی کا اندازہ کرنے کے مختلف طریقے ہیں، مثلاً معمولی آمدنی کے اعداد و شمار سے قومی آمدنی کا تخمینہ لگایا جاتا ہے مگر ان ملکوں میں جہاں فی کس آمدنی کا اوسط کم ہوتا ہے اس طریقے کو اختیار نہیں کیا جا سکتا مثلاً ہندوستان میں صرف وہ لوگ جن کی آمدنی ۲ ہزار سالانہ سے زائد ہے محصول آمدنی ادا کرتے ہیں، اور ملک میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔ آبادی کے بڑے حصے کو محصول ادا کرنے کی دشواریوں اور مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ پیشہ واری اعداد سے بھی قومی آمدنی کا تخمینہ کیا جاتا ہے مگر یہاں بھی ضمنی صنعتوں اور ذیلی کاروبار کی آمدنی کے اعداد دستیاب نہیں ہوتے، اس لئے یہ طریقہ بھی مفید نہیں ہو سکتا۔ قومی آمدنی کے حساب لگانے کا تیسرا طریقہ پیدائش دولت کے اعداد و شمار ہیں مگر یہ اعداد بھی مکمل نہیں ہیں مثلاً ہندوستان میں زرعی پیداواروں اور معدنی پیداواروں کے اعداد مل جاتے ہیں مگر مرمت کے کاموں کی اجرت، ماہی گیری، ضمنی صنعتوں، ریل کے علاوہ باربرداری کے دوسرے ذرائع کی آمدنی، چلر فروشوں کے منافع، خانگی خدمات کے اعداد بہت کم ہیں اس لئے بہت سا کام محض اندازوں پر کیا جاتا ہے۔

اعداد و شمار کی قلت کی وجہ سے ہندوستان کی قومی آمدنی کا اندازہ لگانے میں بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں مگر پھر بھی متعدد اصحاب نے مختلف طریقوں سے قومی آمدنی کے اندازے لگائے ہیں، اس سلسلے میں سب سے پہلا نام دادا بھائی نارو جی کا ہے جنھوں نے ۱۸۶۸ء–۷۰ء میں زرعی پیداواروں کی قیمت کا اندازہ (تخم کی قیمت گھٹانے کے بعد) ۲۶ چھبیس کرور پونڈ کیا تھا، نمک، کوئلہ، افیون، اور تجارت کا منافع ایک کرور ۰ ۷ لاکھ مصنوعات وغیرہ ڈیڑھ کرور، دودھ، مچھلی، گوشت ڈیڑھ کرور، اور مد متفرقات کے لئے تین کرور کی رقم مخصوص کی تھی۔ اس طرح ملک کی مجموعی آمدنی

۳۱ کروڑ پونڈ ہوتی تھی۔ جس کو اس وقت کی برطانوی ہند کی سترہ کروڑ آبادی سے تقسیم کیا تھا اور اس طرح قومی آمدنی کا اوسط ۴۰ شلنگ یا ۲۰ روپے فی کس آتا تھا[۵]۔ دادا بھائی نے خدمات کو اس لئے شامل نہیں کیا کہ ان کا معاوضہ پیداشدہ اشیا ہی میں سے دیا جاتا ہے اور جب اشیا کو شامل کر لیا تو خدمات کو شامل کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔

بعد میں جن لوگوں نے قومی آمدنی کے تخمینے لگائے ہیں ان میں کے ٹی شاہ، کے جے کھام باٹا، پی اے واڈیا، جی این جوشی، اور جی فنڈلے شیراز کے نام قابل ذکر ہیں۔ شاہ اور کھام باٹا نے خدمات کی آمدنی کو بھی قومی آمدنی میں شامل کیا ہے شیراز نے زرعی اور معدنی پیداواروں، صنعتی اشیا، ذرائع نقل وحمل، تجارت، نظم عامہ، فوج، آزاد پیشوں اور خانگی خدمات کے معاوضوں کو بھی قومی آمدنی کی فہرست میں داخل کیا ہے۔ نیز انھوں نے زرعی پیداواروں کی قیمت میں سے تخم کی قیمت منہا نہیں کی ہے۔

بہرحال ہندوستان میں وقتاً فوقتاً قومی آمدنی کے بارے میں جو تحقیقات ہوئی ہیں ان کے نتائج حسب ذیل رہے ہیں[۶]

تحقیق کنندہ	سنہ تحقیق	قومی آمدنی فی کس (روپیوں میں)
دادا بھائی نارو جی	سنہ ۱۸۷۰ء	۲۰ — ۰ —
بیرنگ باربور	سنہ ۱۸۸۲ء	۲۷ — ۰ —
ڈگبی	سنہ ۱۸۹۸-۹۹ء	۱۸ — ۹ —
لارڈ کرزن	سنہ ۱۹۰۰ء	۳۰ — ۰ —
ڈگبی	"	۱۷ — ۴ —
واڈیا اور جوشی	سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء	۴۴ — ۵ — ۶
شاہ اور کھام باٹا	سنہ ۱۹۲۱-۲۲ء	۶۷ — ۰ — ۶
فنڈلے شیراز	سنہ ۱۹۲۴ء	۱۱۶ — ۰ — ۰

---

۵ "پاورٹی اینڈ ان برٹش رول ان انڈیا"، دادا بھائی نارو جی صفحہ ۳

۶ "معاشیات ہند"، جی بی جتھیار اور ایس بی بیری، جلد دوم سنہ ۱۹۳۲ء صفحہ ۱۶۹

مگر ان مختلف اعداد سے کوئی صحیح نتیجہ اس لئے نہیں نکالا جاسکتا کہ یہ مختلف سالوں کے ہیں اور ہر سال قیمتوں میں تغیرات ہوتے رہتے ہیں نیز روپے کی شرح مبادلہ بھی بدلتی رہی ہے۔ پھر طریق کار میں بھی اختلافات ہیں اور ان کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ اس سلسلے میں مسٹر شیراز کے مضامین کا ایک سلسلہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۸ء کے ٹائمس آف انڈیا میں شائع ہوا ہے۔ جس میں حالیہ سالوں کے اعداد دیئے گئے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ مقابلے کی آسانی کی خاطر مقابلہ اعداد بھی پیش کئے گئے ہیں جو حسب ذیل ہیں[۵۱]۔

سنہ	ملک کی مجموعی آمدنی (کروڑ روپوں میں)	فی کس آمدنی (روپوں میں)	سنہ ۱۹۱۱ء کی قیمتوں کے لحاظ سے فی کس قومی آمدنی
سنہ ۱۹۱۱ء	۱۹۴۲	۸۰	۸۰
سنہ ۳۰-۱۹۲۹ء	۲۹۰۰	۱۰۹	۸۹
سنہ ۳۱-۱۹۳۰ء	۲۲۵۰	۸۴	۸۱
سنہ ۳۲-۱۹۳۱ء	۱۷۰۰	۶۳	۷۲
سنہ ۳۳-۱۹۳۲ء	۱۶۰۰	۵۸	۶۷
سنہ ۳۴-۱۹۳۳ء	۱۶۰۰	۵۸	۷۳
سنہ ۳۵-۱۹۳۴ء	۱۶۰۰	۵۸	۷۴
سنہ ۳۶-۱۹۳۵ء	۱۷۰۰	۶۳	۷۸

اگر ان اعداد کو پیش نظر رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۹۲۹ء سے سنہ ۱۹۳۶ء تک ہندوستان کی قومی آمدنی کا اوسط ۷۰ روپے کے قریب رہا ہے اور سنہ ۱۹۱۱ء کی قیمتوں کے لحاظ سے ۷۶ روپے کا اوسط آتا ہے۔

ہندوستان کی قومی آمدنی کے سالانہ اوسط کی کمی کا اس وقت تک صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا تا وقتیکہ دیگر ممالک کے مقابلہ اعداد پیش نظر نہ رکھے جائیں۔ چنانچہ مسٹر شیراز نے سنہ ۳۶-۱۹۳۵ء کے بعض دیگر ممالک کے اوسط آمدنی کے اعداد بتائے ہیں جو صفحہ آئندہ پر درج ہیں[۵۲]۔

---

[۵۱] "ٹائمس آف انڈیا" مورخہ ۲۸ اکتوبر سنہ ۱۹۳۸ء

[۵۲] "ٹائمس آف انڈیا" مورخہ ۲۸ اکتوبر سنہ ۱۹۳۸ء

نام ملک	فی کس قومی آمدنی کا اوسط روپوں میں
ریاست ہائے متحدہ امریکہ	۱۱۸۴
برطانیہ عظمیٰ	۱۰۱۰
فرانس	۵۴۵
جرمنی	۵۱۹
اطالیہ	۳۱۹
جاپان	۱۸۶
بلگریا	۱۲۰
ہندوستان	۶۳

ہندوستان کے مختلف مقامات پر بعض بعض دیہات میں دیہات کی مجموعی دیہی آمدنی معلوم کرکے فی کس آمدنی کا اوسط بھی لگایا گیا ہے ۔ اور تعجب ہوتا ہے کہ اس طرح آمدنی کے اوسط میں اور تخفیف ہو جاتی ہے مثلاً ۱۹۱۷ء میں ڈاکٹر مین نے پمپلا سو داگر (بمبئی) میں آمدنی کا اوسط ۴۴ روپیہ سال بتایا ہے ۔ میجر جیک نے ۱۹۱۰-۱۱ء کے درمیان ضلع فریدپور (بنگال) میں تحقیقات کی تو اوسط ۵۲ روپے فی کس آیا ۔ مسٹر مختیار نے گجرات کے ایک گاؤں کی آمدنی کا اندازہ ۷۰ روپے فی کس بتایا ہے اس سلسلے میں ہم نے بھی حیدرآباد کے ایک جاگیری موضع کی مجموعی اور فی کس آمدنی معلوم کرنے کی کوشش کی ہے[ف]۔

موضع دودیال (جہاں یہ کام کیا گیا ہے) تعلقہ کوڑنگل ضلع گلبرگہ میں شہر حیدرآباد سے بہ جانب جنوب و مغرب تقریباً ۶۷ میل کے فاصلے پر تانڈور کوسگی سڑک پر واقع ہے ۔ ۴۷ف میں گاؤں کی آبادی ۲۵۶۲ تھی اور رقبہ ۶۶۱۶¼ ایکڑ تھا جس میں مزروعہ رقبہ ۵۴۳۱ ایکڑ تھا ۔ موضع میں ۵۶ر۵۵ فی صد ہندو ، ۲۷ر۳۳ پست اقوام اور اقوام قدیمہ اور ۱۵ر۳ فی صد مسلمان آباد ہیں ۔ موضع کا خاص پیشہ زراعت ہے ، چنانچہ کام کرنے والی آبادی کا ۲ر۷۴ فی صد زراعت سے بالواسطہ

ف ممالک محروسہ سرکار عالی میں اب تک قومی آمدنی کے متعلق کوئی کام نہیں ہوا ہے ۔ چنانچہ راقم الحروف آج کل اس کام میں مصروف ہے اور اگر حالات نے ساتھ دیا تو امید ہے کہ مارچ ۳۹ء تک کام ختم ہو جائے گا ۔

یا بلاواسطہ آمدنی حاصل کرلیے آبادی کا ۶٫۷ فی صد حصہ بافندگی یا تاگہ صاف کرنے اور رنگنے میں مشغول ہے اور بقیہ حصہ تجارت، ملازمت، چرواہی وگلہ بانی، ساہوکاری اور آزاد پیشوں سے آمدنی حاصل کرتا ہے۔

قومی آمدنی کا حساب لگانے کے لیے ۱۳۴۵ف (۳۷-۱۹۳۶ء) کا سال لیا گیا ہے۔ گو ہر چیز کے صحیح اعداد ہمارے پاس موجود نہیں ہیں تاہم گاؤں کی زرعی اور صنعتی پیداواروں اور دوسری چیزوں کے قریب ترین اندازے جو معلوم ہوسکے ان میں سے سال رواں کی قیمتوں پر حساب لگایا گیا ہے۔ نیز حساب مقامی قیمتوں سے لگایا گیا ہے اور زرعی پیداوار کی مجموعی قیمت میں سے تخم کی قیمت منہا کردی گئی ہے۔ ذرائع آمدنی کو چار بڑی مدات میں زرعی پیداوار، دیگر ذرائع صنعتی پیداواروں و کار وبار اور متفرقات میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلی مد میں مختلف قسم کی زرعی اجناس مثلاً دھان معمولی و اعلیٰ، مونگ پھلی، مرچ، کلتھی، جوار، راگی، ساوان، تل، لنگی، ارہر، مونگ، دوسری متفرق پیداوار ہیں، ترکاریاں اور مختلف فصلوں کا گھاس یا جوار کی کرٹرھی کو شامل کیا گیا ہے۔

زرعی اجناس و چارہ

جملہ قیمت زرعی و اجناس وغیرہ	۴۹،۸۲۰
منہائی قیمت تخم	۱،۹۲۰
	۴۷،۹۰۰
مختلف قسم کا چارہ	۵،۴۶۵
زرعی شعبے کی جملہ آمدنی	۵۳،۳۶۵

جاگیر کے دیگر ذرائع آمدنی میں سیندھی و شراب کے علاوہ مختلف کارآمد درختوں، پھلوں، اور گھاس کی قیمت شامل کی گئی ہے، جن کا ہر سال نیلام کیا جاتا ہے۔ آموں سے ہر سال تقریباً ۲ ہزار روپیے اور مچھلی سے سالانہ ۲۰۰ روپیے کے قریب آمدنی ہوتی ہے۔ مگر سال رواں میں موضع میں آم بالکل نہیں ہوا نیز خشک مچھلی کی بھی قلت رہی اس لئے دونوں مدات کی آمدنی کو اس میں شامل نہ کیا جا سکا۔ یہاں شریفہ بھی بہ کثرت ہوتا ہے مگر اس کو نیلام نہیں کیا جاتا اس لئے اس کی قیمت کو بھی شامل نہیں کیا گیا۔ ۱۳۴۵ف میں جاگیر کے دوسرے مختلف ذرائع کی آمدنی کا اندازہ ۵۵،۷ روپیہ کے قریب کیا گیا ہے۔

صنعتی اور ضمنی پیداواروں میں تیار شدہ پارچہ، طلائی و نقرئی زیورات، کمہاروں کے برتن، دہیڑوں اور دوسرے صناعوں کی مصنوعات کی قیمتیں، بڑھئی، لوہار، درزی، قصاب، رنگ ریز، کے معاوضے، کرایے پر گاڑیاں چلانے والوں کی اُجرت، مرغیوں، انڈوں، اون، چمڑے، دودھ، گھی اور رسیوں کی قیمت۔ بیڑی سازی، آٹا پیسنے، دھان کوٹنے کی اُجرت اور گاؤں کے سال رواں میں نئے پیدا شدہ مویشیوں کی قیمت کو شامل کیا گیا ہے جن کی مجموعی آمدنی ۴۳،۵۱۷ روپے ہوتی ہے۔

متفرقات میں بھگیلوں کی اُجرت، ملازمین جاگیر کی تنخواہیں، ساہوکاروں کا سود، تاجروں کے منافع، زرعی اور غیر زرعی مزدوروں کی اجرتیں، خانگی ملازمتوں کے معاوضے، وظیفہ خواروں کے وظائف وغیرہ کو شامل کیا گیا ہے، اور اس طرح اس مد سے ۴۱،۴۸۷ روپے آمدنی ہوتی ہے۔

اس طرح موضع کی مجموعی آمدنی حسب ذیل رہی۔

	مجموعی آمدنی	کل آمدنی کا فی صد
(۱) زرعی اجناس و چارہ	۵۳،۳۶۵ روپے	۳۷ فی صد
(۲) جاگیر کے دیگر ذرائع آمدنی	۷،۵۵۷ "	۵ "
(۳) صنعتی اور ضمنی کاروبار	۴۳،۵۱۷ "	۳۰ "
(۴) متفرقات	۴۱،۴۸۷ "	۲۸ "
جملہ	۱،۴۵،۹۲۶ "	

اگر اس آمدنی کو ۲۶۵۲ افراد پر تقسیم کیا جائے تو فی کس آمدنی کا اوسط ۵۵-۰-۴¾ سالانہ آتا ہے۔ یا ایک شخص کو ۲ ر ۴ پائی یومیہ ملتے ہیں۔ ہم نے گاؤں کے اخراجات کا اندازہ بھی لگایا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص کا سالانہ خرچ جن میں شادیوں اور رسومات کے اخراجات شامل ہیں ۵۲ روپے سال ہوتا ہے: نیز اس کے ساتھ ہی ایک زرعی خاندان کی آمدنی میں ضروریات کا اندازہ بھی لگایا گیا ہے، تو معلوم ہوا کہ ایک شخص کو ایک سال میں کم از کم ۷۸-۶-۴ کی ضرورت ہوتی ہے۔ گویا اس کی موجودہ آمدنی اس آمدنی سے ۲۳-۶-۰ کے قریب کم ہے۔

حالات اور زیادہ مایوس کن نظر آتے ہیں جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قلیل آمدنی بھی غیر مساوی پر تقسیم ہو رہی ہے

یعنی آبادی کا قلیل حصہ آمدنی کے بڑے حصے پر قابض ہے۔ اس طرح سالانہ اوسط اور گھٹ جاتا ہے۔ اس غیر مساوی تقسیم کا اندازہ ذیل کی جدول سے ہو سکتا ہے۔

طبقہ	آمدنی	متعلقہ افراد کی تعداد	آبادی فی صد	آمدنی کا فی صد
ساہوکار	۷۲۰۰	۱۷	٫۲	۵٫۰
تجار	۸۲۸۰	۲۸	۱٫۲	۵٫۵
جاگیردار	۱۵۰۹۸	۴۳	۱٫۶	۱۰٫۰
سنار، لوہار، بڑھئی اور درزی	۶۴۰۰	۷۸	۲٫۹	۴٫۹

گویا ۶ فی صد آبادی ۲۵ فی صد آمدنی کا مالک ہے۔ اور ۹۴ فی صد کے پاس بقیہ ۷۵ فی صد آمدنی رہتی ہے اس لحاظ سے ۷۵ فی صد آبادی کا اوسط آمدنی ۱۰-۳۴ کے قریب آتا ہے۔ مگر اس تعداد میں بھی زرعی و غیر زرعی مزدور خانگی اور جاگیری ملازم، وظیفہ خوار، اور نصف سے زائد بھکیلے جن سب کی مجموعی تعداد ۵۵۸ ہے اور جو کل آبادی کا ۲۱ فی صد حصہ ہیں ایسے ہیں جن کی سالانہ آمدنی کا اوسط صرف ۸-۲۸ سالانہ یا ایک آنہ ۳ پائی روزانہ ہے۔

فی کس آمدنی کے اوسط کے کم ہونے کی وجہ سے گاؤں والوں کا معیار زندگی ادنیٰ ہوتا ہے، وہ سال کے بڑے حصے میں ایسی غذائیں کھاتے ہیں جن میں غذائیت بہت کم ہوتی ہے۔ ان کی عام غذا کلتھی، راگی، ساوان، کھنگی، برٹی یا جوار جیسے معمولی غلے ہیں۔ دالوں، ترکاریوں اور تیل کا استعمال بہت کم ہے، گھی، دودھ، انڈے، مچھلی اور گوشت جن میں توانائی بخش اجزا زیادہ ہوتے ہیں ان کو بہ مشکل میسر آتی ہیں۔ وہ ادنیٰ اور معمولی غذائیں اس لئے نہیں کھاتے کہ وہ اچھی اور اعلیٰ قسم کی غذائیں کھانا نہیں جانتے، ان کے دل میں بھی یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ وہ بھی مرغن غذائیں کھائیں مگر وہ مجبور ہیں اور ان کا افلاس ان کو معمولی غذاؤں پر قناعت کرنے پر مجبور کرتا ہے، حکومت ہند نے ہندوستان کے حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ایک شخص کے لئے جو اقل ترین غذا مقرر کی ہے اس میں حسب ذیل چیزیں شامل ہیں۔

چاول	۱۰ اونس یومیہ
دوسرے غلے	۵ ″
دالیں	۳ ″

بغیر پتوں والی ترکاریاں	۶	اونس یومیہ
پتّوں والی ترکاریاں	۴	〃
دودھ	۸	〃
تیل	۲	〃
پھل	۲	〃

یہ اقل ترین غذا اس لحاظ سے مقرر کی گئی ہے کہ اس میں وہ تمام اجزا حیاتین، جوہر اور چربی وغیرہ آجائے جو ایک معمولی انسان کی جان داری اور طاقت کو بحال رکھنے کے لئے کافی ہو، اس معینہ غذا کی قیمت اگر کم سے کم قیمتوں پر لگائی جائے تو ۶-۱۰-۵ ماہانہ ہوتی ہے، جس میں نمک مرچ، مصالحوں اور ایندھن کے ۲-۹-۱ جوڑنا ضروری ہے اس لحاظ سے ایک شخص کو صرف غذا کے لئے -۰-۷ ماہانہ یا -۱۲-۸۴ روپے سالانہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں لباس، مکان کا کرایہ، ہزاروں اور تفریحات اور دوسری ضروریات کے اخراجات شامل نہیں ہیں۔

آمدنی کی کمی کی وجہ سے اس کی غذا معمولی اور ادنیٰ ہوتی ہے۔ اس کا لباس ایسا ہوتا ہے جو اس کو سردی و گرمی سے محفوظ نہیں رکھ سکتا، اس کے مکانات تاریک اور گندہ ہوتے ہیں، جن میں ایک جانب وہ مویشی باندھتا ہے اور دوسری جانب خود بھی مویشی بن کر زندگی گذارتا ہے۔ اس کا افلاس اس کو اجازت نہیں دیتا کہ اپنے بچوں کو تعلیم دلائے بیماریوں میں اپنا یا اپنے بیوی بچوں کا معقول علاج کرائے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معمولی معمولی بیماریاں ہی وباؤں کی صورت میں نمودار ہوتی ہیں، سینکڑوں کو ختم کردیتی ہیں اور ہزاروں کو عمر بھر کے لئے اپاہج، معذور اور غیر کارکرد بنادیتی ہیں افلاس کا اثر اخلاق اور کردار پر بھی پڑتا ہے۔ بھوکے اور ننگے ملک میں اکثر جرائم محض افلاس کی بدولت وجود میں آتے ہیں اگر جرائم کا تفصیلی طور پر تجزیہ کیا جائے تو بڑی تعداد ان افراد کی ملے گی جنھوں نے فاقوں سے تنگ آکر یا بیروزگاری سے بےزار ہو کر جرموں کا ارتکاب کیا ہے۔ افلاس انسانی کردار کو اس قدر خراب کردیتا ہے کہ وہ ان برائیوں کو بھی برداشت کرتا ہے جن کا بظاہر غربت سے کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا۔ مثلاً وہ غلاظت اور گندگی میں زندگی گذارتا ہے، لباس، مکان اور کھانے پینے کی اشیا میں صفائی و عدم صفائی کا بالکل خیال نہیں کرتا، اپنی غربت کی تکلیفوں کو بھلانے اور اپنے غم کو عارضی طور پر غلط کرنے کے لئے مختلف قسم کی منشیات مثلاً شراب، سیندھی، افیون، گانجہ اور بھنگ

کا استعمال شروع کردیتا ہے جو اس کی تباہیوں میں مزید اضافہ کردیتی ہیں۔ جب مستقبل تاریک ہوتا ہے تو لوگ مستقبل سے بالکل بے نیاز ہوجاتے ہیں۔ اور اس کا لازمی نتیجہ اضافہ آبادی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ جہاں ایک بچہ ایک لنگوٹی کے ساتھ پھر سکتا ہے؛ اور سوکھے ٹکڑے کھاکر زندہ رہ سکتا ہے وہاں چار بچے بھی اس حالت سے زندگی گذار سکتے ہیں۔ انفرادی نقطۂ نظر سے یہ خیال کہ افراد خاندان کی تعداد میں اضافہ سے خاندان کی مجموعی آمدنی میں اضافہ کرے گا صحیح ہوسکتا ہے مگر ملک کی عام خوش حالی پر ایسی کمزور، منحنی اور غیر جاندار نسلوں کا برا اثر پڑتا ہے۔ ایسا ملک کیا ترقی کرسکتا ہے جہاں ایسے افراد کی تعداد بہت زیادہ ہو جن کو ایک وقت بھی پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہ ہوتا ہو، یا جو سال کے بڑے حصے میں یا مسلسل بے روزگاری میں زندگی بسر کرتے ہوں، جب حالات شدید ہوجاتے ہیں تو اصلاح معاشرت و معیشت میں ایسی دشواریاں پیدا ہوجاتی ہیں کہ ملک کے اچھے اچھے دماغ بھی ان کو آسانی سے سلجھا نہیں سکتے۔

محمد احمد سبزواری بی۔ اے (عثمانیہ)

رُباعیات

ہوتا ہے میرا شمار مے خواروں میں مشہور ہوں رندوں میں قدح خواروں میں
ایک گوشہ مے سنبھالے ہوں میں جاتا نہیں سرکاروں میں درباروں میں

کیا خوب کہ اس عمر میں توبہ کیجئے از بادۂ تلخ کے خواہم کرد
صاحب پیری میں شغل بادہ کیجئے یا موے سپید قصد مے خواہم کرد
پیمانۂ عمر ہے تہی ہونے کو پیمانۂ عمر من بہ ہفتاد رسید
اب بھی جو نہ پیجئے تو پھر کیا کیجئے اکنوں نہ کنم نشاط کے خواہم کرد

کیا شیخ کی سنتا ہے اِدھر آ پی لے
دو دن تو ملے ہیں زندگی کے جی لے
بجھنے کو ہے یہ شرر کسی لمحے میں
دو گھونٹ سہی دوا سمجھ کر پی لے

پڑتا ہے مرا قدم قدم کے آگے
جاتا ہوں میں حیطۂ عدم کے آگے
ہوتا نہیں واں شیخ و برہمن کا گزر
منزل ہے مری دیر و حرم کے آگے

یہ منصب و جاہ پر اکڑنے والے
یہ نشۂ سیم و زر میں سڑنے والے
سن لیں کہ بہ بانگِ دہل کہتا ہے فلک
اک روز یہ ہیں زمیں میں گڑنے والے

سکینہ

موجودہ حکومتیں اور اُن کی خامیاں

فراست انسانی نے میدان سیاست میں بھی ایجاد و اختراع کے اتنے ہی جوہر دکھلائے ہیں جو زندگی کے کسی اور میدان میں دکھلائے گئے ہوں۔ تاریخ عالم کے ہر دور میں جب کہ انسان نے تہذیب و تمدن کی تعمیر کی ہے فن حکمرانی کی ترقی و ارتقار کے مسائل ہمیشہ اُس کے پیش نظر رہے ہیں۔ زمانے کی تبدیلی اور ذہنیت کے انقلاب کے ساتھ ساتھ حکومت کی باگ ڈور قوی ہیکل انسانوں، قبیلے کے سرداروں، مطلق العنان بادشاہوں، طاقت ور امرا، قابل آمرین جمہوری نمائندوں اور رفتہ رفتہ ذمہ دار منتخبہ اداروں کے ہاتھ آتی اور جاتی رہی ہے۔

قدما میں سب سے پہلے یونانیوں نے شخصی مطلق العنانی کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور دنیا کو ایک نئے اور بہتر طرز حکومت سے روشناس کرایا جس کو جمہوریت کہتے ہیں لیکن رومیوں نے بہت جلد جمہوریت کے اس پورے نظام کو درہم کر دیا جو ابھی ارتقائی منازل طے کر رہا تھا اور پھر سے مطلق العنانی کو آمریت و شہنشاہیت کے نئے رنگ روپ میں پیش کیا۔ رومیوں کے زوال پر طوائف الملوکی اور جاگیرداری نظام (Feudalism) نے دنیا میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ تاریخ ضرور اپنے آپ کو دُہراتی ہے۔ اسلام کے ظہور نے مسلمانوں کو ایک قسم کی جمہوریت سے متعارف کیا جو بڑی حد تک کامیاب ثابت ہوئی لیکن رفتہ رفتہ خلفا، کی ہوس دولت و حب جاہ اور حکام کے جذبہ رشک و حسد نے بہت جلد اس جمہوری نظام کو بھی بادشاہوں

اور موروثی وزرار کی شخصی مطلق العنانی کا شکار بنا دیا۔ یہ سب کچھ ہوا لیکن اسلام نے حریت، آزادی اور مساوات کے جو سبق پڑھائے تھے وہ بالکل بے کار ثابت نہ ہوئے بلکہ اسپین، سسلی اور اناطولیہ کی اسلامی جامعات کے غیر مسلم یوروپی طلبا نے اپنے اپنے ملکوں کو واپس ہونے کے بعد وہاں ایک نئی تحریک کی داغ بیل ڈالی۔ نشاۃ ثانیہ (Renaissance) یورپ کے صدیوں سے بگڑے ہوئے نظام حکومت میں کئی نئے اور ترقی پسند عناصر شامل کرنے کا باعث ہوا اور ہر جہتی ترقی کے آثار نمودار ہونے لگے۔

نشاۃ ثانیہ میں عمومیت کا سب سے بڑا علم بردار روسیو (Rousseau) پیدا ہوا جس کے دل و دماغ پر سقراط اور افلاطون کے نظریات حکمرانی اور پھر مسلمانوں کی عالمگیر برادری، مساوات اور رواداری کی عملی نظیر کا بہت گہرا اثر مرتب ہوا۔ اُس نے قدیم یونانی تخیلات جمہوریت کی تصحیح و ترمیم کر کے اُن کی تعلیم و ترویج کے لئے اپنے ہم وطنوں کی ذہنیت کو تبدیل کرنے کا بیڑا اٹھایا بہت جلد اس کی کاوشیں رنگ لائیں اور انقلاب فرانس نے وہاں مطلق العنانی کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ ہمسایہ حکومتوں پر اس کا بالواسطہ یا بلا واسطہ اثر پڑے بغیر نہ رہ سکا اور رفتہ رفتہ یورپ میں تقریباً ہر جگہ عمومیت اور عوام کی آزادی کے گیت گائے جانے لگے۔ جمہوریت کا نصب العین "حریت، مساوات اور اخوت" (liberty, equality and fraternity) قرار پایا اور بنی نوع انسان کو ایک خوش آیند مستقبل نظر آنے لگا۔ اس وقت ہر شخص یہ اُمید باندھ رہا تھا کہ صدیوں مسلسل مصائب جھیلنے اور تجربات کی کٹھن منازل طے کرنے کے بعد بالآخر انسان کے ہاتھ طرزِ حکمرانی کا ایک ایسا نادر نسخہ آیا ہے جو بہترین نتائج کا حامل اور قدیم حکومتوں کے معائب و نقائص سے پاک ہے۔ ہر کس و ناکس نے ایک اطمینان کا سانس لیا کہ اب دنیا سیاسی انقلابوں کی آماجگاہ نہ رہے گی اور مملکت کی سخت گیری اور ظلم و ستم کا خاتمہ ہو جائے گا کیوں کہ عمومیت کا بنیادی اصول یہ قرار پایا کہ "مملکت فرد کے لئے ہے نہ کہ فرد مملکت کے لئے" "The state is for the individual and not the individual for the state."

فرانس کے برخلاف انگلستان میں عمومیت انقلاب کی بجائے ارتقا کے مراحل طے کرتی ہوئی نمودار ہوئی لیکن ماضی کے نقوش بہر حال باقی رہے اور مکمل عمومیت کہیں بھی قایم نہ ہو سکی۔ کیوں کہ مرور زمانے کے ساتھ ساتھ نت نئی خامیاں منظر عام پر آنے لگیں جو ابتدا میں نظر سے اوجھل تھیں۔ اور بہت جلد یہ امر دنیا پر واضح ہو گیا کہ عمومیت کے زیر سایہ بھی ایسے جور و ظلم پرورش

پا سکتے ہیں ہر شخص حکمرانوں کے شان وگمان میں نہ آتے ہوں۔ سیاسی گروہ بندی مختلف جماعتوں کے لیڈروں کا بغض وحسد اقتدار کے قیام کے لئے نا جائز طریقہ کار کا استعمال، حکومت وقت کی بے عزتی، علمی اور سیاسی مباحث میں تعصب، ہٹ دھرمی شخصیتوں پر بیجا حملے، کاروبار مملکت میں تساہل اور تعویق، عوام کے نمایندوں کی طوطا چشمی و نا اہلی، قابل ترین افراد کی کس مپرسی، حق رائے دہی کی خرید و فروخت، مملکت کی پالیسی کا تزلزل اور سب سے بڑھ کر قوم کے قوائے عمل کا انتشار، یہ اور اس نوع کی صدہا خامیاں ایسی نکل آئیں کہ عمومیت کے متعلق مفکرین کی بہت سی اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔

لیکن اٹھارویں صدی کے اختتام اور انیسویں صدی کی ابتداء میں دو من چلے مفکرین نے نہایت بے باکی کے ساتھ اپنے وقت کی نام نہاد عمومیتوں کا پردہ چاک کیا۔ دنیا کارل مارکس (Karl Marx) اور اینگل (Engel) سے بخوبی واقف ہے جنھوں نے فرسودہ عمومیت کے زیر سایہ پرورش پانے والے غیر معمولی اداروں کی بیخ کنی کی تلقین کی اور ایک "کامل عمومیت" کا خاکہ پیش کیا جس میں نہ صرف سیاسی بلکہ معاشی، مذہبی، نسلی اور ذہنی ہر قسم کی مساوات کو حقیقی عمومیت کی بنیادی شرط قرار دیا تقریباً ایک صدی بعد تخیل کی اس بلند پروازی کو عمل و امکان کی کسوٹی پر کسنے کے مواقع فراہم ہوئے جب کہ زاران روس کا ظلم وستم اپنی انتہا کو پہنچ کر ۱۹۱۷ء کے خطرناک ردعمل کا باعث ہوا۔ لینن کے اشتراکیت (Socialism) اور اشتمالیت (Communism) جیسی انتہائی عمومی اشکال سے دنیا کو روشناس کرایا۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس خاص عمومیت کو روبہ عمل لانے کے لئے بھی آمریت کے فولادی ہاتھ استعمال کئے گئے۔ ایک انتہا کا علاج دوسری انتہا سے کیا گیا۔ یہ صورت اس لئے پیدا ہوئی کہ اعتدال پسند سیاست داں اشتمالیت کو کسی طرح بھی تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھے وہ اس کو "دیوانی عمومیت" کے نام سے یاد کیا کرتے تھے ان کا خیال تھا کہ "Communism is a democracy gone mad"

عمومیت کی اصولی خامیوں اور عملی دقتوں کو سمجھنے کے لئے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ایک اُڑتی ہوئی نظر سے اس کے دستور کا مطالعہ کیا جائے مقننین نے ہر حکومت کے اقتدار اعلیٰ کی تقسیم دو اجزاء میں کی ہے۔ ایک سیاسی اقتدار اعلیٰ اور دوسرے قانونی اقتدار اعلیٰ ——— سیاسی اقتدار اعلیٰ کا منبع عوام ہوا کرتے ہیں جو صحیح معنوں میں کسی مملکت کی قوت کا مخرج ہوتے ہیں۔ انہی کی وجہ سے مملکت کا عدم یا وجود ہوتا ہے اس کے برعکس قانونی اقتدار اعلیٰ اُس شخص یا جماعت کو حاصل ہوتا ہے جس کے ہاتھ ملک کی عنان حکومت ہوتی ہے مطلق العنان شخصی اور موروثی حکومتوں میں چوں کہ عوام الناس کو حکومت

کرنے کے بہت کم مواقع ملتے ہیں اس لئے سیاسی اقتدار اعلیٰ پر قانونی اقتدار اعلیٰ ہمیشہ غالب رہتا ہے۔ اور ان دونوں میں ایک قسم کی چپقلش رہتی ہے لیکن عمومیت کا دستوری فریضہ یہ ہے کہ حکومت اور عوام الناس یعنی قانونی مقتدر اعلیٰ اور سیاسی مقتدر اعلیٰ میں زیادہ سے زیادہ ہم آہنگی پیدا کرے۔ اسی بنا پر مشہور امریکی محب وطن لنکن (Lincoln) نے عمومیت کی تعریف یوں کی تھی کہ عوام کی ایسی حکومت جو عوام کے مفاد کے لئے عوام ہی کے ذریعے کی جاتی ہے۔

"Democracy is a Government of the people, by the people and for the people"

نظراً یہ تعریف چاہے کتنی ہی معقول و مناسب ہو عملاً اس میں ترمیم کرنی پڑتی ہے۔ کسی حکومت کے لئے یہ تو ممکن ہے کہ وہ اپنے عوام کی فلاح و بہبود کو اپنا اولین فرض سمجھے لیکن حکومت کے تمام کاروبار کو عوام کے سپرد کر دینا اور اُن ہی کے ذریعے چلانا ناممکن ہے۔ کیوں کہ کاروبار مملکت چاہے کتنے ہی وسیع ہوں افراد مملکت کی صرف ایک محدود تعداد ہی ان کو بہ خوبی چلانے کے لئے کافی ہے۔ البتہ اس امر کا انتظام ممکن ہے کہ حکومت میں برسر اقتدار آنے والی یہ محدود تعداد عوام کی تائید حاصل کرے اور ان کی نمائندہ ہو۔ ایسی حکومت بلاواسطہ نہیں بلکہ بالواسطہ عوام کی حکومت کہلائے گی لیکن طریق نمائندگی بذات خود ایک حل طلب مسئلہ ہو کر رہ گیا ہے اور مفکرین کی تمام کاوشوں کے باوجود اس کے نقائص اور معائب دور نہیں کئے جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل ہر عمومیت اپنا ایک جداگانہ دستور رکھتی ہے اور اکثر صورتوں میں ان دساتیر کی تدوین کے وقت عمومیت کے بنیادی اصولوں کو بھی قربان کر دیا گیا ہے۔

عموماً عوام کے چند نمائندے رائے شماری کے ذریعے ملک کے ہر حصے سے ایک معین مدت کے لئے منتخب کئے جاتے ہیں۔ اور حکومت کی باگ ڈور انہی کے سپرد کی جاتی ہے۔ ساتھ ہی چند مناسب شرائط کی پابندی ان پر لازم رکھی جاتی ہے تاکہ وہ بے اختیار نہ ہو جائیں۔ بعض عمومیتوں کا دستور اس نوع کا ہوتا ہے کہ ان نمائندوں کو ہر وقت بالواسطہ یا بلاواسطہ اپنے انتخاب کنندوں کے سامنے جواب دہ ہونا پڑتا ہے اور بعض دساتیر کی رو سے ایک معین مدت تک منتخب شدہ نمائندے بالکل آزاد اور بلا باز پرس رہتے ہیں نمائندوں کی ذمہ داری سمجھنے کے لئے ہمیں حکومت کی ہیئت پر غور کرنا چاہئے۔

ہر حکومت کے تین اہم اور ضروری شعبے ہوتے ہیں (۱) مقننہ (Legislative) (۲) عاملہ (Executive) (۳) عدلیہ (Judicial) یہ تینوں لازم و ملزوم ہیں۔ مقننہ اس بات کی مقتدر ہوتی ہے کہ

ملک کے لئے جس قسم کا چاہے قانون بنائے۔ عاملہ کا فرض ان قوانین کو نافذ کرنا اور ان کی تعمیل کروانا ہے۔ عدلیہ کے ذمے قانون ملک کے خلاف ورزی کرنے والوں کے لئے سزائیں تجویز کرنا اور انصاف رسانی کے سامان مہیا کرنا ہے۔ شخصی مطلق العنانی اس وقت پیدا ہو جاتی ہے جب کہ بادشاہ یا آمران تینوں جدا جدا حکومتی شعبوں کو اپنی واحد ذات میں ضم کر لیتا ہے وہی قانون بناتا ہے۔ وہی اس کو چلاتا ہے اور پھر وہی قانون شکنوں کو سزائیں دیتا ہے۔ اس کے برعکس عمومیت میں یہ امر سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ ان تینوں میں سے ہر ایک اپنے تئیں خود مختار شعبہ رہے اور دوسرے کے اثر سے پاک ہو لیکن ممالک متحدہ امریکہ کے دستور کے سوا آج کل تمام دیگر عمومیتوں کے دساتیر مقننہ اور عاملہ کو ایک دوسرے سے وابستہ کر دیتے ہیں یعنی مقننہ کے اراکین میں سے چند ارکان کے سپرد عاملہ کا شعبہ کر دیا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عاملہ، مقننہ پر اپنا دباؤ ڈال کر من مانے قوانین بناتی رہتی ہے۔ اس لئے عمومیت میں یہ امر بھی ضروری ہے کہ مقننہ یعنی قانون ساز ادارہ عوام الناس کے زیادہ سے زیادہ نمائندوں پر مشتمل ہو۔ ایسے نمائندے جو ملک کے مختلف طبقوں کی صحیح نمائندگی کریں اور اُن کے مفاد کی خاطر قوانین بنائیں۔ جو عاملہ مقننہ کے اراکین میں سے منتخب کی جاتی ہے وہ عموماً مقننہ کے سامنے جواب دہ ہوتی ہے۔ اور چوں کہ خود مقننہ کو عوام کا اعتماد حاصل ہوتا ہے اس لئے بالواسطہ عوام ہی کے سامنے عاملہ جواب دہ متصور ہوتی ہے اس قسم کی عاملہ کو ذمے دار عاملہ کہا جاتا ہے اور اس نوع کے نظام حکومت کو پارلمانی نظام (Parliamentary System) کہا جاتا ہے۔ امریکہ میں چوں کہ عاملہ اور مقننہ کو ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ رکھا گیا ہے۔ اس لئے وہاں صدر جمہوریہ اس بات کا پابند نہیں کہ وہ کانگریس (جمہوریہ مقننہ) کے سامنے جواب دہ ہو۔ اور نہ وہ خود دستور کے رُو سے اس بات کا مجاز ہے کہ مقننہ پر اثر ڈال کر کسی خاص قانون کو وضع یا منسوخ کروائے اس طرز حکومت کو صدارتی حکومت (Presidential Govt.) کہا جاتا ہے۔ عملاً صدارتی حکومتوں میں بھی عاملہ اپنا مقننہ اثر ڈالتی ہے۔ کیوں کہ عموماً جس جماعت کا اُمیدوار صدر منتخب ہوتا ہے۔ اسی جماعت کو مقننہ میں بھی اکثریت حاصل ہوتی ہے اور اس طرح بالواسطہ عاملہ اور مقننہ ایک دوسرے کے اثر و نفوذ میں رہتے ہیں عدلیہ کی حد تک ہر عمومیت ضرور یہ کوشش کرتی ہے کہ اس شعبے کو مقننہ و عاملہ کے اثر سے پاک رکھے۔ میقات بندی عمومیت کی پہلی خصوصیت ہے۔ کیوں کہ یہ ذمے دارانہ حکومت کی بنیادی شرط ہے۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ ارباب حکومت چوں کہ ایک مقررہ میقات کے لئے منتخب کئے جاتے ہیں اس لئے وہ نہایت ایمان داری اور تن دہی سے کام کرتے ہیں تاکہ اپنے انتخاب کنندوں کا اعتماد قائم رکھ سکیں اس کے علاوہ دستور

میں چند ایسے تحفظات بھی رکھے جاتے ہیں جن کی بنا پر کم ازکم ایسی عاملہ کو جو کہ مقننہ کے پاس جواب دہ ہوتی ہے اپنا اعتماد کھوتے ہی مستعفی ہو جانا پڑتا ہے۔ ورنہ ان تحفظات کی مدد سے حکومت کے کاروبار معطل کر دیے جاتے ہیں۔ اور وہ عاملہ جو مقننہ کے سامنے جواب دہ نہیں ہوتی اس کو بھی یہ ڈر ضرور لگا رہتا ہے کہ اگر عوام اُس سے بدظن ہو جائیں تو ختم میعاد پر اس کو دوبارہ منتخب نہیں کریں گے اور یہ کہ یہی ڈر وہ حربہ ہے جو بڑی حد تک عمومیتوں میں آمریت کی پیدائش کو روکنے کا باعث ہے لیکن ساتھ ہی ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ میعات بندی کا ایک اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عاملہ کے اراکین مستقل کام کرنے کی بجائے نام و نمود کی خاطر عارضی کام کرتے ہیں اور ان کو اپنے مفوضہ کام سے دلچسپی پیدا نہیں ہوتی اس کے علاوہ عہدہ داروں کے اس تغیر و تبدل سے انتظامی دقتیں بڑھتی جاتی ہیں اس لیے ہم آج دیکھ رہے ہیں کہ ہر عمومیت میں عاملہ کے صدر اور اس کی کابینہ کے سوا باقی تمام اراکین حکومت اور عملہ مستقل نوعیت کا ہوتا ہے یہاں "عوام کے ذریعے حکومت" کا دعویٰ بے بنیاد ہو جاتا ہے۔ بعض عمومیتیں تو اپنا صدر بھی مستقل یعنی موروثی رکھتی ہیں گو کہ ایسے موروثی صدر کو شاہ شطرنج سے زیادہ اہمیت نہیں ہوتی۔ ایسے شاہ کو دستوری بادشاہ (Constitutional King) کہا جاتا ہے اور جس عمومیت میں دستوری بادشاہ نہیں ہوتا بلکہ عوام ہی سے صدر حکومت منتخب کیا جاتا ہے اس کو جمہوریت (Republic) کہتے ہیں۔ اس طرح عمومیت اور جمہوریت میں صرف دستوری بادشاہ کا فرق ہوتا ہے عمومیت - دستوری بادشاہ = جمہوریت (Democracy - C. King = Republic) مستقل نوعیت کے اعتبار سے عدلیہ کا شعبہ بالکل غیر عمومی ادارہ ہوتا ہے۔ مقننہ اور عاملہ میں کم ازکم یہ خوبی تو ہوتی ہے کہ چند اعلیٰ ترین عہدے عوام کے منتخبہ نمایندوں کے لئے محفوظ رکھے جاتے ہیں لیکن عدلیہ میں ادنیٰ سے اعلیٰ تک تمام عہدوں پر مستقل کارکن مامور رہتے ہیں۔ وجوہ ظاہر ہیں ہر کس و ناکس کا کرسی عدالت پر متمکن ہو کر فیصلے صادر کرنا ناممکن ہے۔ یہ نظریہ عمومیت کی بڑی کمزوری ہے کیوں کہ یہاں بھی "عوام کی حکومت عوام کے ذریعے" کا مقصد فوت ہو جاتا ہے اور عدالتی عہدے مختص ہو جاتے ہیں۔

عمومیت کی ایک اور خوبی جو درحقیقت اس کی بڑی خامی ہے وہ سیاسی گروہ بندی (Party System) ہے۔ بعض مقننین، گروہ بندی اور لیڈری کو عمومیت کی جان تصور کرتے ہیں ان کا خیال یہ ہے کہ

"Democracy is impossible without party System and party System is impossible without leadership.

یہ ضرور ماننا پڑتا ہے کہ جن ممالک میں ایک سے زیادہ سیاسی جماعتیں ہوتی ہیں وہاں عمومیت کامیاب رہتی ہے چاہے وہ صدارتی طرز کی ہو یا پارلیمانی نوعیت کی کیوں کہ جماعتوں کی مسابقت اور حزب الاختلاف کی تنقید برسر اقتدار پارٹی کے معیار کارکردگی کو زیادہ سے زیادہ بلند کرتی ہے۔ لیکن اس موقعہ پر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ سیاسی گروہ بندی انفرادی آزادی کو ختم کرنے کا سب سے مؤثر آلہ ہے۔ مقننہ کی رائے دراصل قوم کی رائے ہونی چاہئے لیکن جماعت بندی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملک میں جس جماعت کو بھی معمولی سی اکثریت (A critical majority) حاصل ہو جائے وہی جماعت بڑی سے بڑی اقلیت کو خاطر میں لائے بغیر ملک کے سیاہ و سفید کی قانوناً مالک ہو جاتی ہے چوں کہ جماعتیں محض رہنماؤں کی پیدا کردہ ہوتی ہیں اس لئے حکومت دراصل چند ایسے سربرآوردہ اشخاص کے ہاتھ میں کٹ پتلی بن جاتی ہے جو پروپگنڈہ اور انتخابات کے گُر سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں۔ اور ذرائع و اثرات کے مالک ہوتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی اپنی رائے اور جن کے اپنے مقاصد پارٹی کی رائے اور اس کے مقاصد قرار پانے کا شرف حاصل کرتے ہیں اور اس طرح پارٹی کے ذریعے مقننہ اور مقننہ کے ذریعے ملک کے رجحانات کو جدھر چاہتے ہیں پھیر دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے عمومیت فنا ہو جاتی ہے اور محض جماعتی حکومت (Party Govt.) قائم ہو جاتی ہے۔ اس قسم کا ایک بڑا سبب عمومیتوں میں نمائندوں کے طریقۂ انتخاب کی خامی ہے۔ ذیل کی مثال سے اس کی وضاحت بہ خوبی ہو سکتی ہے۔ ہم یہ فرض کرتے ہیں کہ کسی ملک میں تین سیاسی جماعتیں ہیں اور یہ کہ ایک خاص حلقۂ انتخاب سے مقننہ کی نشست کے لئے ان جماعتوں کے بالترتیب اُمیدوار ا، ب، اور ج ہیں۔ اگر اس حلقہ انتخاب میں کُل رائے دہندوں کی تعداد ہزار ہو تو یہ ممکن ہے کہ

ا کو ۳۳۴ آراء ملیں

ب کو ۴۰۰ آراء "

اور ج کو ۲۶۶ آراء "

ظاہر ہے کہ اس حلقۂ انتخاب سے صرف ب منتخب ہوگا کیوں کہ انفرادی آراء کے حساب سے اس کو اکثریت حاصل ہے حالانکہ ایک ہزار رائے دہندوں میں سے صرف چار سو رائے دہندے اُس کی تائید میں ہیں اور بقیہ چھ سو رائے دہندے اس کو اپنا صحیح نمائندہ نہیں سمجھتے لیکن قانوناً ب ہی ان کی نمائندگی کرے گا اس لئے جس ملک میں دو سے زیادہ پارٹیاں ہوں وہاں اس بات کا قوی امکان رہتا ہے کہ مقننہ میں ایک ایسی جماعت کو اکثریت حاصل ہو جائے جو مجموعی آراء کے اعتبار سے

ملک کی اقلیت کی نمائندہ ہو طریق نمائندگی کی خامی اُس وقت بھی اپنے شگوفے دکھلاتی ہے جب کہ ملک میں محض دو پارٹیاں ہوں فرض کرو کہ ایسے ملک میں مقننہ کی کل سو نشستیں ہیں اس صورت میں یہ امکان ہے کہ ایک پارٹی کے اکاون (۵۱) نمائندے ہوں اور دوسری پارٹی کے اونچاس (۴۹) نمائندے۔ چوں کہ پہلی پارٹی محض دو نشستوں کے اعتبار سے اکثریت کا درجہ حاصل کرتی ہے اس لئے عنان حکومت اُسی پارٹی کے لیڈر کے ہاتھ آتی ہے اور وہ سو نشستوں کی اس مقننہ میں (۴۹) مخالفین پر حکومت کرتا ہے یعنی ۴۹ حزب الاختلاف کو حکومت کے کاروبار میں کسی قسم کا دخل نہیں ہوتا اور ان کی مرضی کے خلاف حکومت کی جاتی ہے۔ اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ مقننہ میں ان پارٹیوں کی نمائندگی ملک کی آبادی کے تناسب سے ہوئی ہے تو بھی یہ امر بجائے خود کس قدر غیر منصفانہ ہے کہ ۴۹ رعایا ایک ایسی حکومت کے پنجوں میں گرفتار ہو جو محض اپنی پارٹی یا زیادہ سے زیادہ ۵۱ آبادی کے مفاد کو پیش نظر رکھتی ہے۔ جب یہی مقننہ معمولی مسئلہ سے لے کر صلح و جنگ کے اہم مسائل تک فیصل کرتی ہے تو اراکین عموماً جماعت داری تعصب ہی کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ کسی مسئلہ کی اہمیت کا لحاظ کرنا اور اس روشن و تاریک پہلو پر بلا تعصب غور کرنا اُن کی نام نہاد وطن پرستی کے منافی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عمومیتوں کی خارجی پالیسی غیر مستحکم رہتی ہے۔ جو پارٹی برسر اقتدار آتی ہے وہ اپنا الگ راگ الاپتی ہے۔ اس طرح عمومیتوں کو غیر متزلزل اور دور رس نتائج کی حامل حکمت عملی اختیار کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ اس تمام بحث میں ہمارا یہ مفروضہ رہا ہے کہ ملک کی تمام آبادی کو حق رائے دہی حاصل ہے حالانکہ اس متمدن زمانے میں بھی کوئی عمومیت ایسی نہیں پائی جاتی جس کی تمام آبادی کو حق رائے دہی حاصل ہو۔ علم، جنس اور حیثیت کی تفریق اس حد تک کی جاتی ہے کہ ملک کی آبادی کا معتد بہ حصہ ناقابل رائے دہی قرار پاتا ہے۔ اس طرح یہاں بھی "عوام کے لئے عوام کے ذریعے حکومت" کا خواب شرمندہ تعبیر رہ جاتا ہے۔ اسی سلسلے میں یہ بھی بتلا دینا ضروری ہے کہ پارٹی بندی اور لیڈری کا ایک اور نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ ملک کے قابل ترین افراد اور سنجیدہ مفکرین کو حکومت حاصل کرنے اور اس کی رہنمائی کرنے کا بہت کم موقع حاصل ہوتا ہے کیوں کہ وہ پارٹی بندی سے بہت گھبراتے ہیں اور پروپگنڈا یا انتخابی گورکھ دھندوں سے کوسوں دور بھاگتے ہیں۔ یہی وجہ ہوتی ہے کہ عمومیت میں بڑے آدمی بہت کم ہوتے ہیں۔

معاشی مساوات عمومیت کی جان ہے جب تک تقسیم دولت ہموار نہ ہو سیاسی حقوق کی تقسیم بھی ہموار نہیں ہوسکتی۔ جس ملک کی آبادی کا ایک حصہ فاقے کرتا ہے اور دوسرا حصہ عیش و طرب کے لئے گزارتا ہے وہ ملک سیاسی اعتبار سے نشو و نما پا سکتا۔ عمومیت کی کامیابی اُسی وقت ممکن ہے جب کہ معاشرے میں درمیانی طبقے کا وجود ہو۔ کیوں کہ امرا اپنی دولت کے

نشے میں اتنے مست رہتے ہیں کہ وہ سیاسی گورکھ دھندوں میں الجھنا نہیں چاہتے۔ یک طرف بڑے بڑے کاروباری افراد حصول دولت میں اور دوسری طرف غربا کسب معاش میں اس قدر منہمک رہتے ہیں کہ وہ بھی ملی اور قومی مسائل کے لئے بالکل وقت نہیں نکال سکتے۔ یہی حال جہلا کا ہے جو اپنی لاعلمی اور نادانی کے باعث مجبور محض رہتے ہیں۔ اس طرح ملک کی آبادی کا ایک اہم جز یا تو سیاست سے بالکل دلچسپی نہیں رکھتا یا پھر سنجیدگی سے ان مسائل پر غور و فکر کرنے کے ناقابل ہوتا ہے۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ عمومیت میں ایک حد تک صرف اوسط طبقہ حکومت کرتا ہے۔

In Democracy it is mediocracy which holds sway

لیکن جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں یہ اوسط طبقہ بھی نام نہاد سیاسی لیڈروں کی صف بندیوں کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ رہنما ملک کی تمام قوت کو ایک مرکز پر جمع کرنے کے بجائے اس کو اپنے ذاتی مفاد کی خاطر منتشر کرکے اپنی ہوس حکمرانی پوری کرتے ہیں۔ یہ صورت اُس وقت اور بھی خطرناک ہو جاتی ہے جب کہ ملک کے سرمایہ دار، ان لیڈروں سے ساز باز کرکے اُس پارٹی کے ستون بن جاتے ہیں جس کا مطمح نظر عمومیت کی آڑ میں سرمایہ دار اور جماعتی مفاد کی حفاظت ہوتا ہے۔ آج کل کی عمومیتوں میں ایک اور مضحکہ خیز چیز غلامی کا وجود ہے۔ گو نظراً "حریت، مساوات اور اخوت (Liberty, equality & fraternity) ہر عمومیت کے بنیادی اصول تسلیم کئے جاتے ہیں لیکن عملاً زمانہ موجودہ کی تمام سربرآوردہ عمومیتیں شہنشاہیت اور استعماریت کی مضبوط بنیادوں پر کھڑی ہیں۔ شخصی غلامی کو تو ختم کرنے کے بلند آہنگ دعوے کئے جاتے ہیں لیکن قوموں کو غلام بنانا تہذیب کا لوازمہ گردانا گیا ہے حاکم و محکوم کے امتیاز سے نہ تو حریت باقی رہتی ہے، نہ مساوات اور نہ برادری۔ "حاکم قوم کو عمومیت کی نعمت سے فیض یاب کرکے محکوم اقوام کو غلامی کی سخت زنجیروں میں جکڑ دینا، روسیو (Rousseau) کا نہیں بلکہ میکاولی (Machiavelli) کا نظریہ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ آج کل کی عمومیتیں محض ڈھکوسلہ ہو کر رہ گئی ہیں۔ اور شاید دنیا کے موجودہ سیاسی خلفشار اور بے چینی کی وجہ بھی یہی ہے۔

رہا اشتراکیت اور اشتمالیت کا سوال۔ یہ خود ایک مستقل بحث کا محتاج ہے یہاں ہم اس کی خامیوں پر صرف ایک سرسری نظر ڈالیں گے۔ یہ اشکال تصوری عمومیت کا پیش خیمہ سمجھی جاتی ہیں اور ان میں بڑی حد تک معاشی مساوات کا مسئلہ حل کیا گیا ہے لیکن روسی اشتراکیت کے دامن پر اب بھی بہت سے سیاہ داغ نظر آتے ہیں۔ بالواسطہ مقننہ جماعت بندی اور عاملہ کی آمرانہ شان۔ یہ ناقابل نظر انداز خامیاں ہیں ایک اور چیز بھی اشتراکیت کو گھن کی طرح ختم کر رہی ہے یہ ملکیت کا سوال ہے

اشتراکیت میں ملکیت کوئی چیز نہیں ([illegible]) اس کا سب سے بڑا اصول ہے۔ گو بظاہر "کوئی ملکیت نہ ہو" کا تخیل بہت بھلا معلوم ہوتا ہے لیکن یہ بھی اصول فطرت کے خلاف ہے۔ اگر ملک کے تمام ذرائع دولت کو اور ہر اس چیز کو جو ملکیت کی تعریف میں آتی ہو حکومت اپنے قبضہ و تصرف میں لے لے اور افراد مملکت کے دل میں یہ احساس پیدا کرا دیا جائے کہ "حکومت مثل ایک چرواہے کے ہے اور رعایا مثل اس ریوڑ کے ہے جو چرواہے کی لاٹھی کے زیر عاطفت پرورش پاتا ہے اور جس طرح چرواہے کو اپنے منڈے کی افزایش و ترقی کا خیال محض اس لئے دامن گیر ہوتا ہے کہ وہ اس ریوڑ اور اس سے حاصل ہونے والی ہر چیز کا مالک ہے۔ اسی طرح افراد مملکت اور ان کا سب کچھ حکومت ہی کی ملک ہے جو ان کی سرپرست اور کفیل ہے اس لئے کسی شخص کو بھی بہ ذات خود مالکانہ شان اختیار کرنے کا حق نہیں"۔ کچھ اسی قسم کا حال روسی مملکت اور روسی افراد کا ہے۔ اشتمالیت تو اس میدان میں ایک قدم اور آگے ہے اس کا نظریہ یہ ہے کہ "نہ صرف ملکیت ہی کوئی چیز نہیں بلکہ وراثت بھی بے معنی لفظ ہے۔ باپ بیٹے کا تعلق۔ بھائی بہن کا رشتہ، خاندانی روایات اور نسلی خصوصیات سب مصنوعی قصے ہیں جو سرمایہ داروں اور خود غرض حکمرانوں کے تراشے ہوئے ہیں" یہ تو اشتمالیوں کی معاشی اور سماجی مساوات تھی اب ذرا ذہنی مساوات کو لیجئے۔ عمومیت کے اسی پرانے اور بنیادی اصول یعنی مساوات کے تحت کسی شخص کا عالی دماغ اور فہیم و ذکی ہونا بھی قدرت کی ایک ستم ظریفی خیال کی جاتی ہے۔ کیوں کہ دولت کی طرح عقل کی تقسیم بھی ہموار ہونی چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ اشتمالیت کی سرپھری امت اس معاملے میں خدا سے بھی بگڑ بیٹھی ہے۔

بہر حال اشتراکیت اور اشتمالیت کے یہ انتہا پسند نظریے عملی میدان میں کچھ زیادہ وقعت حاصل نہ کرسکے اور اسی بنا پر ان تصورات کی چند نمایاں خامیوں اور فطری خلاف ورزیوں کے مقابلے میں آج کل نسطائیت اور نازیت کا نیا طوفان اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ فطرت انسانی میں ملکیت اور وراثت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اور نوع آدم کی کل تاریخ اسی بنیاد پر تیار ہوئی ہے اس لئے اگر فطرت انسانی یا خود فطرت کے خلاف جنگ کرنی ہو تو اشتراکیت و اشتمالیت کو فتح سے پیشتر کئی شکستیں کھانی پڑیں گی یہی وجہ تھی کہ خود لینن کا ابتدائی جوش و خروش بہت جلد سرد پڑ گیا تھا اور اسٹالن نے تو ان نظریات میں چند بنیادی تبدیلیاں کردی ہیں۔ ٹراٹسکی (Trotsky) کے الفاظ میں وہ "کمیونیزم کا غدار" ہے۔ اسٹالینی روس میں افراد مملکت ایک محدود ملکیت کے مالک ہوسکتے ہیں۔ اگرچہ کہ وراثت اب بھی قائم نہیں ہوسکتی لیکن اگر شوہر و زوجہ اپنے رشتہ ازدواج کو قائم رکھنا چاہیں تو حکومت اس رشتے کو گو قانونی احترام کی نظر سے نہ سہی، اخلاقی احترام کی نظر سے ضرور دیکھتی ہے۔

پس ہمارا یہ ابتدائی فرضیہ کہ "عمومیت طرز حکمرانی کی بہترین شکل ہے" بجائے خود ایک نظری دہوکہ ہے۔ یہ خیال کہ مملکت کے ہر فرد کی صحیح نمایندگی اس طریق حکومت ہی میں ہو سکتی ہے اور ملک کے تمام اجزا اس کی تعمیر و استحکام میں مساوی طور پر رضاکارانہ شریک ہوتے ہیں محض خیال ہے کیوں کہ پہلے تو صحیح معنوں میں عمومیت کا قیام دنیا کے ان موجودہ حالات میں ناممکن ہے جب کہ انسان ہر قسم کی تفریق و امتیاز کو باعث فخر و مباہات سمجھتا ہے اور حصول اقتدار کا جذبہ ہر بڑے سے بڑے عمومیت پسند دل میں موجزن رہتا ہے۔ پھر خود بنی آدم کے ذہنی تفاوت اور سیاست سے ذوق و دلچسپی کا اختلاف ناقابل فراموش حقیقت ہے اس لئے کہ زندگی اپنی گوناگوں مصروفیتوں اور نت نئی الجھنوں کے باعث ہر کس و ناکس کو اتنی مہلت نہیں دیتی کہ وہ ملک اور وقت کے اہم اور گہرے مسائل کو منطقی اور امکانی نقطہ نظر سے سنجیدگی کے ساتھ سوچ سکے۔ کشمکش حیات اور شکم پروری کے مسائل ہی سے فراغت نہ ہو تو پھر سیاست کے گورکھ دہندوں سے کیا تعلق؟ یہ میدان تو اُنہی کا ہے جو محض اس کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ قانون فطرت یہی ہے کہ "فن داں پیدا ہوتا ہے بنتا نہیں" سیاست دانی بھی ایک فن ہے۔ اس لئے وہ ہمیشہ کی طرح ایک محدود طبقہ اور مخصوص گروہ کا مشغلہ حیات رہے گی چاہے اس کو آمریت کہیں یا عمومیت۔ تصوری عمومیت۔ Ideal Democracy. ایک ایسا خواب ہے جس کی تعبیر فطرت کے اصولوں کی خلاف ورزی ہے۔

محمد اسد اللہ سعید ایل۔ ایل۔ بی (ابتدائی)

آئینِ اضطراب

اُلفت کی آگ دل کے مکاں میں لگا کے دیکھ　　تعمیرِ آب و گِل کو ذرا آزما کے دیکھ
گر دیکھنا ہے عشق کا آئینِ اضطراب　　سینے میں اور دردِ محبت بڑھا کے دیکھ
اے حُسن اب سکوں کا زمانہ نہیں رہا　　تھوڑا سا کائنات کا پردہ ہٹا کے دیکھ
کیا رنگ لا چکیں تری غفلت شعاریاں　　سوئی ہوئی حیات کا شانہ ہلا کے دیکھ
اے خاکدانِ دہر کے نظارہ باز اُٹھ　　اک آتشیں نگاہ سے آنکھیں ملا کے دیکھ
آسودگیٔ زیست کی سوگند اے نعیم　　اس زندگی کو آتشِ غم میں جلا کے دیکھ
اپنی حریمِ ناز سے آتا ہے یا نہیں　　اک دستِ شوق یار کی جانب بڑھا کے دیکھ
مظلوم عندلیب کو آنسو بہا کے سُن　　معصوم گُل کا حُسن، اُجالا ہنسا کے دیکھ
آتی ہیں تیرے سامنے کتنی تجلیاں　　رنگینیٔ سحر میں ذرا مسکرا کے دیکھ
جلتے ہوئے دلوں کا اُجالا ابھی پاس رکھ　　محفل کا رنگ، شمع کا شعلہ بجھا کے دیکھ

القصہ دیکھنا ہے اگر بزم نقش جہات
آئینہ نگاہ کو روشن بنا کے دیکھ

باقی

بیسویں صدی کا سیزر

اطالیہ کے قائد اعظم اور خود مختار وزیر سنیر مسولینی کے دلچسپ حالات

کچھ دن قبل میرے ایک دوست جنھیں اچھے مضامین جمع کرنے کا بہت شوق ہے اخبار کے کالموں کا ایک پلندا لئے ہوئے میرے پاس آئے۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ گزشتہ تین چار سال میں سب سے زیادہ کس شخص نے آسمان شہرت پر پرواز کی ہے۔ اس پر اکثر قارئین شاید یہ خیال کریں کہ مسٹر سمپسن یا ڈیوک آف ونڈسر پرواز کرتے ہوئے پائے گئے ہوں گے۔ لیکن یہ دیکھ کر انھیں سخت حیرت ہوگی کہ آسمان شہرت کے چپہ چپہ کو ڈھونڈنے پر سب سے آگے ہمیں مسولینی اطالیہ کا قائد اعظم اور خود مختار آمر اپنی سعی سے تیز رفتار طیارہ چلاتا نظر آیا۔

جنگ حبش

دو سال پہلے اخبار کے کالم مسولینی کے حبش میں ہر اقدام کی خبر دیا کرتے تھے۔ آدھی دنیا یہی خیال کرتی رہی کہ ایتھوپیا کے یہ جانباز اطالویوں کو ایسی ہی شکست فاش دیں گے جیسے کہ اڈوا کے مقام پر انھیں ۱۸۹۵ء میں ہوئی تھی۔ اور آدھی دنیا یہ صحیح دعوی کرتی رہی کہ ڈوچے کے سیاہ قمیصی رضا کار کسی اور ہی خاک کے بنے ہوئے ہیں اور ابی سینیا کے سورما اس فولادی دیوار کا جو ادیس ابابا کی جانب بڑھ رہی تھی بالکل مقابلہ نہ کرسکیں گے۔ لیکن اس پر بھی

تام اس بارے میں متفق الرائے تھے کہ ایک مرتبہ مولینی کا یہاں قبضہ ہوجائے پھر وہ یورپ کے مدبرین کو اطالوی معاملات کے متعلق سوچنے بٹھادے گا یعنی اس کے عظیم ارادوں کو راہ عمل مل جائے گی۔

ہسپانیہ میں

بہت جلد ہمیں معلوم ہوگیا جو بات کسی کے خواب وخیال میں بھی نہ تھی وہ ظاہر ہوگئی یعنی جنرل فرانکو کو سپین میں برابر اطالوی کمک پہنچتی رہی اور مولینی نے بحیرۂ روم پر جسے وہ ہمیشہ "ہمارا سمندر" کہا کرتا ہے قبضہ کرنے کی خاطر ہسپانیہ میں فاجستی خیالات کی تشہیر شروع کردی۔ اب تک ہمارا سمندر رکھنے کو لوگ مذاق خیال کر رہے تھے اب انھیں معلوم ہوگیا کہ اس میں کچھ اسرار ضرور موجود تھے۔ کچھ ہفتے قبل ڈوچے کا نام ہر زبان پر رقص کر رہا تھا اور لوگوں کے دماغ نوئین کو جہاں بحری قزاقی کے خلاف کانفرنس منعقد ہوئی تھی پرواز کر رہے تھے۔ اس لئے کہ ڈوچے نے اس پر آمرانہ غصہ کا اظہار کیا تھا۔ یہ سب اس نے اس لئے کیا تھا کہ روس نے چند اطالوی زمین دوز جہازوں کو جو ہسپانیہ جاتے تھے بحیرہ روم کے بحری قزاق ہونے کا الزام لگا کر روک لیا۔ ابھی اس معاملے میں تحقیقات ہو رہی تھی کہ اس نے ہسپانیہ سے فوجیں ہٹالینے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس کے کچھ دن ہی بعد ڈوچے نے یہ اعلان کیا کہ جب تک فرانس اور برطانیہ فرانکو کے حقوق نہ مان لیں گے وہ اپنی فوج وہاں سے نہ ہٹائے گا وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ کوئی طاقت اس کو اس ارادے سے باز نہ رکھے گی۔ قیاس تو یہ تھا کہ وہ کچھ توقف کرے گا لیکن دو ہی دن بعد اس نے صورت حال بالکل بدل دی اور یہ ارادہ ظاہر کیا کہ وہ معاہدہ کے ساتھ رضاکاروں کو بلانے کا انتظام کرے گا اور فرانکو کی مدد سے کچھ عرصے کے لئے دست بردار ہوجائے گا اس کے بعد روس نے اس کے انسداد کی ہر قسم سے کوشش کی لیکن دنیا مولینی کی متزلزل پالیسی سے ناواقف تھی۔ ان شاطرانہ چالوں سے برطانیہ کا معمر مدبر ڈیوڈ لائیڈ جارج خوب واقف ہے اس نے فاجستیت کی مدد دے چند سیاہ قمیصی رضاکاروں کی ایک جماعت کو ترقی کرتے ہوئے یورپ میں تھرا دینے والی قوت پیدا کرتے دیکھا ہے۔ مسٹر لائیڈ جارج کا خیال ہے کہ مولینی ہسپانیہ سے اطالیہ کے تعلقات اتنے قریب اور ایسے مستحکم کردینا چاہتا ہے جیسے کہ آسٹریا اور جرمنی کے جنگ عظیم کے بعد ہوگئے تھے (جس کا نتیجہ ہم نے دیکھ لیا) اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جس طرح آسٹریا کی حکومت جرمنی فوج کی ہمت پر قائم تھی اسی طرح ہسپانیہ کی حکومت بھی اطالوی فوج کی ہمت پر قائم ہوتی۔

ہمارا سمندر

ہسپانیہ کے جزیروں، بندرگاہوں اور اس کے چھوٹے چھوٹے تنگ سمندروں کی مولینی کو سخت ضرورت ہے۔ اور اس پر قبضہ کے بعد وہ پورے بحیرہ روم کا حاکم ہوجائے گا۔ اس طرح برطانیہ اور

فرانس اس کے رحم وکرم کے محتاج ہو جائیں گے یہ اقتدار ہسپانیہ میں وہ اس وقت تک قائم نہیں کرسکتا جب تک کہ وہاں کی حکومت خود اس کی قائم کردہ نہ ہو حکومت بھی ایسی نہیں جو صرف اپنے قیام کی حد تک اس کی شکر گذار ہو بلکہ ایسی کہ اس کے حسب منشار جس کو چاہے وہاں کا حکمراں بناتے رہے۔ اس خیال کی کامیابی کے لئے دو چیزوں کی سخت ضرورت ہے۔ ایک تو یہ کہ جنرل فرانکو کو کامیابی حاصل ہو اور دوسری یہ کہ اطالوی فاچستی مدد کو ہسپانوی فاچستی قبول کرتے رہیں، اب انھیں ہسپانوی فاچستیوں کی خاطر و مدارات کو اس نے اپنی کامیابی کا راز سمجھ رکھا ہے۔ وہ فاچستی بحیرۂ روم کا خواب دیکھ رہا ہے جس کے راستوں کو مولینی جب چاہے منقطع کردے۔ بحیرہ روم سے سوئیز تک، مارسیلز سے مراقش اور تونس سے الجیریا تک اور تونس کے راستوں پر وہ آب دوز جہازوں، بندوقوں، اور جنگی طیاروں سے جہازوں کو تباہ کرے گا اور اگر ضرورت ہو تو غرق بھی کردے گا۔ مسٹر لائیڈ جارج کے الفاظ میں ڈوچے کی حکمت علیاں اس کی اعلیٰ دماغی کا ثبوت دیتی ہیں اور اس کی شاطرانہ چالیں فن سپہ گری کا بہترین نمونہ ہیں۔ اور واقعی اس کی اس قدر ترقی اور اتنا اقتدار پیدا کرلینا اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ اس نے سپاہیانہ جرأت اور مدبرانہ جاہ وجلال کے ساتھ ہی اس دنیا میں جنم لیا تھا۔

سوانح

بنیٹو مولینی ۲۹ جولائی ۱۸۸۳ء کو دارونوڈی کاشا میں پیدا ہوا۔ یہ ایک قدیم قصبہ ہے۔ ایک چھوٹی سی پہاڑی پر اطالیہ کے شمال مشرق کے صوبہ پرڈیاپیو کے ایک تعلقہ ڈودیا میں واقع ہے۔ یہاں اس کے باپ کا ایک ذاتی مکان ہے جس میں اس کی ماں نے ایک مدرسہ نسواں قائم کیا تھا۔ اور وہیں اس کے باپ کی آہنگری کی بھٹی تھی۔ یکشنبہ کی سہ پہر میں دو بجے کے قریب اطالیہ کے آمرنے آہنگر کے گھر میں جنم لیا۔ بچپن میں غضب کا شریر تھا، میزوں کے نیچے گھس جاتا غریب بچیوں کو چھیڑا کرتا اور ان کے چٹکیاں لیتا۔ شاید گھر پر مدرسہ ہونے کا سبب تھا کہ وہ تعلیم سے جی چرانے لگا۔ اپنی (My Autobiography) میں وہ خود لکھتا ہے: "اپنی عمر کے پندرھویں سال میں نے پڑھنا شروع کیا" شروع شروع گھر ہی میں تعلیم پائی لیکن بعد میں فائنزا اور فارلیمپولی کے قصبوں کو بھی بھیجا گیا۔ جب ذرا بڑا ہوا تو باپ نے اس سے بھٹا چلوانا شروع کیا۔ مگر یہ کام ٹھیک نہ کرتا اور تھپیڑ کھاتا، کئی دفعہ تسمے سے بھی باپ نے کام چور بیٹے کی تواضع کی۔

۱۹۰۲ء میں جب وہ انیس سال کا تھا تو اطالیہ میں فوجی جبری بھرتی ہو رہی تھی جسے اکثر اطالوی ناپسند کرتے تھے۔ بنیٹو امریکہ جانا چاہتا تھا لیکن اس کی ماں نے صرف دو پونڈ سے اس کی مدد کی اس لئے یہ سوئٹزرلینڈ چلا گیا اور یہاں چھ مہینے کے بعد لازین کے مقام پر خانہ بدوش آوارہ ہونے کے الزام میں گرفتار ہوا۔ دو سال بعد جب وہ جیل سے نکلا

تو جمہوریت کا زبردست طرفدار تھا۔ اس نے اسی زمانہ میں سنگ تراشوں کی ایک ہڑتال بھی کروائی جس کی وجہ سے سوئیس حکومت نے اسے جلد شہر بدر کردیا۔ اسی وقت اطالیہ سے اسے فوج میں شریک ہونے کی دعوت وصول ہوئی لیکن اس نے اس کی پروا نہ کی۔ سوئس حکومت کو اس کے پاسپورٹ کے متعلق شبہ ہوا اور اسے جنیوا سے بھی نکال دیا۔ اب اس کو اطالوی فوج کا خیال آیا لیکن ساتھ ہی یہ خیال بھی دامنگیر تھا کہ احکام کی پابندی نہ کرنے پر اس کو کافی سزا ملے گی۔ اس لئے اس نے یہ ارادہ ترک کردیا اور شاید انھیں مصیبتوں سے پریشان ہوکر "خدا کا وجود نہیں ہے" پر ایک مضمون لکھا جو اسی زمانے میں کسی اخبار میں بھی شائع ہوا تھا۔

مارکیزم

بادشاہ کی سالگرہ کے موقعہ پر جو معافی نامہ جاری ہوا اس میں اسے بھی گھر جانے کی اجازت مل گئی۔ یہاں سے وہ فارلی گیا اور وہاں تین سال تک تعلیم پاتا رہا۔ محنت کرتا اور ساتھ ساتھ پڑھتا بھی تھا۔ اب وہ کسی قدر آزاد بھی تھا اور آرام سے اس کی زندگی گزر رہی تھی لیکن دوسروں کی تکلیف کے احساس نے اسے چین لینے نہ دیا۔ ایک بڑے مجمع کی قیادت کرتے ہوئے فارلی کے میئر کی خدمت میں دودھ کی قیمت میں کمی کرنے کا مطالبہ پیش کیا۔ قیمت میں تو کمی ہوگئی لیکن باغیانہ خیالات پھیلانے کے جرم میں اس کو آٹھ مہینے کی سزا بھگتنی پڑی اور ۱۰۰ لیر جرمانہ ادا کرنا پڑا۔ قید سے نکلنے کے بعد وہ فارلی اشتمالی پارٹی کا رکن ہوگیا اور اس کا معتمد بھی بن گیا۔

اب جمہوریت کی جانب اس کا پورا رجحان اور "جماعتی جدوجہد" کے نام سے اس نے ایک پرچہ نکالا۔ کارل مارکس کے نظریہ کا اس وقت وہ بڑا حامی تھا لیکن برسراقتدار ہونے پر اسی کی سخت مخالفت کی۔ اطالیہ کے ترکی لیبیا حاصل کرنے سے پہلے اس اشتمالیت پسند نے جنگ کی سخت مخالفت کی اور اسی وجہ سے قید بھی ہوا جنگ برابر جاری رہی اور مسولینی نے اس کے روکنے کی ممکنہ کوشش بھی جاری رکھی۔ بغاوت کرنے، کارخانوں میں کام بند کروانے، ٹراموں کو روک دینے، راستوں کو خراب کردینے، اور رنگروٹوں کو بھرتی سے روکنے میں وہ بہت کچھ کامیاب رہا۔ اور ان تمام الزامات کے باوجود اسے صرف ۵ ماہ قید میں گزارنے پڑے۔

ادارت

جولائی ۱۹۱۲ء میں یہ پورے اطالیہ کی اشتمالی پارٹی کا صدر ہوگیا اور اس کے زبردست اخبار "ایونتی" کا مدیر ہوگیا۔ دو سال بعد ۱۹۱۴ء کے جون میں اس نے "سرخ انقلابی ہفتے" میں ایک اور بڑے مجمع کی قیادت کی لیکن بلدیہ کی عمارتیں حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ جنگ ۱۹۱۴ء میں شروع ہوگئی لیکن اطالیہ کچھ عرصہ تک خاموش رہا اور مسولینی

کی پارٹی بھی خاموش تھی۔ لیکن اکتوبر کے آخر میں اس میں یکایک تبدیلی ہوگئی اور وہ جو جنگ کا اس قدر مخالف تھا اس کا حامی بن گیا۔ اس کے مخالفین کا خیال ہے کہ اس زمانے میں اُسے فرانسیسی سفارت خانہ سے مدد ملی تھی۔ اس پر اشتمالی پارٹی نے اسے خارج کر دیا۔ اب اس نے اپنا خود ایک اخبار (Popolo D'Italia) نکالا (جواب بھی اس کی قیادت میں نکلتا ہے)

پانچ سال قبل جنگ کی مخالفت کرنے پر اسے جیل جانا پڑا تھا لیکن اب کی مرتبہ اپریل ۱۹۱۵ء میں جنگ کی تائید کرنے پر اسے قید نصیب ہوئی۔ آخر کار اطالیہ جنگ میں شریک ہوگیا۔ اسے بھی رہا کر کے فوج میں شریک کر لیا گیا۔ اس دوران میں پیٹ کے درد کا بہت سخت دورہ پڑنے پر اس کو کچھ دن آرام لینے کے لئے واپس کر دیا گیا۔ اسی زمانے میں اس نے اپنا معرکتہ الآرا مضمون (Life in the Trenches) خندقوں میں زندگی" اپنے پرچہ کے لئے لکھا۔ ۱۹۱۷ء میں میدان جنگ میں زخمی ہوا اور دواخانہ میں شریک کر دیا گیا۔ یہیں بادشاہ (موجودہ شہنشاہ حبش) وکٹر عمانوئل نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا۔ عمانوئل پر مسولینی کا ایسا اثر ہوا کہ اس نے بے ساختہ کہا:۔

"یہ شخص بہت ترقی کرے گا"

فاچیتیت کی بنیاد

اس کے دو سال کے بعد کرنل ایلیو ڈی بونو (موجودہ سپہ سالار) اٹالو بالبو (موجودہ گورنر لیبیا) دوسرے جوشیلے ساتھیوں کو جمع کر کے اس نے فاچتی پارٹی کی بنیاد ڈالی اور اپنی فوج قائم کر لی۔ ۱۹۱۹ء میں پارٹی کو اس قدر تقویت حاصل ہوگئی کہ فرانسسکو نٹی وزیر اعظم نے بغاوت کے خوف سے اس کے صدر مسولینی کو قید کر لیا۔ مسولینی کی یہ آخری قید صرف چوبیس گھنٹے کی تھی۔ اس کے ایک سال بعد صدر اعظم گیولیٹی سے اس نے اپنی فوج کو مسلح کرنے کی اجازت حاصل کر لی۔ ۱۹۲۲ء میں اشتمالی اور مزدور جماعتوں کے لئے جزیرہ نما اطالیہ فاچیتیت کا آماجگاہ بن گیا تھا۔ اب فاچست اکثر کامیاب نظر آنے لگے تھے۔ اکتوبر کے مہینہ میں فاچتی اخبار (March on Rome) کے کالم عموماً "روما کی طرف بڑھے چلو" کے مضمونوں سے بھرے نظر آتے۔ تمام فاچتی کارکن اطالیہ میں نئے انتخابات کی مہم میں کامیاب رہنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ مسولینی میلان ہی میں اخبار کے دفتر میں ٹھیر گیا۔ ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو اس کے دفتر میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور صدارت عظمیٰ اس کی خدمت میں پیش کی گئی۔ فبروری ۱۹۲۳ء میں اس نے فاچتی فوج قائم کی اور مارچ میں جدید معاشی تنظیم سے شہر کو نئے قالب میں ڈھال لیا اور مئی میں خفیہ پولس کی بنیاد رکھی۔

۱۹۲۴ء اور ۱۹۲۵ء میں ڈوچے اپنے مخالفین کو نیچا دکھانے اور اپنے تئیں مضبوط کرنے میں مصروف رہا۔ اس کے مخالفین نے اشتمالی لیڈر گیو کو مونیا ٹوٹی کے قتل پر اسے اس قدر دق کیا کہ ایک مرتبہ پریشان ہو کر مستعفی ہوجانے کا ارادہ کرلیا لیکن پھر ہمت کرکے بڑی بڑی مخالف انجمنوں کو بند کروادیا اور خفیہ اداروں کی مسدودی کا حکم دیدیا حتی کہ فریمیسن انجمن بھی جس نے اس کی ۵۰ م کرور سے مدد کی تھی بند کردی گئی۔ دسمبر ۱۹۲۵ء میں پہلی مرتبہ کھلم کھلا اس نے فاچستیوں کی مدد کی۔ اسی زمانہ میں جرمنی میں ہٹلر نامی ایک شخص ترقی کر رہا تھا۔ مولینی اس کی مدد کرنا چاہتا تھا لیکن آسٹریا کی حکومت نے مشین گن اور دوسرے سامان حرب آگے لاکر اس کو اس ارادہ سے باز رکھا۔ اس پر ڈوچے نے پریس کی آزادی سلب کرلی۔ بلدیہ کے انتخابات بھی ختم کردیئے۔ دو مرتبہ بال بال بچا۔ خزانہ میں خسارہ کا سبب دریافت کرکے غداری، بدمعاشی اور لوٹ مار کی حکومت کو ختم کردیا۔ امریکہ سے دس کرور قرض حاصل کرکے اصلاحی قدم اٹھایا۔ کیاتھولک بائے اسکاؤٹس کی تحریک جڑ پکڑ رہی تھی ہوشیاری سے اس نے اسے یہیں ختم کردیا۔

جنوری میں ڈوچے نے اطالیہ سے باہر طاقتور ذی اقتدار دوست پیدا کرنے کی دوبارہ کوشش کی۔ پھر دوبارہ آسٹریا نے مزاحمت کی۔ سپتمبر میں مولینی نے اطالیہ میں اشتمالیت کو کامل اختیارات عطا کردیئے۔ صدر اعظم کے انتخاب میں بادشاہ کو کوئی اختیار نہ رہا بلکہ پارٹی کو اس کا اختیار دیدیا گیا کہ وہ خود مناسب اور موزوں شخص کا انتخاب کرے۔ ۱۹۳۳ء میں مولینی نے ایک نظام العمل کا اعلان کیا جو پانچ یا دس سال کا نہیں بلکہ کامل ساٹھ سال کا ہے جب کہ ڈوچے کے خیال کے مطابق اطالیہ پوری دنیا پر اقتدار قائم کرے گا۔ سپہ سالار لارڈی بوتو (جس نے "مارچ آن روم" میں اس کی مدد کی تھی اور جو اس وقت ریڑیریا کا گورنر تھا) کی مدد سے اس نے حبشہ کی تسخیر کا خاکہ تیار کیا۔

سیزر ثانی

ڈوچے کا قد پانچ فیٹ سات انچ ہے لیکن اس قدر سیدھا رہتا ہے کہ کافی لانبا معلوم ہوتا ہے اس کا کہنا ہے کہ:۔

> "دنیا دو قسم کے افراد پر مشتمل ہے ایک تو
> وہ طبقہ جو حکومت کرنا چاہتا ہے اور دوسرا
> وہ جو محکوم رہنا چاہتا ہے۔ میں پہلی قسم
> سے تعلق رکھتا ہوں"

اس کا خیال ہے کہ وہ سیزر ثانی ہونے والا ہے۔ اسے کسی پر اعتماد نہیں ایک مرتبہ اس نے کہا کہ "اگر میرا مُردہ باپ بھی میرے سامنے آکر مجھ سے کہے کہ میں تیرا دوست ہوں تو میں اُس کو مکا بتا دوں گا" ۱۹۳۴ء تک اپنے بھائی آرنلڈ پر اسے کامل بھروسہ تھا۔ لیکن اس کی موت کے بعد وہ اکثر معاملات کے متعلق اپنی بیٹی ایڈا اور اس کے شوہر کاؤنٹ گیالیزو کیانو وزیر خارجہ کے ساتھ مشورہ کرتا ہے اور ان کی رائے لیتا ہے مسولینی کا جسم بہت قوی ہے۔ وہ ہر قسم کے کھیل میں دلچسپی لیتا ہے۔ پیرا کی اور شکار کھیلنے کا بھی شوقین ہے۔ طیارہ خود اُڑاتا ہے اور وہ بھی انتہائی تیز۔ اس کو ادب سے بھی دلچسپی ہے۔ روزانہ چار گھنٹے وہ فرانسیسی، جرمنی، انگریزی اور اطالوی کتابیں پڑھنے میں میں صرف کرتا ہے۔ نظم کا کافی ذوق ہے اور بذلہ سنجی سے محظوظ ہوتا ہے۔ گانے کا شوقین ہے اور خود بھی بہترین ویولن بجاتا ہے۔

صبح سات بجے اُٹھتے ہی ایک قدیم قسم کے اُسترے سے ڈاڑھی مونڈھتا ہے۔ ۸ بجے سے ۹ تک گھوڑے کی سواری کرتا ہے اور صبح کے باقی وقت میں اخباروں کے نمایندوں اور سرکاری عہدہ داروں کو ملاقات کا موقع دیتا ہے یہاں سے اپنے مکان ویلا ٹورلینا (Villia Torlonia) میں بالکل تھوڑا سا ناشتہ کرنے کے بعد وہ اپنے دفتر پلازو وینزا (Plazzo Venezia) چلا جاتا ہے۔ حساب لگانے سے معلوم ہوا ہے کہ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۷ء تک اُس نے ۶۱ ہزار لوگوں کو ملاقات کا موقع دیا ہے۔ وہ رات میں دیر تک مطالعہ میں مشغول رہتا ہے۔ چھپن سال کی عمر ہونے کے باوجود اس کی صحت بہترین ہے۔ پیٹ کے آپریشن کے بعد سے اب تک وہ گوشت نہیں کھایا شراب بھی بالکل کم پی ہے اور سگریٹ تو اس نے آج تک سلگایا ہی نہیں۔

حفاظت سرکاری طور پر یہ اعتراف کر لیا گیا ہے کہ اس پر آٹھ مرتبہ قاتلانہ حملے ہوئے ہیں لیکن اس کے علاوہ سولہ غیر مصدقہ بھی ہیں۔ اب ڈوچے بہت احتیاط کرتا ہے۔ اُس نے آٹھ سو افراد کی ایک خاص پولیس بنائی ہے جو چوبیس گھنٹے اس کی حفاظت کرتی ہے۔

اس کو ردم سے، اپنی بیٹی ایڈا، بچوں، گھوڑوں، اخبار کے نمایندوں، مزاحیہ یا تاریخی فلموں، ناچ، میکانی آلات، اور علم نجوم سے خاص اُنس ہے۔ بوڑھی عورتوں، امیروں، ظاہری خوشامدی پیسے والوں، بلیوں، ڈاڑھی، اور ممیوں سے اسے سخت نفرت ہے۔ پیراڈیپو جہاں یہ پیدا ہوا اُس کی اس کے حکم سے دوبارہ تعمیر ہوئی ہے۔ تمام پرانی جھونپڑیاں اور قدیم وضع کے مکانات توڑ دیئے گئے ہیں اور اب وہاں ایک نیا پیراڈیپو جدید وضع کے مکانات، بڑی

مارکٹ اور پختہ سڑکیں ہیں۔ اور وہ جدید طرز کا ایک مکمل شہر ہے۔ صرف ایک مکان اسی پرانی طرز پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ یہ وہی مکان ہے جس میں مولینی نے جنم لیا۔ اور جواب بھی زبان حال سے غربت اور مفلسی کی داستان سُنا رہا ہے۔

وادی کے دامن میں پہاڑوں کی جانب ایک بڑا قلعہ اس کے لئے تعمیر کیا گیا ہے جہاں اس کی بیوی اور اس کے دو چھوٹے چھوٹے بچے رہتے ہیں مولینی اکثر ان کے یہاں آکر ٹھیرتا ہے۔ ڈوچے سیاست میں عورتوں کی شرکت کو بالکل پسند نہیں کرتا۔ اس لئے اس کی بیوی ڈونا راشل کو بہت کم لوگوں نے پوری طور سے دیکھا بھی نہیں ہو لیکن خود اس نے اپنی بیٹی ایڈا کو اپنے خیال کے خلاف سیاست کی تعلیم دی ہے۔ یہ اس کے داماد اطالیہ کے وزیر خارجہ کاونٹ کیانو کی بیوی ہے۔

ایڈا تمام بچوں میں اسے صرف ایڈا سے ہی محبت تھی، ہے اور ہونی بھی چاہئے کیونکہ ایڈا خود بھی انہی صفات کی حامل ہے جو مولینی کی ترقی کا باعث ہوئے۔ اور در اصل اپنے باپ کی طرح یہ بھی جوشیلی ہے اور حکومت کرنے کی آرزو مند۔ لیکن اس کے دونوں لڑکے برونو اور ویٹوریو کاہل ہیں، جاذب شخصیت کے مالک نہیں اور ان میں حکومت کرنے کا جذبہ بھی مفقود ہے۔ وہ ایماندار ہیں اور اخلاق میں ایڈا سے بھی کہیں بڑھ کر، باپ کے بلند ارادوں کا ترکہ پورا پورا صرف ایڈا کو ملا ہے۔ یہ دونوں لڑکے اپنی بہن کے پیرو ہیں اور یہ ان کی رہبر۔

بچپن میں یہ انتہائی شریر، تیز اور چالاک تھی اس کے ساتھ ہی اس میں ایک خاص شوخی پائی جاتی تھی جس کی وجہ سے اکثر لوگ اسے پسند کرتے تھے۔ کئی مدرسوں کو یہ شریر لڑکی بھیجی گئی لیکن کہیں بھی وہ ٹک نہ سکی بلکہ جہاں کہیں وہ شریک کرائی جاتی وہاں سے کچھ دنوں بعد مولینی کے نام ایک بڑا خط آتا کہ اپنی بھیتی کو کسی اور مدرسے میں شریک کروا لیجئے۔ مولینی اس وقت کہتا :-

"یہ آخر میری ہی تو لڑکی ہے"

اب بھی جبکہ اس کی عمر ۲۸ سال ہے شاید ہی اس سے ہوشیار کوئی عورت یورپ میں پائی جائے۔ مولینی پورے اطالیہ پر حکومت کرتا ہے اور یہ خود مولینی پر حکومت کرتی ہے۔ مشہور ہے کہ ایڈا کی نسبت پہلے البرٹو ولی عہد اطالیہ سے ہوئی تھی لیکن ظاہر ہے کاونٹ گلاز و کیانو کے خیال سے ہی یہ نسبت مسترد کردی گئی ہوگی۔ عوام کا خیال ہے اور بہت کچھ صداقت پر مبنی ہے کہ کاؤنٹ کیانو مولینی کا جانشین ہوگا۔ اس آدمی نے جو مولینی کے بعد آمریت کے اہم فرائض

انجام دے گا اور جس کے سپرد اطالیہ کی قیادت ہوگی دنیا کی صرف ۳۴ بہاریں دیکھی ہیں اور پوری دنیا میں سب سے کمسن وزیر خارجہ ہے ایڈا کو کونٹس بنانے کے بعد ہی اس کی ترقی کی راہیں کھل گئیں۔

جنگ حبشہ میں سب سے پہلے کاؤنٹ کیانو ہی نے بمب گرایا اور تسان و تسکوہ سے سب میں پہلے ادیس ابابا میں داخل ہوا اس طرح اس نے اپنی بیوی کی انتہائی آرزو پوری کی تھی۔ کاونٹ جب ایک محفوظ ہوائی جہاز میں اطالیہ واپس ہوا تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ایڈا نے اس عرصہ میں اس کے وزیر خارجہ ہونے کے احکامات حاصل کرلئے تھے اور بہت جلد سب کو معلوم ہوگیا کہ ڈوچے کا داماد بڑی خدمتیں انجام دینے کے لئے ہی پیدا ہوا ہے۔ روم میں ایک دلچسپ قصہ مشہور ہے ایک مرتبہ کاونٹ نے ڈوچے سے ملاقات کا وقت مقرر کیا لیکن معینہ وقت سے ایک گھنٹہ دیر سے پہونچا۔ مسولینی اس پر بھرا ہوا بیٹھا تھا۔ اس کاونٹ نے داخل ہوتے ہی معذرت آمیز لہجہ میں کہا۔

”مجھے دیر سے آنے کا سخت افسوس ہے میرا ملازم مجھے وقت پر بیدار کرنا بھول گیا تھا اس لئے میں نے اُسے نکال دیا ہے“

ڈوچے نے جواب دیا۔

”تم نے بڑی غلطی کی۔ وزرار کو خود اپنے پر بھروسہ کرنا چاہئے۔ ملازمین پر نہیں۔ اس کو پھر ملازم رکھ لو“

دوپہر میں جب آمر نے ایڈا کو ٹیلیفون پر کھانے کے لئے مدعو کیا تو خود مختار باپ کی بیٹی لڑکی نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا۔

”یہ بالکل بیکار ہے! میں اسی ملازم کی تلاش کر رہی ہوں“

اپنے داماد کے مستقبل کے لئے وہ کیسی ہی کوشش کر رہا ہو فی الحال وہ سلطنت اطالیہ میں خود مختار ہے اور قائد اعظم بھی۔ اس کی نگاہیں ہمیشہ ہسپانیہ، اور لاکھوں عربوں پر لگی رہتی ہیں جن کو تھوڑی سی کوشش سے برطانیہ کے خلاف اکسا دیا جاسکتا ہے اور برطانیہ کی فلسطین اور مشرق میں حکومت کے طور اور حالات کو دیکھ کر وہ دل ہی دل میں خوش ہوتا ہے۔

روم برلن محور

بہت سے لوگ ”روم برلن محور“ (Rome Berlin Axis) کے متعلق یہ قیاس آرائیاں کرتے ہیں کہ یہ بھی جنگ یورپ کے لئے ایک فاجستی شاطرانہ چال ہے۔ اپنے اس نظریے کے ثبوت میں ان لوگوں نے مسولینی کے اس مطالبہ کو پیش کیا ہے جو اس نے جرمنی کی جانب سے ریش افریقہ کے جرمن نوآبادیات کی واپسی

کے لئے کیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ایک حد تک سچ ہو سکتا ہے لیکن اکثر یہ بھی خیال کرتے ہیں کہ امن کے لئے جو کوششیں کی جا رہی ہیں بہت بعید از وقت ہیں ان مفکرین میں سے ایک مسٹر جی۔ وارڈ پرائس بھی ہیں یہ ڈیلی میل کے ایک ہونہار نامہ نگار ہیں اور ہٹلر اور مسولینی سے خاص ملاقات رکھتے ہیں۔ اپنی تازہ تصنیف (I Know These Dictators) "میں ان آمروں سے خوب واقف ہوں" میں مسٹر وارڈ لکھتے ہیں :-

"۲۸ ر دسمبر ۱۹۳۷ء کی شب یورپ میں جس قسم کا اتحاد ہوا وہ اپنی حیرت انگیزیوں کی وجہ سے دنیا کا ایک عجیب و غریب کرشمہ کہلایا جا سکتا ہے۔ ہٹلر اور مسولینی کے اس اتحاد نے ان سے متعلق تمام لوگوں کو بالکل سکتہ میں کر دیا ہے۔ اگر ایک دوسرے کی حفاظت کی ضمانت کے لئے تیار ہو کر ایسے مطالبے جاری رکھے جائیں تو پھر دنیا کا خدا ہی حافظ ہے اور یورپ کی جنگ یقینی"

یہ کتاب ہٹلر اور مسولینی کے اطالیہ اور جرمن جانے سے قبل شائع ہوئی ورنہ یقیناً مسٹر وارڈ ان ملاقاتوں، حالیہ معاہدہ میونخ، اور برطانوی وزیر اعظم نیول چیمبرلین کی فضائی پرواز سے اور کچھ نظریے قائم کرتے۔ لیکن کچھ بھی ہو مفکرین انگشت بدنداں رہ گئے اور اس نے اپنا کام برابر جاری رکھا۔

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

سلطان احمد (عثمانیہ)

غزل

مرا جنونِ محبت تو کوئی راز نہیں — ترے ہی پاس مگر چشمِ امتیاز نہیں
سبب یہ ہے جو ہے تو کیفِ عشق سے محروم — کہ سوزِ عشق تو ہو دل میں تیرے ساز نہیں
کچھ اور دن اسے رکھ آتشِ محبت پر — کہ تیرے شیشۂ دل میں ابھی گداز نہیں
سمجھ سکے تو سمجھ میری وجہ خاموشی — بیان رازِ حقیقت میں ہے یہ راز نہیں
وبالِ جاں ہو نہ کیوں عشق کے اسیروں کو — وہ دل جو تیری محبت سے سرفراز نہیں
کرم کہوں اسے قدرت کا یا ستم سمجھوں — کہ دل دیا ہے مگر کوئی دل نواز نہیں
بس ایک لفظِ محبت کے ماسوا کیا ہے — نہیں جو وہ تو مری داستاں دراز نہیں
عطائے خاص ہے تیری مرا یہ ذوقِ جنوں — عطا پہ ناز ہے مجھ کو جنوں پہ ناز نہیں

کوئی کسی سے یہ کہہ دے کہ میرا عشق جلیل
بہانہ ساز ہے لیکن زمانہ ساز نہیں

جلیل قدوائی

لافانی مُحبّت

جنت کے دروازے کا محافظ گلے میں کنجی لٹکائے خاموش اپنی جگہ بیٹھا تھا۔ نیچے دور تک سیڑھیوں کا سلسلہ چلا گیا تھا یہاں تک کہ نشیب میں فضا تاریک ہوگئی تھی مگر سیڑھیوں کا سلسلہ ختم نہ ہوا تھا۔ دروازہ کے اندر سے کبھی کبھی ہلکے سے قہقہوں کی آوازیں آجاتی تھیں۔ ورنہ باہر ہر طرف سناٹا ہی سناٹا تھا۔

آہستہ آہستہ کسی کے قدموں کی آواز سنائی دینے لگی جو رفتہ رفتہ قریب ہوتی گئی۔ بوڑھا محافظ چونک اُٹھا۔ اس نے معلوم کیا کہ نیچے کی تاریک گہرائی میں سے کوئی اوپر آرہا ہے۔ رفتہ رفتہ آواز بلند ہوتی گئی۔ آنے والا قریب ہوتا گیا اور اب محافظ نے دیکھا کہ ایک جوان، حسین، مگر نحیف عورت آہستہ آہستہ اوپر چڑھ رہی ہے۔ اس کے پاؤں شل ہو رہے تھے۔ ناتوان جسم یہ سختی برداشت نہ کرسکتا تھا۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا اس کا چہرہ اس کے اندرونی کرب کا مظہر تھا۔ اس کی حالت زار دیکھ کر بوڑھا محافظ بھی کچھ دیر حیران رہ گیا۔ اس نے بڑھ کر اسے تھاما اور وہ اوپر لے آیا۔

"تمہارا نام"، بوڑھے نے دریافت کیا۔

"رضیہ" اس نے جواب دیا

"کرۂ ارض سے آئی ہو۔" —— "ہاں" —— "تم جاسکتی ہو تم کو اجازت مل چکی ہے"۔ بوڑھے محافظ نے جنت کا دروازہ

کھولتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ ہی خوشبو کی ایک لہر باہر نکلی جس نے فضا کو معطر کر ڈالا۔ نازنین اندر داخل ہوئی۔ دروازہ پھر بند ہوگیا۔

رضیہ اندر پہونچی تو اُس نے دیکھا کہ سب لوگ بیحد خوش ہیں۔ کوئی مصروف خرام ہے تو کوئی مسرت کے راگ الاپ رہا ہے۔ کوئی سننے میں مست ہے تو کوئی بیخودی میں راگ کا ساتھ دے رہا ہے۔ اِدھر کچھ لوگ کشتیوں میں حور و غلماں کے ساتھ جھیل کی سطح پر تیرتے پھر رہے ہیں تو اُدھر کچھ لوگ گلگشت میں مصروف ہیں۔ عجیب سماں ہے ہر ایک اپنے میں مست بے فکر او رخوش ہے اس کو دیکھ کر کچھ حوریں بڑھیں انھوں نے استقبال کیا۔ لیکن اِسے اُن سے کوئی سروکار نہ تھا۔ جنت کی لذتوں اور لطافتوں نے اس پر کچھ اثر نہ کیا۔ وہ کچھ تلاش کر رہی تھی۔ شاید کسی کو ڈھونڈھ رہی تھی۔ حوروں نے چاہا کہ اُسے جنت کے سب سے خوشگوار حصوں کی سیر کرائیں۔ غلمان نے چاہا کہ اسے سونے۔ زمرد۔ یاقوت۔ نیلم اور موتی کے محل دکھائیں کہ ان میں سے وہ کسی کو پسند کرے۔ اس کے رشتے داروں نے لاکھ چاہا کہ اُسے اپنی طرف متوجہ کریں۔ لیکن وہ محو جستجو تھی۔ کسی کو ڈھونڈھ رہی تھی اس نے جنت کا کونا کونا چھان مارا۔ اس کا چہرہ اُداس ہوتا گیا اور آخر وہ مایوس جنت کے دروازہ کی طرف لوٹی اور اُس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

جنت کے اندر سے کسی کا آکر دروازہ کھلوانا بوڑھے محافظ کے لئے بالکل نیا واقعہ تھا۔ جنت میں داخل ہوجانے کے بعد کسی کے وہم میں بھی یہ بات نہ آتی تھی کہ وہاں کی لذتوں اور لطافتوں سے ہٹ کر دروازہ کی طرف رُخ کریں۔ وہ حیران تھا کہ کیا کرے "کون" اس نے دریافت کیا۔

"رضیہ" اندر سے جواب آیا: "مجھے تم نے یہاں کیوں جھونک دیا میں اُس سے ملنے آئی تھی۔ بتاؤ وہ کہاں ہے"

"کون" بوڑھا پوچھنے لگا "کون کہاں ہے۔ کس کو ڈھونڈھتی ہو"——— "تو تم نہیں جانتے۔ میں جنیدی کو ڈھونڈھتی ہوں۔ بتاؤ وہ کہاں ہے۔ مجھے اس سے ملنے دو" "جنیدی۔ کرۂ ارض سے آیا ہوا۔ تمہارے آنے سے کچھ ہی قبل جو آیا تھا"

"ہاں۔ وہی۔ وہ کہاں ہے"——"وہ دوزخ میں ہے۔ تم اُس سے نہیں مل سکتیں۔"

"دوزخ میں ہے؟ تو پھر مجھے بھی اس کے پاس بھیجدو۔ دروازہ کھول دو" اُس نے دروازہ کو دھکا دیتے ہوئے کہا۔

بوڑھا محافظ حیران تھا کہ وہ کیا کرے۔ اسے عجیب عجیب واقعات سے دوچار ہونا پڑ رہا تھا۔

"تم کرۂ ارض والے بھی عجیب لوگ ہو"، بوڑھے نے پیشانی پر شکنیں ڈالتے ہوئے کہا۔ "اور لوگ تو جنت میں آنے کے لئے کوشش کرتے ہیں۔ خواہش کرتے ہیں اور تم جنت سے نکل کر دوزخ میں جانا چاہتی ہو۔ جس کا نام سن کر لوگ سہم جاتے ہیں"۔

عشق دوزخ کی آگ سے نہیں ڈرتا۔ اور نہ جنت کی لذتیں اُسے آرام کی نیند سلا سکتی ہیں۔ وہ محبوب کا طالب ہوتا ہے اور ملنے تک چین نہیں لیتا"۔

"عشق محبوب۔ یعنی"۔ بوڑھے نے حیرت سے دریافت کیا۔

"یعنی میں اسے چاہتی ہوں اور وہ مجھے۔ ہم چاہتے تھے کہ ایک ہو جائیں۔ چاہتے تھے کہ ایک دوسرے کے شریک زندگی بن جائیں۔ لیکن ——————"

لیکن کیا۔ چاہتے تھے تو کیا کیوں نہیں۔ ہو کیوں نہ گئے۔ مذہب نے تمھیں منع تو نہیں کیا تھا۔"

"مذہب نے نہ سہی رسم و رواج نے تو مجبور کر رکھا تھا۔ دنیا کو کیا خبر کہ ہمارے سینوں میں کونسے جذبات پرورش پا رہے تھے ہم بچپن سے ایک دوسرے کے ساتھی تھے کھیل میں بھی اور مکتب میں بھی وہ بچپن کا زمانہ نہیں بھلایا جاتا۔ میں مٹی کا گھر بناتی وہ توڑ دیتا۔ میں روتی وہ پشیمان ہو جاتا اور اس سے اچھا گھر بنا دیتا۔ لیکن جب کبھی میں نے اس کی تختی توڑ دی۔ اس پر سیاہی گرا دی یا اس کے ہاتھ میں سوئی چبھو دی تو وہ ہنس دینے کے سوا شکایت کا لفظ تک زبان پر نہ لاتا۔ لیکن کسے خبر تھی کہ یہی جھگڑے اگر واقعی جھگڑے تھے۔ ہمارے رشتۂ الفت کو اور استوار بناتے جا رہے تھے۔ لوگ دیکھتے تھے کہ ہم میں سے ایک کو دوسرے کے بغیر چین نہیں آتا تھا۔ ہم مل کر کھیلتے تھے۔ مل کر مکتب جاتے تھے۔ مل کر سبق یاد کرتے تھے۔ اور مل کر لکھا کرتے تھے، مگر زمانہ نے ہم کو علیحدہ کرنا شروع کیا۔ ابتدا مکتب کی علیحدگی سے ہوئی۔ عمر کے اضافہ کے ساتھ ساتھ پردہ کی سب سے زبردست دیوار ہم دونوں کے درمیان حائل ہو گئی۔ لیکن یہ ہم کو بالکل علیحدہ نہ کر سکی اب بھی پردہ کی اوٹ سے اس کو دیکھ لیا کرتی اور خود کو اسے دکھا دیا کرتی۔ دل کی بات زمانہ تک دل میں نہ رہ سکی۔ محبت کا اظہار ہو ہی گیا اور ہم دونوں نے وعدہ کر لیا کہ ایک دوسرے کے شریک زندگی بن جائیں۔ لیکن افسوس میں حالات سے بے خبر تھی۔ مجھے اتنا شعور نہ تھا جو یہ سمجھتی کہ لڑکی زبان رکھ کر گونگی اور عقل رکھ کر بے عقل سمجھی جاتی ہے۔ اپنے شریک زندگی کو منتخب کرنا یا نہ کرنا اس کے بس کی بات نہیں بلکہ کسی اور کے رحم و کرم پر منحصر ہے۔ تم نہیں جانتے کہ رسم و رواج نے غریب عورتوں کو کس قدر جکڑ رکھا ہے۔ ادھر ہم ایک دوسرے سے وابستہ ہونا چاہتے تھے اور اُدھر زمانہ ہمارے خلاف حالات پیدا کرتا جا رہا تھا۔ آخر مجھے معلوم ہو ہی گیا کہ میری نسبت کسی سے

قرار دیدی گئی ہے اور بہت جلد میں اُس کے حوالے کردی جانے والی ہوں۔ جنیدی نے لاکھ کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ کیوں، اس لئے کہ لوگوں کو ہماری محبت کا علم تھا اور اسی لئے وہ جنیدی سے نفرت کرتے تھے۔ ان کے نزدیک ہماری محبت گناہوں کی پوٹ تھی۔ آخر ایک دن مجھے اطلاع ملی کہ جنیدی نے خودکشی کرلی۔ دل پر بجلی سی گری۔ سکتہ سا ہوا۔ ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑگئے بعد کی مجھے خبر نہیں۔

جب کچھ سمجھنے کے قابل ہوئی تو اُسے ڈھونڈتی ہوئی آئی اور تم نے مجھے یہاں جھونک دیا۔ آہ تم آسمان والے نہیں سمجھ سکتے کہ ہمارے دل ایک دوسرے سے ملنے کے لئے کتنے بےچین ہیں۔ کھول دو۔ دروازہ کھول دو۔ مجھے جانے دو"

"دیوانی لڑکی بوڑھے محافظ نے سمجھانا شروع کیا۔ اس کو خودکشی کے جرم کی سزا میں آگ میں جلایا جارہا ہے۔ تو وہاں جاکر کیا کرے گی اندر جا جنت کی سیر کے لطف اُٹھا۔ اپنا دل بہلا اور اس کو بھول جا"———"یہ ناممکن ہے میں اُسے نہیں بھلا سکتی۔ میں اس سے ضرور ملوں گی۔ میں بھی اسی آگ میں جلنے کو تیار ہوں جس میں وہ میرے لئے جل رہا ہے۔ دوزخ کی آگ مجھے اس جدائی کی آگ سے زیادہ نہیں جلا سکتی۔ دروازہ کھول دو۔ مجھے جانے دو" بوڑھا محافظ حیران تھا نہ اب تک کسی نے باہر جانے کی خواہش کی تھی اور نہ بوڑھے کو اس کا علم تھا کہ اسے دروازہ کھول کر کسی کو باہر جانے دینے کی اجازت ہے کہ نہیں۔

"ہاں دروازہ کھول دو۔ مجھے اس سے مل لینے دو۔ اوہ۔ مجھ پر رحم کرو۔ مجھے جانے دو"، لڑکی دروازہ کو مار مار کر چلا رہی تھی۔ محافظ عجیب کشمکش و پیچ میں تھا۔ لڑکی نے دیوانہ وار جنت کے دروازہ پر سر رکھ کر رونا شروع کیا۔ جنت میں یہ پہلا واقعہ تھا۔ لڑکی کے آنسو موتیوں کی لڑی کی طرح دروازہ کے باہر نکلنے لگے۔ محافظ نے دیکھا کہ ان میں ہزاروں آرزوئیں اور سیکڑوں ارمان غوطے کھارہے ہیں۔ غیب سے آواز آئی۔

"بوڑھے محافظ یہ موتی ہیں چن لے۔ ضائع نہ جانے پائیں۔ انھیں سے ہم دوزخ کی آگ بجھا کر گلزار الفت اُگاتے ہیں۔ اس کا نازک دل نہ دکھا۔ دروازہ کھول دے۔ اسے جانے دے"———بوڑھا سر بسجود ہوگیا۔

دروازہ کا کھلنا تھا کہ لڑکی بے تحاشا بھاگی۔ اس کے پیر لڑکھڑانے لگے۔ لیکن وہ بھاگے جارہی تھی۔ دوزخ کے ایک غار میں مہیب شعلوں کے درمیان اس کا محبوب کھڑا جل رہا تھا۔ وہ اور تیز بھاگنے لگی۔ دوزخ کے شعلے اس کی طرف

پکلنا چاہتے تھے ۔ وہ اس کو جلا دینا چاہتے تھے ۔ لیکن وہ بے خطر بڑھتی ہی گئی ۔ اس نے اپنے آپ کو شعلوں کے حوالہ کر دیا۔ لیکن موتی کے سے چند شفاف قطرے آگ پر گرے اور یک دم فضا بدل گئی دوزخ کے مہیب شعلوں کی جگہ اب ایک خوشنما گلزار تھا اور اس کا محبوب جنت کا خوشنما لباس پہنے کھڑا تھا۔ وہ اس سے لپٹ گئی دونوں ساتھ تفریح کرنے لگے۔ اس نے دیکھا کہ پوری جنت میں ایسا دلکش حصہ نظر نہ آیا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ جنت والوں کو وہ حظ اور وہ لطف اس سے پہلے حاصل نہ ہوا تھا جو اس ٹکڑے کے اضافہ کے بعد انھیں حاصل ہوا۔

محمد دلاور خاں مہدوی

بی۔ اے سال سوم

٭

آگے آگے

تجھے پتھک[۱] بننا ہوگا
آگے آگے چلنا ہوگا

(۱)

اپنا کون، کون بیگانہ
کہاں ٹھہرنا، کہاں ٹھکانہ
پرتچے[۲] ہیں وشو[۳] میں تجھ کو آگے آگے چلنا ہوگا

۱؎ راہ گیر ۲؎ مانوس ۳؎ دنیا

(۲)

ساتھی سنگی اس دُنیا کے
وہیں چھوٹے، جہاں بنائے
توڑ جال مایا ممتا کے، آگے آگے چلنا ہوگا

(۳)

اپنی گٹھڑی آپ اُٹھا کر
کہیں نہیں ٹکتے جو پل بھر
ان کی طرح تجھے بھی پیارے، آگے آگے چلنا ہوگا

(۴)

ڈر تب کیا اِکلّا[۱] جانے میں
جب نہ کیا اکلا آنے میں
اب بھی اِکلے سدا اکیلے، آگے آگے چلنا ہوگا

پنڈت ونشی دھر ودیالنکار (جامعہ عثمانیہ)

[۱] اکیلا

مرحوم مشاہیر

چند بڑے آدمیوں کی زندگی پر اک طائرانہ نظر

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے؟

فرشتۂ اجل نے ایک سال کے مختصر عرصے میں ہم سے چند ایسی ہستیاں چھین لی ہیں جن کا نعم البدل ملنا تقریبا ناممکن ہے۔ ان ہستیوں کے اُٹھ جانے سے دنیا کو جو نقصان پہنچا ہے وہ ناقابل تلافی ہے ان کی موت سے ہماری صفِ اول میں جو جگہ خالی ہوگئی ناممکن ہے کہ وہ پُر ہو سکے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہو
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ان بدنصیب ممالک میں جن سے ایسی بڑی ہستیاں چھن گئی ہیں ہندوستان کا پہلا درجہ ہے۔ اول تو ہندوستان میں تھے ہی بہت کم مشاہیر اور جتنے تھے ان میں سے بھی ایک ایک کر کے سب اُٹھتے چلے جا رہے ہیں۔ خدا معلوم قدرت کی اس میں کیا مصلحت پوشیدہ ہے۔ سنتے ہیں کہ اسی قسم کے آثار ایسے وقت پیدا ہوتے ہیں جبکہ اس قوم یا ملک میں کوئی انقلاب

ہونے کو ہوتا ہے جس کی بنا پر پھر وہ قوم یا ملک دنیا میں زندہ رہنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اگر اتنے بڑے نقصانات کسی ایسے ہی انقلاب کا پیش خیمہ نہیں تو ممکن ہے ان مشاہیر کی مفارقت سے ہمارے دلوں پر جو گہرا زخم لگا ہے اس کی کچھ تلافی ہو جائے۔

سب سے پہلے ہندوستان سے مادر ہند کا ایک پیارا سپوت سر جگدیش چندر بوس جاتا رہا جس کے علمی کارناموں اور سائنٹفک ایجادات کی دنیا تعریف کرتی ہے۔ اس کے بعد مشرق کا شاعر اعظم اور ہندوستان کے مایۂ ناز شاعر سر محمد اقبال جاتے رہے جن کی شاعری نے ہندوستان کی خصوصاً مسلمانوں کی کایا پلٹ دی تھی۔ ابھی اقبال کی مفارقت کا داغ تازہ ہی تھا کہ یکایک ترکی کے محافظ، قائد اعظم اور نجات دہندہ مصطفےٰ کمال اتاترک کی موت کی خبر پہنچی جس سے دنیائے اسلام کو عموماً اور ترکی کو خصوصاً جو نقصان پہنچا ہے وہ ناقابل بیان ہے۔ ہندوستان ابھی اتاترک کا ماتم ہی کر رہا تھا کہ فرشتۂ موت نے ۱۹۳۸ء کو رخصت کرتے ہوئے ایک اور آخری اور کاری ضرب ہندوستان پر لگا دی یعنی بی اماں کا لعل اور مولانا محمد علی جوہر کے برادر بزرگ مولانا شوکت علی بھی ہم سے چھین لئے گئے۔

اٹھ گئیں دنیا سے یارب کیسی کیسی ہستیاں
روئیے کس کس کو اور کس کس کا ماتم کیجئے

آیئے! ہم آپ کو بتلائیں کہ یہ لوگ کون تھے اور انھوں نے مادر وطن کی کیا خدمت کی؟

سر جگدیش چندر بوس

افسوس ہے کہ ۲۳ نومبر ۱۹۳۷ء روز سہ شنبہ کو ہندوستان کے مشہور ماہر سائنس سر جگدیش چندر بوس کا قلب کی حرکت بند ہونے سے بمقام گریدمی اناسی سال کی عمر میں انتقال ہو گیا دنیائے سائنس کے حق میں آپ کی موت ایک ناقابل تلافی نقصان ہے آپ کی ہستی ہندوستان کے لئے مایۂ ناز اور باعث عزت تھی۔ ایک ایسے زمانہ میں جب ہندوستان مغرب میں بدنام ہو رہا تھا، اس کے قدیم تہذیب و تمدن و ساجی حیثیت کے خلاف زہر آلود کارروائیاں کی جا رہی تھیں، جب مغربی ممالک ہندوستان کو جاہل، وحشی حصول تعلیم کے ناقابل اور علم سائنس سے بے بہرہ خیال کر رہے تھے، سر جگدیش نے اپنی علمی تحقیقات و تحیر خیز انکشافات سے دنیا کو بتلا دیا کہ میدان میں ہندوستان کبھی ممالک مغربی سے پیچھے نہیں ہے اور یہ کہ ہندوستان میں ماہرین سائنس اور اعلیٰ دماغ رکھنے والی ہستیاں موجود ہیں۔

ابتدائی زندگی

آپ کی پیدایش ۳۰ نومبر ۱۸۵۸ء کو بنگال میں ہوئی یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کے دل پر غدر کے زخم ابھی تازہ تھے قدرتاً بوس پر اپنے زمانہ طالب علمی ہی سے قومیت کا رنگ غالب تھا۔ ابتدائی

تعلیم آپ نے ایک دیسی مدرسہ میں حاصل کی۔ آپ کے والد مسٹر بھگوان چندر بوس ایک قابل اور متمول آدمی تھے اس لئے انھوں نے اپنے فرزند کے لئے بہترین تعلیم کا بندوبست کیا اور نوجوان جگدیش کو پادری فونٹ صاحب کے سپرد کر دیا جو اپنے زمانہ میں مشہور ماہر تعلیم تھے۔ سینٹ زیویر کالج کلکتہ سے ۱۸۸۰ء میں ڈگری لے کر سر جگدیش پادری لافونٹ کے ساتھ انگلستان روانہ ہو گئے۔ جہاں انھوں نے لندن یونیورسٹی سے بی۔ ایس سی اور جامعہ کیمبرج سے ٹرائپاس اسائنس و ریاضی میں آنرز کا امتحان کامیاب کیا دوران تعلیم میں نوجوان جگدیش پر لارڈ ریلے کی خاص توجہات رہیں اور انھیں کی تربیت کا اثر تھا کہ بوس کے دل میں تحقیق و تدقیق کا شوق پیدا ہوا۔ ۱۸۸۵ء میں ہندوستان لوٹ آئے اور پریسیڈنسی کالج کلکتہ کے پروفیسر طبیعیات مقرر ہوئے اور آخری دم تک اسی عہدہ پر فائز رہے۔ آپ نے ایک اعلیٰ دار التجربہ قایم کیا جہاں آپ نے وہ تجربات کئے جن سے مغربی دنیا تک حیرت میں آگئی۔

آپ کی اوّلین تحقیقات

گو شروع شروع میں آپ کے نظریوں کا مذاق اُڑایا گیا۔ آپ پر آوازے کسے گئے اور آپ کی پُرزور مخالفت کی گئی اور خود ہندوستانی ماہران فن نے آپ کی قابلیت جانتے ہوئے بھی آپ کو ایک اسکول ماسٹر سے زیادہ اہمیت نہیں دی لیکن آپ نے ان کی پروا نہ کرکے اپنی تحقیقات جاری رکھیں اور عملی تجربات کے ذریعے اپنے نظریوں کی صداقت ثابت کر دی اور آخر کار دنیائے سائنس کے محسن اعظم قرار پائے۔

پریسیڈنسی کالج میں آپ معمولی آلات سائنس ہی کی مدد سے اپنے شاگردوں کو وہ جدید انکشافات تبلاتے تھے۔ جو دنیا کے دوسرے حصوں میں ہوا کرتے پروفیسر بوس کو سائنس کے تمام شعبوں میں سب سے زیادہ شوق برقیات سے تھا۔ نومبر ۱۸۹۵ء کو جرمن ماہر سائنس رونٹجن نے عالم برقیات کے متعلق ایک نیا انکشاف کیا پروفیسر جگدیش نے دوسرے ہی مہینے رونٹجن کے تمام تجربے کلکتہ میں دہرا دیئے۔

اس اثنا میں ان کی ذاتی تحقیقات کا سلسلہ جاری رہا۔ انھوں نے بعض خاص برقی تجربات کے سلسلے میں ایک خاص آلہ ایجاد کیا اور مئی ۱۸۹۵ء میں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے روبرو برقیات کے متعلق ایک مضمون پیش کیا جس کا عنوان تھا:

On polarisation of Electric rays by double refracting Crystals

"دُہرے انعطافی منشوروں سے برقی شعاعوں کی تخطیب"

اس کے بعد آپ نے متعدد مضامین اپنی ایجادات کے متعلق رسالہ "الکٹریشن" میں شائع کروائے جن زمانہ میں

سر جگدیش برقی لہروں پر تجربات کر رہے تھے متعدد کاروباری اداروں کے نمائندوں نے آپ سے اس بارے میں گفتگو کی اور کہا کہ امریکہ کے موجد اڈیسن کی طرح اگر سر جگدیش بھی اپنی ایجاد کردہ چیزیں بازار میں لانا پسند کریں تو وہ سرمایہ لگانے کے لئے تیار ہیں لیکن سر جگدیش نے انھیں منظور نہیں کیا۔ برطانیہ اور امریکہ کی حکومتوں نے پروفیسر بوس کو اپنی ایجادات پیٹنٹ کروانے کے حقوق بھی عطا کئے لیکن آپ نے کبھی مادی اور ذاتی فائدہ کی پرواہ نہ کی۔

شعبہ طبیعیات میں تحقیقات کرتے کرتے آپ نے ایک اور سمت کی طرف اپنی توجہات منعطف کردیں اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ ذی روح اور غیر ذی روح دونوں قسم کی چیزوں پر برقی محرکات کا یکساں اثر ہوتا ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۰۰ء میں سائنس کانگریس پیرس میں میکانیکی و برقی محرکات پر اشیا رغیر ذی روح کے اظہار احساسات کی تشریح و توضیح کرتے ہوئے آپ نے اعلان کر دیا کہ غیر ذی روح اشیا بھی زہر سے ہلاک ہو سکتی ہیں۔" بڑے بڑے سائنسدانوں نے اس نظریہ کا مذاق اڑایا لیکن آپ نے عملی تجربات سے یہ ثابت کر دکھایا کہ غیر جاندار اشیا مثل پتھر، لکڑی اور کپڑے تک میں حس موجود ہے انسانوں کی طرح ان میں بھی مسرت کے احساسات پائے جاتے ہیں، ان میں بھی تھکاوٹ محسوس ہوتی ہے اور انسانوں کی طرح انھیں بھی آرام کی ضرورت ہے ان میں بھی اور جاندار اشیا کی طرح عصبی عمل اور ردعمل کی قوت موجود ہے۔ آپ نے اپنے سارے تجربات کا لب لباب اپنی ایک کتاب جس کا نام "ذی روح و غیر ذی روح کا احساس" (Respons in the living and non living) ہے سنہ ۱۹۰۲ء میں شائع کیا۔ یہ کتاب بیحد مقبول ہوئی۔ متعدد زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے اور کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ آپ نے سنہ ۱۹۱۳ء میں ایک آلہ ایجاد کیا جو پودوں کی ذکی الحسی کو ایک سکنڈ کے سویں حصے تک بخوبی نوٹ کر لیتا ہے۔ اس آلہ کی مدد سے آپ نے پودوں پر زہر طاقتور ادویات، منشیات وغیرہ کے اثرات اور اسی کے ساتھ پودوں میں جو اشتعال پیدا ہوتا ہے وہ سب کر دکھائے۔ یہ سب تجربات آپ کی مشہور کتاب (Irritability of plants.) میں موجود ہیں۔ اسی قسم کے تجربات کے لئے ۳۰ نومبر سنہ ۱۹۱۷ء کو آپ نے "بوس انسٹی ٹیوٹ" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جو اب تک قائم ہے اور یہی ایک گرانقدر ترکہ ہے جو انھوں نے چھوڑا ہے۔

آپ کی ان قیمتی تحقیقات کے صلہ میں آپ کو سنہ ۱۹۱۱ء میں دہلی دربار تاجپوشی کے موقعہ پر "کمانڈر آف دی آرڈر آف اسٹار آف انڈیا" کے نشان سے مفتخر کیا گیا۔ مسٹر بوس کو یورپ کے تقریباً تمام جامعات سے تقریر کرنے کے لئے مدعو کیا گیا سنہ ۱۹۱۶ء میں آپ کو سر کا خطاب دیا گیا۔ آپ کو جامعات کلکتہ، الہ آباد، بنارس و لندن سے ڈاکٹر آف سائنس کی ڈگری عطا کی۔

جامعہ ابرڈین نے آپ کو ایل۔ ایل۔ ڈی کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ آپ کو "ویانا سائنس اکیڈمی" کا رکن منتخب کیا گیا اور آپ "فزیکا اٹسالی ادارۂ سائنس" کے رکن بنائے گئے۔ آپ سنہ ۱۹۱۰ء کے بین الاقوامی سائنس کانگریس کے لئے نمایندہ منتخب کئے گئے سنہ ۱۹۰۷ء سنہ ۱۹۱۲ء اور سنہ ۱۹۱۷ء میں یورپ اور امریکہ کے وفد سائنس کے رکن بھی تھے۔ آپ سنہ ۱۹۰۷ء میں "انڈین سائنس کانگریس" کے صدر تھے اور کچھ عرصے تک بین الاقوامی اتحادی کمیٹی اور جمعیت الاقوام کے بھی رکن رہ چکے ہیں۔

غرض سر جگدیش چندر بوس کی وفات سے مادر وطن کا ایک ایسا فرزند رشید جاتا رہا جو بین الاقوامی شہرت کا مالک تھا اور جن کی جگہ پر ہونا بہت محال ہے۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال

مشرق کے مایۂ ناز شاعر اعظم اور عہد حاضر کے واحد فلسفی شاعر سر محمد اقبال کا ۲۱ اپریل سنہ ۱۹۳۸ء کو ترسٹھ سال کی عمر میں بمقام لاہور انتقال ہو گیا۔ ڈاکٹر اقبال کی بے وقت موت مسلمانان عالم کے لئے اور خصوصاً ہندوستان کے حق میں ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ مادر ہند اقبال کی موت پر جتنا غم کرے کم ہے کہ اس کا ایک ہونہار اور قابل فخر فرزند جاتا رہا۔ زبان اردو سوگوار ہے کہ اس کا محسن اعظم اور وہ سرپرست اعلیٰ جس نے ہندوستان کے ادیبوں کو اردو کی خدمت کرنے کے لئے یہ کہہ کر توجہ دلاتے ہوئے کہ ع

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے

آخری دم تک اردو کی خدمت کرتا رہا، ہم سے بچھڑ گیا۔

ایک عالی دماغ تھا، نہ رہا　　　ملک میں اک چراغ تھا، نہ رہا

اسلام اور مسلم دنیا کے حق میں اقبال کی ہستی ایک بیش بہا نعمت تھی اور افسوس ہے کہ وہ اقبال جس نے خدا سے شکوہ کیا اور اس کا پیام بندوں تک پہنچایا، وہ اقبال جس نے گوئٹے کے "سلام مغرب" کا جواب "پیام مشرق" سے دیا، وہ اقبال جس نے باتوں باتوں میں مسلمانان عالم پر رموز بیخودی اور اسرار خودی ظاہر کئے، وہ اقبال جس نے گمراہ اور غافل مسلمانوں کو رجزیہ کلام سنا سنا کر جگایا اور خدا کا یہ وعدہ سنا کر مسلمانوں کو تسلی دی تھی کہ

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں　　　یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

آج ہم میں باقی نہیں اب ہم کو عجمی خم میں حجازی مے پلانے والا ساقی، اور حجازی لے میں ہندی نغمہ سنانے والا کوئی مطرب رہا

اور نہ اُمید ہے کہ ایک زمانۂ دراز تک ہندوستان کو ایسا مایۂ ناز سپوت، اردو اور فارسی ادب کو ایسا بے غرض محسن مشرق کو ایسا بیش بہا فلسفی، مسلمانان عالم کو ایسا بیدار مغز شاعر اعظم، اور جامعہ کیمبرج کو ایسا ہونہار طالب علم نصیب ہو سکے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے　　　بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ولادت اور تعلیم

ڈاکٹر سر محمد اقبال پی. ایچ. ڈی، بار ایٹ لا ۱۸۷۵ء میں پنجاب کے ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے آپ کشمیر کے ایک شریف برہمن گھرانے کے چشم و چراغ تھے جو بعد میں حلقہ بگوش اسلام ہوگیا، ابتدائی تعلیم آپ نے مقامی مکتب میں پائی اور پھر انگریزی تعلیم کے لئے مدرسہ فوقانیہ میں شریک رہے جہاں اپنی خداداد قابلیت اور ذہانت طبع کی وجہ سے آپ بہت جلد ممتاز ہوگئے، آپ کی اوائل عمر کی خداداد ذہانت کا پتہ حسب ذیل واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے۔ ایک مرتبہ مسٹر اقبال مدرسہ میں دیر سے داخل ہوئے۔ فاضل استاد نے پوچھا کیا بات ہے اقبال جو تم ہمیشہ دیر سے آتے ہو؟ اقبال نے فوراً برجستہ جواب دیا "قبلہ اقبال ہمیشہ دیر ہی سے آیا کرتا ہے"

انٹرنس کامیاب کرنے کے بعد اقبال سیالکوٹ کالج میں شریک ہوئے جہاں خوش قسمتی سے آقبال کو علوم مشرقی کے علامہ شمس العلما، سید میر حسن جیسا اُستاد ملا موصوف کی تعلیم کا یہ خاصہ تھا کہ جو کوئی ان سے فارسی یا عربی پڑھتا اس کی طبیعت میں ابتدا ہی سے زبان کا صحیح مذاق پیدا کردیتے چونکہ اقبال کی طبیعت میں ابتدا ہی سے علم و ادب سے قدرتی مناسبت تھی اس لئے مولوی صاحب کا تلمذ سونے پر سہاگہ ہوگیا اور ابھی اسکول ہی میں تھے کہ کلام موزوں زبان سے نکلنے لگا ابتدائی اصلاح آپ نے داغ مرحوم سے لی اور داغ ہمیشہ اقبال پر فخر کیا کرتے تھے۔ سیالکوٹ کالج میں انٹرمیڈیٹ کامیاب کرنے کے بعد بی۔ اے کے لئے اقبال کو لاہور آنا پڑا جہاں اقبال جیسے فلسفہ پسند طالب علم کو سر ٹامس آرنلڈ جیسا پروفیسر ملا یہی سلسلہ تلمذ اقبال کو انگلستان کھینچ لے گیا۔ کیمبرج میں اقبال کو ڈاکٹر میگ ٹیگرٹ براؤن نکلسن اور مارلی جیسے اساتذہ ملے پروفیسر نکلسن نے اقبال کی مشہور فارسی نظم "اسرار خودی" کو انگریزی کا جامہ پہنایا۔

گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے ہونے کے بعد اقبال اورنٹیل کالج لاہور میں تاریخ و فلسفہ کے لکچرار مقرر ہوئے کچھ عرصے گورنمنٹ کالج میں فلسفہ کے پروفیسر رہے اسی زمانہ میں آپ نے اپنی پہلی تصنیف "علم الاقتصاد" لکھی گورنمنٹ کالج لاہور سے آپ اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ روانہ ہوئے جہاں جامعہ کیمبرج سے ایم. اے کی ڈگری حاصل کی وہاں سے آپ جرمنی روانہ ہوئے جہاں جامعہ میونخ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی آپ کا مضمون "فلسفہ ایران" تھا۔ ڈاکٹر ہونے کے

بعد آپ نے لندن میں اسلام پر چھ لکچر دیئے۔ چونکہ پروفیسر آرنلڈ رخصت پر تھے اس لئے جامعہ لندن نے عربی کی پروفیسری کے لئے منتخب کیا۔ آخر کار ۱۹۰۸ء میں اپنے وطن ہندوستان لوٹ آئے۔

شاعری جس زمانہ میں گورنمنٹ کالج لاہور کے آپ پروفیسر تھے اسی زمانہ میں علمی مشاغل کی کثرت کی وجہ سے آپ فی البدیہہ اشعار کا دریا بہاتے تھے۔ آواز میں بلا کا سوز و گداز تھا جب کبھی آپ پڑھتے تو خود بھی وجد کرتے اور محفل کو بھی وجد میں لاتے۔ ابتدا ابتدا میں اقبال وطن پرست اور ہندی شاعر تھے۔ آپ کا نظریہ تھا ؎

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

لیکن سفر یورپ کے بعد آپ پان اسلامزم کے قائل ہوگئے اور اسلام و اسلامی خدمت کو اپنا شعار بنالیا۔

خدمت اسلام اقبال نے اپنے اشعار کے ذریعہ اسلام کی جتنی خدمت کی شاید ہی کسی لیڈر یا واعظ نے کی ہو انجمن حمایت الاسلام کے سالانہ جلسہ میں جب آپ نے اپنی معرکۃ الآرا نظم "شکوہ" سنائی تو اس نظم نے مسلمانوں کی کایا پلٹ دی ممکن تھا مولوی قسم کے لوگ اس پر کفر کا فتوی صادر کردیتے اگر آپ جواب شکوہ سے ان کو ٹھنڈا نہ کردیتے۔

تقاریر دسمبر ۱۹۲۸ء میں اقبال مدراس میں تقریر کرنے مدعو کئے گئے وہیں سے آپ حیدرآباد تشریف لائے جہاں آپ سرکاری مہمان تھے آپ نے یہاں ٹاؤن ہال میں معرکۃ الآرا تقاریر کیں۔ ۱۸ر جنوری ۱۹۲۹ء کو آپ نے مہاراجہ کشن پرشاد سے ملاقات کی اور ۱۹۳۳ء میں آپ شاہ نادر شاہ غازی والی افغانستان کی دعوت پر افغانستان روانہ ہوئے

اعتراف خدمات گورنمنٹ نے آپ کی قابلیت کا اعتراف کرتے ہوئے آپ کو "سر" کا خطاب دیا اور آپ گول میز کانفرنس کے نمائندہ منتخب ہوئے۔ آپ پنجاب لیجسلیٹیو اسمبلی کے رکن رہ چکے ہیں علی گڈھ سے ۱۹۳۴ء میں الہ آباد نے ۱۹۳۷ء میں اور جامعہ عثمانیہ نے ۱۹۳۸ء میں آپ کو ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگریاں عطا کیں۔

تصانیف اردو اور فارسی میں آپ کی کئی تصنیفیں ہیں جن میں بانگ درا، علم الاقتصاد، بال جبریل، ضرب کلیم، حیات جاوید اور مسافر قابل ذکر ہیں۔ فارسی میں اسرار خودی، رموز بیخودی اور "پیام مشرق" آپ کے شاہکار تصانیف ہیں۔

آخری الفاظ آپ کے آخری الفاظ ہیں۔ "میں موت سے نہیں ڈرتا میں مسلمان ہوں اور خندہ پیشانی کے ساتھ

موت کا خیر مقدم کرتا ہوں"۔ یہ کہہ کر آپ اپنے قدیم ملازم الٰہی بخش کی گود میں ہمیشہ کے لئے سو گئے۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نو رستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

کمال آتاترک

مادر اسلام کا ایک لاڈلا سپوت، ترکوں کا قائد اعظم اور مسلمانان عالم کا واحد مرکز اُمید غازی مصطفےٰ کمال آتاترک ۱۰ ر نومبر بروز پنجشنبہ ۱۲ بجکر ۲ منٹ پر انتقال کر گئے۔ اسلام کے حق میں غازی موصوف کی موت خصوصًا ایسے وقت میں جبکہ فلسطین کا کوئی خوشگوار حل اور منصفانہ تصفیہ نہیں ہوا تھا اور سب کی آنکھیں مسلمانوں کے واحد نباض پلیب پر لگی ہوئی تھیں، ایک ناقابل تلافی نقصان ہے، ترکی غازی موصوف کی موت پر جتنا بھی ماتم کرے کم ہے کیونکہ وہ کمال جس کی پدرانہ رہنمائی میں ترکی نے دن دونی رات چوگنی ترقی کی، وہ کمال جس نے ترکی کے ڈوبتے ہوئے بیڑے کو آخری وقت میں ناخدائی کے فرائض انجام دے کر سنبھالا، وہ کمال جس کے بغیر خدا معلوم آج ترکی کا کیا حال ہوتا، ترکی کو ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دے گیا۔ ترکی یتیم ہو گیا کیونکہ ترکوں کا باپ آج ان سے جدا ہو گیا۔ جنگ عظیم کے قبل ترکی پر یورپ ہنسا کرتا تھا مصطفےٰ کمال نے یہ ثابت کر دکھلایا کہ جسے وہ یورپ کا مرد بیمار تصور کیا کرتے تھے وہ حقیقت میں مرد توی ہے۔ ترکی کی گذشتہ صدی کی تاریخ میں نہ ایسی عجیب وغریب ہستی پیدا ہوئی نہ پیدا ہونے کی اُمید ہے چند سال قبل برطانوی سفیر نے آتاترک سے کہا تھا کہ آپ کے بعد ترکی کا کیا حال ہوگا؟ غازی موصوف نے جواب دیا "ترکی میں ہزار آتاترک موجود ہیں"، سفیر نے جواب دیا آپ ہزار مرتبہ مبالغہ سے کام لے رہے ہیں"۔ ایسے وقت جبکہ چراغ خلافت ٹمٹما رہا تھا، ترکی موت وزیست کی کشمکش میں ایڑیاں رگڑ رہی تھی، بیرونی اقتدار ساری ترکی پر چھایا ہوا تھا اور اُمید تھی کہ یورپ کے نقشہ سے ترکی کا نام ونشان تک مٹ جائے گا، ٹھیک ایسے وقت مصطفےٰ کمال پیدا ہوئے اور انھوں نے مسیحا بن کر ترکی کے بے جان جسد خاکی میں روح پھونک دی۔

مختصر حالات زندگی

۱۱ر مارچ ۱۸۸۱ء کو سالونیکا کے محکمۂ محصول کے ایک چھوٹے افسر رضا علی کے یہاں محترمہ زبیدہ خانم کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کی قسمت میں ایک دن ترکی کے سیاہ وسفید کا مالک ہونا تھا۔ والدین نے اس لڑکے کا نام مصطفےٰ رکھا۔ چند دنوں بعد والد کا انتقال ہو گیا اور زبیدہ خانم اس دنیا میں اکیلی رہ گئیں لیکن

انھوں نے اپنے لڑکے کی اس طرح پرورش کی کہ آج دنیا اُن کے حسنِ تربیت کی داد دینے پر مجبور ہے مصطفیٰ کمال اپنے بچپن کے حالات یوں لکھتے ہیں :-

"والد مرحوم مصر تھے کہ میری تعلیم مغربی طریقے پر ہو لیکن والدہ کا یہ کہنا تھا کہ دینی تعلیم دی جائے آخر کار والدہ کامیاب ہوئیں اور طے یہ پایا کہ تعلیم سے قبل قرآن کریم پڑھایا جائے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ بسم اللہ کی رسم کے دن مجھے اچھے کپڑے پہنائے گئے عمدہ کھانے پکوائے گئے اور ایک حافظ مع شاگردوں کے ہمارے گھر تشریف لائے، نماز ظہر کے بعد تسمیہ خوانی ہوئی اور میرا جلوس نکالا گیا۔ واپسی پر شام کے وقت میں نے دیکھا کہ میری والدہ سربسجود ہو کر رب العزت سے گڑگڑا کر دعا مانگتی تھیں کہ اے مشرق و مغرب کے بادشاہ میرے اکلوتے لڑکے کی عمر دراز کیجو اور اس سے اسلام کی وہ خدمت لیجو کہ قومیں اس پر ناز کریں"۔

میٹرک کامیاب کرنے کے بعد وہ ملٹری کالج میں شریک ہوگئے جہاں آپ کے ایک ہمنامی پروفیسر نے آپ کی ذہانت کو دیکھ کر کہا کہ یہ لڑکا بڑا ہو کر دنیا میں کمال پیدا کرے گا۔ اسی دن سے کمال مصطفیٰ کمال کا جزو نام ہوگیا۔ آپ مزید تعلیم کے لئے قسطنطنیہ جنگی کالج میں بھیجے گئے، وہاں سے فارغ ہو کر لفٹنٹ بنائے گئے آپ نے جب سیاست ترکی کا مطالعہ کیا تو اس نتیجہ پر پہنچے کہ ترکی کی ساری بدامنی اور کمزوریوں کی واحد وجہ خلافت ہے چنانچہ آپ نے خلافت کے خلاف تقاریر کیں اور ۱۹۰۵ء میں گرفتار ہوئے۔ رہائی کے بعد مصطفیٰ کمال نے ایک انجمن کی بنیاد ڈالی جس کا نام "وطن" تھا خفیہ پولیس نے اس انجمن کا پتہ چلالیا اور مصطفیٰ کمال گرفتار دمشق بھیجے گئے لیکن وہاں بھی آپ نے اپنا پروپگنڈہ نہ چھوڑا۔ رفتہ رفتہ وطن کو کافی اقتدار حاصل ہوگیا اور آخر کار سپہ سالار شوکت پاشا کی معیت میں خلیفہ کے مخالفین اور کمال پاشا نے ایک بڑی فوج ہمراہ لے کر قسطنطنیہ پر دھاوا بول دیا نتیجۃً سلطان عبدالحمید خاں معزول کردیئے گئے اور ان کی جگہ ان کے بھائی محمد ارشاد خلیفہ ہوئے ۱۹۱۰ء میں انھیں پیرس میں بطور فوجی نمایندہ بھیجا گیا بعد میں آپ رائل ملٹری کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے وہاں آپ نے طلبا میں آزادی کی روح پھونک دی۔ ۱۹۱۲ء میں جب اطالیہ نے طرابلس الغرب پر حملہ کیا تو فوج کی کمان آپ نے لی اور اطالویوں کے دانت کھٹے کر دیئے۔

۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم چھڑ گئی، مصطفیٰ کمال ترکی کے جنگ میں شرکت کے مخالف تھے لیکن کسی نے آپ کی نہ سنی ۲۰ جنوری کو جب حلیفوں کو بری طرح شکست ہوئی تو مجبوراً کمال کو بھیجا گیا۔ آری بردن میں وہ شاندار فتح ہوئی کہ گیلی پولی کی تاریخ کے صفحات ان کی جانفشانیوں سے پر ہیں اس فتح کے بعد آپ کو پاشا کا خطاب دیا گیا۔

۱۵ مئی کو سمرنا کے قبضہ کے وقت یونانیوں نے ترکوں پر بری طرح مظالم توڑے مصطفٰے کمال نے کھلم کھلا اتحادیوں کی مخالفت کی اس کی بنا پر مصطفٰے کمال باغی قرار دیے گئے اور آپ کے سر کی قیمت تین لاکھ مقرر کی گئی۔ وہ چھپتے چھپاتے اناطولیہ پہونچے فوجی تنظیم کی اور ملک میں برقی پیغام دوڑا دیے کہ ترکی صرف ترکوں کے لیے ہے، ایک انچ زمین بھی غیروں کے قبضہ میں نہ جائے، قوت ارادی کا کمال دیکھیے کہ ایسا ہی ہوا۔ ۱۹۱۹ء کے آخر میں انھوں نے مجلس مشاورت کی اور مشورے سے آپ صدر منتخب ہوئے۔

سلطان المعظم نے ان پر فوج کشی کی مگر شکست کھائی۔ ادھر یونانیوں نے موقعہ جان کر ترکی پر چڑھائی کی مگر آپ نے انھیں بمقام سکاریہ شکست دی۔ قوم نے اس پر آپ کو غازی کا خطاب دیا۔ ۱۹۲۲ء میں خلیفہ وحیدالدین کا انتقال ہوا اور سلطان عبدالمجید خاں خلیفہ بنے چند دنوں بعد ہی جمہوریت کا اعلان ہوا اور پہلے صدر جمہوریہ کمال منتخب ہوئے۔ سلطان کی معزولی یقینی تھی۔

عجب کیا رب کی اس قدرت پہ گر مسلم کو حال آئے　　خلافت کو زوال آئے تو ساتھ اُس کے کمال آئے

مصطفٰے کمال کا ایک اور کارنامہ انقرہ کی تعمیر ہے جو دار السلطنت ترکی ہے یہ دنیا کا حسین ترین شہر ہے۔ ترکی میں جملہ چار جامعات ہیں حال ہی میں زرعی کالج کا قیام بھی عمل میں آیا۔ مصطفٰے کمال نے عورتوں کو مکمل آزادی اور حق رائے دہی عطا کی۔ فیض ٹوپی کا رواج اڑا دیا، ہیٹ قومی ٹوپی قرار دی، تعداد ازدواج گھٹا کر ایک کر دی اور رسم الخط تبدیل کر دیا جنگ کے بعد انھیں بہادر شریف دشمن کا خطاب دیا گیا۔ بیسویں صدی شاید ہی ایسی عظیم ترین ہستی پیدا کر سکے۔

کم ہے جتنا رویئے قسمت پہ ایسی قوم کی
چھن گیا ہو سال بھر میں جس کا اقبال و کمال

ضیا (عثمانیہ)

مولانا شوکت علی

ابھی اقبال کی موت پر ہمارے بہائے ہوئے آنسو خشک بھی نہ ہونے پائے تھے اور ابھی اتاترک کی موت کا زخم دل پر تازہ ہی تھا کہ مسلمانوں کا ایک اور قائد اعظم جاتا رہا یعنی مرحوم مولانا محمد علی جوہر کے برادر بزرگ اور بی اماں کے لاڈلے لال مولانا شوکت علی کا ۲۷ نومبر ۱۹۳۸ء بروز یکشنبہ بمقام دہلی ۶۶ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا مرنے کو تو ہزاروں ہستیاں مرتی ہیں لیکن بعض ایسے افراد بھی ہوتے ہیں جن کی زندگی پر قوم کی زندگی اور موت پر قوم کی موت کا انحصار ہوتا ہے۔ انھیں میں سے ایک مرحوم مولانا شوکت علی تھے۔

حالات زندگی ۱۰ مارچ ۱۸۷۳ء بمقام رام پور مولانا شوکت علی مرادآباد کے ایک جاگیردار مولانا عبدالعلی خاں کے

مکان میں فخر نسواں بی اماں مرحومہ کے بطن سے پیدا ہوئے۔ آپ مولانا محمد علی جوہر سے پانچ سال عمر میں بڑے تھے ابھی آپ سات سال کے اور جوہر دو ہی برس کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا لیکن خوبی قسمت سے آغوش مادر سے جدا نہیں ہوئے۔ بی اماں مرحومہ نے جس بے نظیر استقلال و ایثار سے کام لے کر اپنے صاحبزادوں کو انگریزی تعلیم دلائی وہ تاریخ نسائیت کا یقیناً ایک اہم باب ہے معمولی اُردو فارسی تعلیم تو مکان میں ہوئی پھر بریلی ہائی اسکول میں داخل ہوئے اس زمانہ میں سرسید کے مدرسۃ العلوم کا گھر گھر میں شہرہ تھا اسی زمانہ میں عجیب سحر آفریں فضا علی گڈھ میں قایم کی تھی۔ سینکڑوں مرزا پھویا علی گڈھ میں داخل ہوئے لیکن جب وہاں سے نکلے تو تیز و طرار بن کر۔ اس فضا میں مولانا مع اپنے چھوٹے بھائی کے علی گڈھ میں داخل ہوئے اور وہاں جانے کے بعد یہ بھی خالص علی گڈھ کے کھلنڈرے بن گئے۔ آپ بہ حیثیت ایک کرکٹ کے کھلاڑی کے بہت جلد ممتاز ہو گئے اور وہاں کے کرکٹ کپتان بنائے گئے۔ یہ کس درجہ کا عہدہ تھا اسے مولانا سجاد حیدر یلدرم سابق رجسٹرار مسلم یونیورسٹی سے سُنئے :۔

"شوکت علی خاں کرکٹ کے کپتان ہیں اور کرکٹ کا کپتان اس وقت علی گڈھ میں اپنی قلمرو (بورڈنگ) کا مسولینی ہے۔ طلبہ اس کے تابع فرمان، پروفیسر اس کا اقتدار ماننے والے کپتانی اوروں نے بھی کی ہے اور کر رہے ہیں لیکن شوکت علی کی کپتانی یادگار زمانہ ہے۔ اسی نے کپتان کے کمرہ کو ایک دربار کی حیثیت دی تھی وہ کمرہ ایک ہی وقت میں دربار شاہانہ اور بزم احباب بنا رہتا تھا۔ جونیر طلبہ کے استغاثے وہاں سُنے جاتے تھے اور فیصل ہوتے تھے۔ ان استغاثوں کی ساعت کے وقت کمرہ میں اور شام کو کمرہ کے باہر صحن میں احباب کا جمگھٹا رہتا تھا جو کبھی کبھی اس لئے کہ مسولینی ہر وقت ان سے کام نہیں لیتا تھا۔ جیوری کے فرائض بھی ادا کرتے۔"

علیگڈھ کالج میں کرکٹ کے ایک کھیل کے دوران میں آپ نے کرکٹ کے بلے کو اتنا اونچا مارا تھا کہ وہ علیگڈھ کی سب سے اونچی عمارت مسجد کے مینارے سے بھی دو گز اونچا ہو کر کہیں گرا اور اب تک لاپتہ ہے تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آپ سرکاری محکمہ افیون میں ملازم ہو گئے اور سترہ سال تک خدمت بخیر و خوبی ادا کی۔

پبلک کی خدمت کرنے کا جذبہ جب پیدا ہوا تو آپ مستعفی ہو گئے اور "انجمن خدام کعبہ" کی بنیاد ڈالی۔ فضیلت مآب سر آغا خان کے ساتھ آپ نے علی گڈھ کالج کے لئے چندہ جمع کرنے سارے ہندوستان کا دورہ کیا جس وقت سنہ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم چھڑ گئی اس وقت مولانا محمد علی مرحوم اور آپ نظر بند کر دیے گئے کچھ دنوں چھندواڑہ جیل میں رہے اور

کچھ دنوں بیتول جیل میں ۔ ۱۹۱۹ء میں جب انڈین نیشنل کانگریس کا امرتسر میں اجلاس تھا علی برادران رہا کئے گئے ۔ ترکی پر برطانیہ کے مظالم کے دوران میں آپ نے تحریک خلافت کا آغاز کیا۔ پھر گاندھی جی کے عدم تعاون کی تحریک میں جو یکم اگست ۱۹۲۰ء سے شروع ہوئی تو علی برادران نے جتنا سرگرم حصہ لیا شاید ہی کسی اور نے لیا ہو۔

ستمبر ۱۹۲۱ء کو علی برادران مرحوم، مولانا حسین احمد، ڈاکٹر کچلو، شنکرا چاریہ وغیرہ کراچی میں گرفتار ہوئے اور دو سال قید بامشقت کی سزا سنی۔ کراچی جیل میں کچھ دنوں گذارنے کے بعد راجکوٹ جیل میں آپ کی تبدیلی ہوئی لیکن آپ کے قید ہونے سے تحریک خلافت اور زور پکڑ گئی۔ اس زمانے میں لوگ عام طور پر گاتے ۔

بولیں اماں محمد علی کی ساتھ تیرے ہیں شوکت علی بھی

جان بیٹا خلافت پہ دیدو جان بیٹا خلافت پہ دیدو

رہائی کے بعد علی برادران نے کانگریس کے اقتدار کے لئے ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا۔ اسی زمانہ میں مولانا محمد علی کانگریس کوکناڈا کے صدر تھے۔ نہرو رپورٹ شائع ہونے کے بعد بعض باتوں میں کانگریس سے اختلاف ہوگیا تھا جس کی بنا پر علی برادران کانگریس سے علیحدہ ہوگئے ۔ اسی زمانہ میں کسی نے آپ سے پوچھا تھا کہ کانگریس کے آپ کب سے حامی تھے تو آپ نے اپنا مشہور مزاحیہ شعر پڑھا تھا کہ ؎

کہتے ہیں قدیمی جسے، میں یار ہوں تیرا
زلفیں بھی نہ تھیں جب سے گرفتار ہوں تیرا

آپ گول میز کانفرنس میں بہ حیثیت ہندوستانی نمایندہ منتخب کئے گئے اور ابن سعود کی دعوت پر موتمر عالمی میں شرکت کرنے عرب روانہ ہوئے۔ واپسی میں آپ نے حجاز، مصر، فلسطین، شام، یمن وغیرہ کی سیر کی ۱۹۳۳ء میں اسلام پر تعارف کرنے آپ کو امریکہ مدعو کیا گیا تھا جس وقت سے آپ کے چھوٹے بھائی کا انتقال ہوا اس وقت سے آپ بہت خاموش ہوگئے تھے اور سیاسات میں سرگرمی سے حصہ لینا چھوڑ دیا تھا لیکن ۱۹۳۴ء میں آپ مجلس مقننہ کے رکن منتخب ہوئے اور آخری دم تک رہے ۔ چند سال سے آپ مسلم لیگ کے ایک پرجوش رکن تھے ۔ آپ نے اخبار خلافت کا آغاز کیا اور آخر تک اس کے ایڈیٹر رہے ۔

شہزادگان حیدرآباد کی آل عثمان سے شادی آپ ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھی چنانچہ مرحوم کو حکومت

حیدرآباد سے ڈھائی سو روپیہ وظیفہ مقرر تھا۔ مولانا مسلم یونیورسٹی بورڈ کے رکن تھے اور علی گڈھ میں اولڈ بائز لاج کا قیام آپ ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے جب کبھی موصوف علی گڈھ جاتے تو وہیں ٹھیرتے۔

آپ ایک کامیاب قائد، کامیاب مقرر اور کامیاب اڈیٹر تھے، مولانا قائد ملت، مرد مجاہد اور جنگ آزادی کے بہادر سورما تھے

اٹھ گئیں دنیا سے یارب کیسی کیسی ہستیاں
روئیے کس کس کو اور کس کس کا ماتم کیجئے

محمد حبیب اللہ اوج

اِلتجا

اک ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز
ایک مدت سے ہے خاموش ربابِ ہستی
کروٹیں لیتا ہی رہ رہ کے شبابِ ہستی
حالِ قصۂ غمگیں ہے کتابِ ہستی
آ سکا دامنِ ساحل سے حبابِ ہستی
اک ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز
جلوۂ ہوش کو بیگانہ بنانے والے
زندگانی کو اک افسانہ بنانے والے

حسن کی شمع کو پروانہ بنانے والے
مطربِ روح کو مستانہ بنانے والے
اک ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز

موج زن دل میں ہے ارمان تمناؤں کا
طالبِ نور ہے ایوان تمناؤں کا
پرزے پرزے ہے گریبان تمناؤں کا
نہیں ملتا کوئی عنوان تمناؤں کا
اک ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز

نغمے بیچین ہیں مدہوش بنانے کے لئے
بزمِ ہستی کو بلانوش بنانے کے لئے
شاخِ امید کو گل پوش بنانے کے لئے
منظرِ ہوش کو بیہوش بنانے کے لئے
اک ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز

عزیز احمد

زیر زمین پانی کا عمل

زیر زمین پانی سے پانی کا وہ حصہ مراد ہے جو زمین اور طبقہ زیر زمین میں جذب ہوتا ہے بارش کا تمام پانی بہہ کر ندی یا دریا میں داخل نہیں ہو جاتا بلکہ ایک معتد بہ حصہ زمین میں جذب ہوتا ہے اور یہ جذب ہو کر زیر زمین تھلے میں اسی رُخ بہے گا جس طرف کہ اندرونی پہاڑ کا سلوپ ہو۔ اس میں پانی کا وہ حصہ بھی شمار میں آئے گا جو پہاڑ کے بناوٹ کے وقت ان کے مساموں میں موجود تھا جس کو "کونیٹ واٹر" کہتے ہیں اور وہ بھی پانی جو ماگما میں پایا جاتا ہے جس کو "ماگماٹک واٹر" کہتے ہیں۔

وہ کون سی چیزیں ہیں جو زیر زمین پانی کو اپنے قبضہ میں رکھتی ہیں۔

(۱) ترسیب کی مقدار

(۲) شرح ترسیب۔ بارش کا زائد ہونا اس کے لئے موافق صورت ہے

(۳) مقام کی ٹوپوگرافی۔ سلوپ زاید ہے یا کم

(۴) زمین۔ طبقہ زیرین زمین اور پہاڑ کی ساخت یعنی ان کی مسامداری پر

(۵) شگاف کی تعداد اور مقام وقوع۔

اگر پانی ایسی زمین میں جذب ہو جس کے زیرزمینی طبقے پانی میں حل پذیر ہوں مثلاً چونا۔ اس صورت میں پانی زیرزمینی طبقہ میں ایک عرصے تک محفوظ رہے گا۔ ایسے اونچے مقامات جو خاصے سلوپ رکھتے ہیں ان پر سے پانی جذب ہونے کی بجائے فوراً بہہ جائے گا۔ جب زمین مسطح ہوتی ہے یا اس کا سلوپ بہت ہی کم ہوتا ہے تو پانی کی روانی کی رفتار سست ہو جاتی ہے جس کی وجہ خاصہ پانی جذب ہو جاتا ہے۔ زیرزمینی طبقے اگر مسامدار ہوں یا غیر مسامدار ہونے کی صورت میں ان میں شگاف اور جوڑ ہوں تو پانی آسانی سے داخل ہو گا۔ یہ صورتیں عموماً رسوبی حجرات میں پائی جاتی ہیں۔ آتشی حجرات مسامدار نہیں ہوتے لیکن ان میں پانی جوڑوں کے ذریعے داخل ہوتا ہے۔ مسامدار پہاڑوں میں جتنے مسام زائد ہوں گے اور غیر مسامدار میں جتنے جوڑ زائد ہونگے اتنا ہی زائد پانی داخل ہوگا آتشی اور رسوبی حجرات میں بارش کے پانی کے علاوہ شبنم کا پانی بھی جذب ہوتا ہے۔

پانی زمین کے نیچے پہنچنے پر اس کا کیا حشر ہوتا ہے؟

(۱) ممکن ہے کہ وہ پھر زمین کے اوپر چشمہ کے ذریعہ آجائے۔

(۲) پہاڑوں کے مساموں کے ذریعہ وہ بخارات کی شکل میں اوپر آکر پانی میں پھر تبدیل ہو جائے۔

(۳) زیرزمینی راستوں سے وہ سمندر تک پہنچ جائے۔

(۴) نباتات اسے استعمال میں لائیں اور پھر وہ بخارات بن کر ہوا میں مل جائے۔

(۵) مختلف جمادات جو پہاڑوں میں ہوتے ہیں ان سے مل کر کوئی کیمیائی عمل کرے۔

(۶) ممکن ہے کہ وہ ایک غیر مقررہ مدت تک پہاڑ ہی میں رہ جائے۔

ایک سائنس داں "جان مورے" کئی سال تک مختلف تجربے کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ بارش کا پانی ۷۵ فی صد زمین میں جذب ہوتا ہے۔

پانی پہاڑوں کے مساموں اور اس کے شگافوں کے ذریعہ اندر داخل ہوتا ہے اور یہ پانی زمین کی ایک خاص سطح کو سیراب کرتا ہے اور اس کے اوپر کی سطح صرف نم ہوتی ہے۔ اس سطح کو جہاں نم اور سیراب حصہ ملتا ہے اس کو سطح آب کہتے ہیں یہ سطح آب مختلف مقامات پر مختلف عمق پر واقع ہوتا ہے اسی وجہ باولیات کا عمق مختلف ہوا کرتا ہے۔ کبھی تو دو چار فٹ زمین کھودنے پر ہی پانی حاصل ہو جاتا ہے اور کبھی اس سے کئی گنا زائد کھودنا پڑتا ہے۔ نیچے کی سطح چاہے جو کچھ بھی ہو لیکن پانی کی سطح ہمیشہ ہموار ہوگی۔

John Murray

پانی کی زمین اور زیر زمین طبقے میں داخل ہونے کی حرکت۔ پہاڑوں کی شکستگی، شگاف اور ان کی مسامداری پر منحصر ہے۔ ماہرین ارضیات یہ تعین کرتے ہیں کہ ایک خاص گہرائی پر پہاڑ کے تمام مسام دباؤ کی وجہ بند ہو جاتے ہیں۔

زیر زمینی پانی کے حرکات دو عنصر پر منحصر ہیں

(۱) پہاڑوں میں شکستگی اور جس پہاڑ میں سے پانی بہہ رہا ہو اس میں شگاف کی موجودگی۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جس پہاڑ میں زائد شکستگی اور شگاف ہوں گے اس میں زائد پانی داخل ہوگا اور جس پہاڑ میں یہ چیزیں نہ ہوں پانی داخل نہیں ہوتا۔

(۲) پہاڑوں میں مساموں کی موجودگی۔ مثلاً ریت اور مٹی میں خاصے مسام ہوتے ہیں جس کی وجہ پانی کی معتدبہ مقدار زمین داخل ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں ایسے پتھر موجود ہوں اگر وہاں باولی کھودی جائے تو پانی بہت جلد حاصل ہو جاتا ہے۔ مگر ریت کے پتھر اور مٹی کے پتھر میں پانی کم جذب ہوتا ہے کیونکہ یہ دباؤ کے تحت ٹھوس ہو جانے پر ان میں کے مسام چھوٹے اور کم ہو جاتے ہیں۔ ان مثالوں پر غور کرنے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ رسوبی پتھروں میں زائد مسام ہوتے ہیں۔ آتشی اور کایا بدل حجرات میں بعض اوقات ہی مسام پائے جاتے ہیں ورنہ بالکل نہیں۔

زیر زمین پانی کا سب سے اہم کام مختلف مادوں کو حل کرنا ہے جس کی وجہ سے غار تیار ہوتے ہیں اس عمل سے تیار کردہ غار انگلینڈ اور فرانس میں بہ کثرت دیکھنے میں آتے ہیں۔ جب اس قسم کے غار چونے کے پہاڑوں میں تیار ہوتے ہیں تو ان غاروں میں کاربونیٹ ایک خاص آویزی ساخت میں جمع ہو جاتا ہے۔ جب یہ چھت سے لٹکتا ہے تو اس کو اسٹالکٹائیٹ اور اگر سطح پر جمع ہو تو اسٹالگمائیٹ کہتے ہیں۔

چشمے اور باولیات کی تیاری

اگر کسی مقام پر اوپر کی تہہ مسامدار ہو اور نیچے کی تہہ غیر مسامدار تو بارش کا پانی مسامدار سطح کے ذریعہ داخل ہو کر غیر مسامدار پرت کی سطح پر جمع ہو جائے گا ایسے مقامات پر کنواں کم خرچ پر تیار ہو جائے گا۔

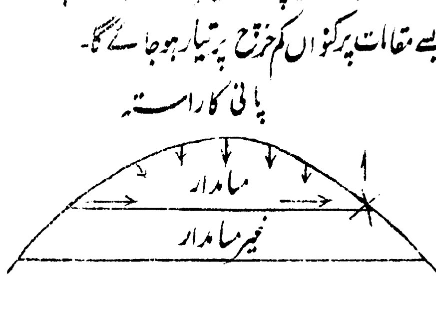

اگر اندرونی پہاڑوں کا سلوپ مغرب سے مشرق کی طرف ہو تو اندرونی داخل شدہ پانی بھی اسی رُخ بہے گا اور مقام اوپر ایک چشمہ تیار ہو جائے گا۔

اگر اوپر کی سطح غیر مسامدار ہو اور اس کے نیچے کی سطح مسامدار اور پھر اس کے نیچے کی پرت غیر مسامدار تو پانی مسامدار سطح سے داخل ہو کر نیچے کی غیر مسامدار سطح پر جمع ہو جائے گا۔ اگر ایسے مقامات پر کنواں تیار کیا جائے تو بہ نسبت پہلی صورت کے زائد عمیق ہوگا۔ چشمہ اسی طرح تیار ہوگا جیسا کہ پہلی صورت میں۔

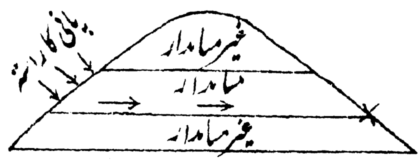

انگلستان کے اکثر چشمے چاک میں تیار رہتے ہیں اور عموماً چاک کے نیچے حجرات غیر مسامدار ہیں۔ ان مختلف قسم کے حجرات کا حجم مختلف مقامات پر مختلف ہوتا ہے۔

اگر زیر زمین طبقہ میں کوئی اختلال ہو جس کی وجہ اس کے ایک جانب غیر مسامدار پہاڑ ہوں اور دوسری جانب مسامدار تو پانی مسامدار پرت میں داخل ہو کر اختلال کے مقام سے چشمہ کی شکل میں اوپر نکل آئے گا۔

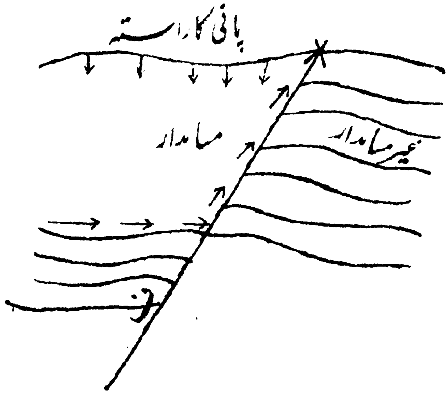

زیر زمین پانی پر خاصہ دباؤ ہونے سے جہاں کہیں سے بھی اس کو باہر نکلنے کا موقع ملتا ہے وہ قوت سے ایک چشمہ کی شکل میں باہر نکل آتا ہے۔

باولیات کے کھودنے میں مسامدار اور غیر مسامدار پہاڑ کا اور ان حجرات کے سلوپ کا خیال رکھنی چاہئے مثلاً

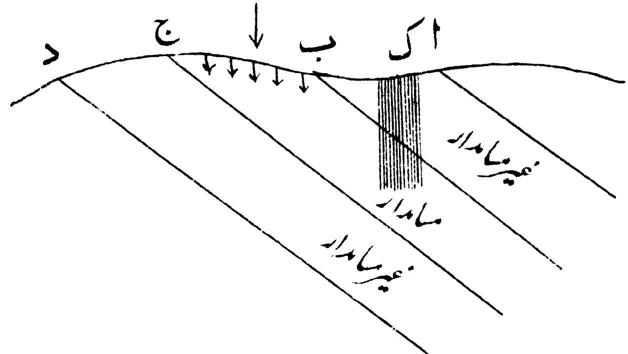

اب - ب ج - ج د - پہاڑوں کے تین پرت ہیں جو ایک خاص سلوپ اور حجم رکھتے ہیں اب اور ج د غیر مسامدار ہیں لیکن ب ج مسامدار اسی پرت میں پانی جذب ہوگا اور دوسرے دو پرت میں نہیں۔ ان مقامات پر جہاں اس قسم کے پہاڑ واقع ہوں اگر مقام ک پر باولی کھودی جائے تو اب پرت میں پانی نہیں ملے گا لیکن اس کو عبور کرنے کے بعد جب ب ج پرت تک کھودا جائے گا تو تب پانی حاصل ہوگا۔ عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ اکثر باولیات صرف اب پرت میں کھودی جا کر چھوڑ دی جاتی ہیں اور یہ خیال بھی کیا جاتا ہے کہ اس میں پانی نہیں ہے لیکن ماہر ارضیات یہ بتلا سکتا ہے کہ اس مقام پر پانی ضرور ہے جس کے حاصل کرنے کے لئے باولی گہری کھودنا پڑے گا۔

ایسے مقامات پر جہاں کے پہاڑ ہم میلان کی شکل اختیار کریں اگر یہاں کوئی باولی کھودی جائے تو اس میں کافی پانی حاصل ہوگا کیونکہ یہاں پانی دو مقامات سے اندر داخل ہو کر ہم میلان میں جمع ہو جائے گا۔

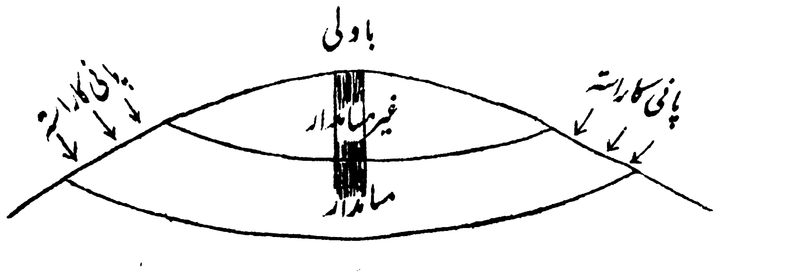

Syncline

ایسے مقامات پر بھی پانی غیر مسامدار پرت کو عبور کرنے پر حاصل ہوگا۔ اگر پانی گہرے عمیق سے آتا ہو تو وہ گرم ہوگا یا سردی کے زمانے میں سطحی پانی کے مقابلہ میں کچھ گرم اور گرما میں کچھ سرد ہوگا۔

بعض اوقات پانی میں دھاتیں حل شدہ ہوتی ہیں جس کی وجہ چشمہ دھاتی چشمہ کہلاتا ہے۔ بہت سے چشمے کیلسیم کاربونیٹ اپنے اطراف جمع کرتے ہیں جو سخت اور خشک ہوتا ہے جس کو کیلکیریس سنٹر کہتے ہیں اور جب یہ غار میں جمع ہوتا ہے تو اس کو "ٹراورٹین" کہتے ہیں۔

زیر زمین پانی کے عمل اور بہتے پانی کے عمل کے مقابلہ کے لئے سٹی کالج کا سہ ماہی رسالہ "الموسی" بابتہ اسفندار ۱۳۴۰ف ملاحظہ ہو۔

محمد احمد الدین بی۔ اے (عثمانیہ)

حُسن

میں شمع حریمِ قدرت ہوں میں نغمۂ سازِ وحدت ہوں
میں صبحِ مزاجِ عشرت ہوں میں شامِ نگاہِ حسرت ہوں
جو شوخ نظر سے اوجھل ہے میں اُس کا رنگیں محمل ہوں
جو دریا ہر سُو بہتا ہے اس دریا کا میں ساحل ہوں
انسانوں میں دیوانوں کی پُرشور اُمنگیں بھرتا ہوں
دنیائے عدم کی ظلمت میں مطلق کو مقید کرتا ہوں
مستی میں بہکتا رہتا ہوں ۔شوخی میں سنورتا رہتا ہوں
جو میرے گلے کا ہار بنے وہ جالا تانا کرتا ہوں

جلوے نہ ہوں میرے دُنیا میں تو زیست کا حاصل کچھ نہ رہے
یہ لطف نہ ہو یہ سُکھ نہ رہے یہ درد نہ ہو یہ دُکھ نہ رہے

گلپوش زمیں نیلا انبر، ہر سمت اُجالا میرا ہے
مست چھائی ہے جس کی جگ پر وہ پریم پیالا میرا ہے

سو نام مرے ہر نام جدا، ہر روپ میں میرا کام جُدا
ہے لطف ہوائے بام الگ اور کیف مے گلفام جُدا

موجوں میں مچلتا رہتا ہوں سبزے پہ کبھی سو جاتا ہوں
مہتاب سے چھنتا رہتا ہوں تاروں میں کبھی کھو جاتا ہوں

چہروں میں دمکتا رہتا ہوں سینوں میں سما جاتا ہوں کبھی
عارض میں جھلکتا رہتا ہوں پلکوں پہ بھی آجاتا ہوں کبھی

بھرتا ہوں سناٹے جنگل میں تو مجھ کو آ ہو کہتے ہیں
جب آنکھ میں دم لیتا ہوں ذرا تو آنکھ کو جادو کہتے ہیں

آتی ہے جو نظر خوباں کی آنکھوں میں شرارت میری ہے
کلیوں میں نزاکت میری ہے پھولوں میں حرارت میری ہے

جو آج تلک بوجھی نہ گئی میں ایسی سخت پہیلی ہوں
آواز پپیہے کی میں ہوں اور میں ہی پپیہے کا پی ہوں
ہر جنبش ابروسے میری تلوار دودھاری لگتی ہے
میں سامنے آکر ہنستا ہوں تو موت بھی پیاری لگتی ہے
جب نفس طرارے بھرتا ہے اس سے پرے ہٹ جاتا ہوں
میں ٹھنڈے من کی گرمی ہوں۔ پر گرمی سے گھبراتا ہوں
نیکی و حیا کے بند مجھے ہر وقت سنبھالے رہتے ہیں
اک ندی ہوں میں متوالی دل لاکھوں جس میں بہتے ہیں
کشمیر کی وادی ہو کہ دکن۔ ویرانہ ہو یا ہو گلشن
اک بھولی صورت پیاری سی یا زہر بھری کالی ناگن
شیریں۔ دمینتی یا عذرا سب میرے ہی پیمانے ہیں
فرہاد ہو نل ہو یا وامق سب میرے ہی دیوانے ہیں
میں کرشن کی مرلی میں تھی اور رادھا کے بھولے من میں
یعقوب کی چشم گریاں میں اور یوسف کے پیرہن میں

دنیا پہ ستم کرتا ہوں پر سب کا پیارا رہتا ہوں
لپٹے ہیں سب مرے دامن سے اس پر بھی اچھوتا رہتا ہوں
میں کھوج میں سوز الفت کے ہر دل کو ٹٹولا کرتا ہوں
بیدل نہ کہو کافر نہ کہو میں عشق کی پوجا کرتا ہوں
کیسی ہے تمہاری عقل بھلا پیاسے کو سمندر کہتے ہو
جو کشتۂ الفت ہو طیبؔ کیوں اس کو ستمگر کہتے ہو

طیبؔ

دکن بٹن فیاکٹری

"دکن بٹن فیکٹری" جناب احمد خاں صاحب کا تحقیقی مضمون جس پر مسٹر موصوف کو بزم معاشیات کی جانب سے میکنزی انعام دیا گیا ہے
مضمون مفید ہے اور سفارشات توجہ کے مستحق ہیں۔ مدیر

آغاز و نشو و نما حیدرآباد کی اُن چند صنعتوں میں سے جو کامیابی کے ساتھ چل رہی ہیں بٹن سازی کی صنعت غالباً پیش پیش ہے اور اس صنعت کا سب سے بڑا اور کامیاب کارخانہ دکن بٹن فیکٹری ہے۔ اس کارخانہ کی ابتدا نہایت سبق آموز ہے۔ کارخانہ کی زندگی کو چار ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلا دور سنہ ۱۹۱۶ء تا سنہ ۱۹۲۵ء آج سے کوئی ۲۲ سال پہلے سنہ ۱۹۱۶ء میں صرف سو روپیہ کے سرمایہ سے جناب غوث الدین صاحب نے اس کارخانہ کی ابتدا کی۔ کارخانہ کا کام ابتدا میں خود مالک کارخانہ کے مکان پر انجام پاتا تھا۔ چھ سات مہینے تک صاحب موصوف اکیلے ہی کام کیا کرتے تھے۔ بعد میں دو مزدور نوکر رکھ لئے گئے۔ کارخانہ کی عمر کے اس ابتدائی سال میں ٹین کے بٹن تیار ہوتے تھے۔ سنہ ۱۹۱۷ء میں پیتل کے بٹن بننے لگے۔ اور مزدوروں کی تعداد (۸) ہوگئی۔ کاروبار کی رفتار سنہ ۱۹۲۰ء تک رہی۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں مزدوروں کی تعداد ۲۲ ہوگئی۔ اور اس کے بعد سے سنہ ۱۹۲۵ء تک ہر سال ۴، ۵ مزدور

کا اضافہ ہوتا رہا ہے۔ اس دور میں بٹن دستی مشین سے تیار ہوا کرتے تھے۔ اور بٹن سازی کے ساتھ ساتھ پھندنے کے کیاپ بھی بنائے جاتے تھے[۱]۔

دوسرا دور ۱۹۲۵ء تا ۱۹۳۰ء یہ دور کارخانہ کی زندگی کا سن شعور کہلایا جاسکتا ہے۔ اسی سال ۱۹۲۵ء میں چند اہم تبدیلیاں ہوئیں۔ کارخانہ اپنی مستقل عمارت میں بمقام حسینی علم (چار مینار) منتقل ہوا۔ اب دستی مشین کے بجائے برقی مشین سے کام لیا جانے لگا۔ اسی سال یعنی ۱۹۲۵ء میں پہلی برقی مشین جس کی قیمت تقریباً ۲۵ ہزار روپیہ ہے، نصب کی گئی اور اسی سال سے مال برآمد کیا جانے لگا۔ ۱۹۲۵ء تا ۱۹۳۰ء تک ہر سال اوسطاً چار مزدوروں کا اضافہ ہوتا رہا۔ پیتل کے بٹن اور پھندنے کے کیاپ کے علاوہ جرمن سلور کے بٹن بھی تیار ہونے لگے۔

تیسرا دور ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۷ء ۱۹۳۰ء سے یہ کارخانہ حقیقی معنوں میں بٹن فیکٹری بن گیا۔ اب تک بیان کیا جاچکا ہے کہ پھندنے کے کیاپ بھی بنائے جاتے تھے لیکن اب ان کی تیاری کو ترک کرنا پڑا۔ اس تغیر کا پہلا سبب تو یہ ہے کہ مالک کارخانہ نے پھندنے کے کیاپ کو پیٹنٹ کروالیا تھا۔ لیکن اسی سال حکومت سرکار عالی نے اس پیٹنٹ کی تنسیخ کردی۔ پیٹنٹ کی تنسیخ کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں کیاپ سازی کے کارخانے کھل گئے۔ اور ان کارخانوں میں باہمی مسابقت شروع ہوئی۔ پھر اس کا (پھندنے کے کیاپ کا) بازار کچھ وسیع نہ تھا۔ اس کی کھپت زیادہ تر یادگیر اور حیدرآباد میں تھی۔ گویا سالانہ زیادہ سے زیادہ ۳ ہزار روپیہ کے مال کی طلب تھی۔ ادھر کاروبار کی یہ حالت ہوئی، ادھر فیشن میں تبدیلی ہوگئی۔ اور اب پھندنے کے کیاپ لگانے کا طریقہ ہی متروک ہوگیا۔ ان تمام اسباب کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیٹنٹ کی تنسیخ کے کچھ ہی عرصہ بعد کارخانہ نے یہ کام بالکل ترک کردیا۔ اور اسی دور سے اس کا اہم اور واحد کام بٹن سازی ہوگیا۔ پھندنے کے کیاپ سازی کا کام ترک کرنے کی وجہ سے کارخانہ کی رفتار ترقی میں کچھ ہرج واقع نہ ہوا۔ سرمایہ اور مزدوروں کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا۔ اب تو جرمن سلور کے علاوہ رولڈ گولڈ فینسی بٹن بھی تیار ہونے لگے۔ جرمن سلور اور پیتل کے بٹن مختلف اقسام کے مثلاً روپہلی و سنہری قمیص و شیروانی کے لئے تیار کئے جانے لگے۔ بہرحال کاروبار کی رفتار ترقی کی طرف رہی۔

موجودہ حالت اس تاریخی پس منظر میں ہم کارخانہ کی موجودہ حالت کا مطالعہ کریں گے۔ یہ کارخانہ اس وقت نہ صرف حیدرآباد بلکہ ہندوستان میں بٹن سازی کی سب سے بڑی فیاکٹری ہے۔ اور کارخانہ ایک اچھی وسیع عمارت میں واقع ہے۔ جہاں صفائی ہوا۔ اور روشنی کا اچھا انتظام ہے مشنری کے متعلق Economic Life of Hyderabad میں

[۱] کچھ عرصہ قبل پھندنوں کے سروں پر جو "ٹوپن" استعمال کیا جاتا تھا وہ جست کے بنائے جاتے تھے۔

اس طرح اظہار خیال کیا گیا ہے کہ (The factory is Equipped with the latest type of maechines) تقسیم عمل کی حالت یہ ہے کہ ایک بٹن ۲۵ مختلف ہاتھوں میں سے گزرنے کے بعد پایہ تکمیل کو پہونچتا ہے ——— قوت محرکہ ——— کا خرچ ۱۳۴۵ف میں (۱۱۸۰) روپیہ اور ۱۳۴۶ف میں (۱۴۰۱) روپیہ تھا۔ بلحاظ عمارت سرمایہ اور طریقہ پیدائش اس کو صحیح معنوں میں فیاکٹری کہا جا سکتا ہے۔

سرمایہ

سو روپیہ کے سرمایہ سے جس کارخانہ کی ابتدا کی گئی تھی اب اُس کے کل سرمایہ کا اندازہ تقریباً ر ۲½ ڈھائی لاکھ روپیہ ہے اور یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ یہ کل سرمایہ ذاتی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اور اس کے کسی جزو میں بھی بطور قرض حاصل کی ہوئی رقم شامل نہیں ہے۔ کارخانہ کے آغاز سے اب تک قرضہ نہ تو حکومت سے لیا گیا اور نہ مہاجن سے۔ حکومت سے قرض اس لئے نہیں لیا گیا کہ اس میں چند در چند دشواریاں ہیں۔ مثلاً یہ کہ غیر منقولہ جائداد کی ضمانت دی جائے قرضہ سے جو مشنری خریدی جائے وہ تا ادائی قرضہ حکومت کی ملک سمجھی جائے گی۔ اس کو مالک کارخانہ نہ تو فروخت کر سکتا ہے اور نہ رہن رکھ سکتا ہے۔ مہاجن سے قرض لیا جائے تو شرح سود بہت زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن قرض نہ لینے میں زیادہ تر مالک کارخانہ کے اخلاقی تصورات کو دخل ہے۔ الغرض ر ۲½ ڈھائی لاکھ روپیہ تمام تر ذاتی جد وجہد اور کاروبار کو تدریج ترقی دینے کا نتیجہ ہے اور اس سرمایہ میں اصل قایم کی مقدار تقریباً (۱۷۰۰۰۰) ایک لاکھ ستر ہزار روپیہ ہے۔ اور اصل دایر کا تخمینہ کم و بیش (۸۰۰۰۰) اسی ہزار روپیہ ہے اور اصل میں عمارت کارخانہ جس کی قیمت ۲۰ ہزار روپیہ اور مشنری جس کی قیمت ۱½ ڈیڑھ لاکھ روپیہ ہے شامل ہے۔

طریقۂ کاروبار

کارخانہ کا اہم اور خاص کام گنڈیوں کی تیاری ہے۔ موٹروں وغیرہ کے نمبر ڈل اور بلٹ وغیرہ بھی بنائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ کاروبار موقتی ہیں۔ اصلی کام بٹن کی تیاری ہے۔ دو قسم کے بٹن تیار کئے جاتے ہیں شیروانی کے بٹن، قمیص کے بٹن، شیروانی کے بٹن مختلف ڈزائن کے تیار ہوتے ہیں لیکن اِن کی تین قسمیں کی جاتی ہیں۔ ایک سنہری دوسرا سفید۔ تیسرا رولڈ گولڈ فینسی بٹن۔ سنہری بٹن پتیل یا جرمن سلور کے ہوتے ہیں۔ یہی حال سفید بٹن کا ہے۔ فینسی رولڈ گولڈ بٹن (Amy lead) کے ہوتے ہیں (Amy lead) کسی قسم کی دہات نہیں ہے۔ بلکہ چند کیمکل اجزا کا مجموعہ ہے جو جرمنی میں تیار کیا جاتا ہے۔ یہ بٹن بہت نفیس ہوتے ہیں۔ قمیص کے گنڈیوں کی چار قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک گولڈ پلیٹیڈ۔ دوسرا رولڈ گولڈ تیسرا سلور۔ چوتھا سلور پلیٹیڈ۔ یہ گنڈیاں بھی مختلف نمونوں کی ہوتی ہیں۔

خام اشیاء اوپر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ گنڈیوں کی تیاری میں پیتل، جرمن سلور، چاندی، رولڈ گولڈ اور استعمال ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ سونے کا نمک۔ کیمیائی اور کیمیکل اجزا بھی بطور اشیاء خام استعمال کئے جاتے ہیں۔ ان خام اشیاء کی درآمد کی جاتی ہے اکثر اشیاء بمبئی سے منگوائی جاتی ہیں یا اگر وہاں نہ مل سکیں تو کارخانہ راست ولایت اور یورپ کے ممالک سے منگوا لیتا ہے چاندی اور سونا کارخانہ راست بمبئی سے نہیں منگواتا۔ بلکہ ان کو حیدرآباد ہی میں خرید لیا جاتا ہے۔ الغرض مطلوبہ خام اشیا حیدرآباد میں پیدا نہیں ہوتیں اس لئے ان کو باہر سے منگوایا جاتا ہے۔ سنہ ۴۵-۴۶ف کے خام اشیا کے خرچ کی تفصیل پیش کی جاتی ہے تاکہ صحیح طور پر ہم اشیائے خام کے خرچ کا اندازہ لگا سکیں۔ سنہ ۱۳۴۵ف میں جرمن سلور و پیتل۔ (۹۵۱۰) نو ہزار پانسو دس روپیہ کی چاندی (۲۰۷۶) دو ہزار چھہتر روپیہ کا سونا (۹۸۸) روپیہ کا نمک چاندی۔ (۴۵۲) روپیہ۔ نمک سونا۔ ۷۰۴ روپیہ متفرقات جس میں کیمیائی اشیاء شامل ہیں (۸۱۰۷)، جملہ (۲۲۰۳۰) روپیہ۔ سنہ ۱۳۴۶ف میں جرمن سلور و پیتل (۱۲۲۵۲) روپیہ۔ چاندی (۲۰۰۷۰) روپیہ۔ سونا۔ (۱۳۴۳) روپیہ نمک سونا (۹۷۲) روپیہ۔ نمک چاندی (۵۲۶) روپیہ متفرقات جس میں کیمیکل اجزا شامل ہیں (۸۰۳۵) روپیہ جملہ (۲۶۰۰۶) روپیہ گویا سنہ ۴۵ف میں تقریباً ۲۲ ہزار روپیہ سالانہ اشیائے خام پر خرچ ہوئے اور سنہ ۴۶ف میں تقریباً ۲۶ ہزار روپیہ سالانہ اشیائے خام پر خرچ ہوئے۔

سوائے جرمن سلور اور پیتل کی چادروں اور مشنری کے تمام اشیاء خام پر محصول درآمد لگایا جاتا ہے جرمن سلور اور پیتل کی چادروں پر بھی کچھ عرصہ تک یعنی تقریباً ایک دو سال تک محصول درآمد لگایا گیا۔ لیکن بعد میں کارخانہ کی درخواست پر ان کو محصول سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔ جرمن سلور اور پیتل ہی اشیاء خام کا بہت بڑا جز ہیں اور اس پر جو رقم صرف کی جاتی ہے وہ نسبتاً اشیاء خام سے زیادہ ہے۔ حکومت نے اس قسم کی معافی عطا کر کے بڑی دانشمندی کی ہے۔ کیونکہ اگر کوئی بٹن فیاکٹری بمبئی یا مدراس وغیرہ میں قایم ہو جائے تو اس فیکٹری کا مقابلہ دشوار ہوگا۔ کیونکہ وہ فیکٹری ۵ فی صد محصول درآمد اور ریلوے اخراجات سے بچی رہے گی۔ حالانکہ ہمارے کارخانہ کو ۵ فی صد محصول درآمد اور اخراجات حمل و نقل ادا کرنے پڑیں گے۔ اگرچہ یہ صورت اب بھی موجود ہے، اس لئے کہ سوائے جرمن سلور اور پیتل کے چادروں کے باقی تمام خام اشیاء پر محصول درآمد لیا جاتا ہے لیکن جرمن سلور اور پیتل پر جو اخراجات ہوتے ہیں وہ اشیائے خام کا بہت بڑا جز ہیں اس لئے حکومت کی اس معافی محصول کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

تیار شدہ بٹنوں کی تعداد باوجود تلاش کے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ہر بٹ پر کس قدر لاگت کی خام اشیاء صرف ہوتی ہیں

اور یہ معلوم کرنا دشوار بھی ہے۔ اب ہم سٹوں کی تعداد کا ذکر کریں گے۔

	۱۳۴۴ف	۱۳۴۵ف	۱۳۴۶ف
شیروانی کے بٹن	۲۵۱۹۶	۲۸۱۸۸	۲۹۷۷۱
کف گلہ	۴۲۴۳۲	۴۸۶۸۲	۶۰۲۵۰
کف لنک	۵۶۰۰۴	۱۳۶۰۰۰	۱۲۸۰۳۱
سرف گلہ	۰	۴۷۳۶	۴۶۴۳۴
جملہ	۱۳۳۶۳۲	۲۱۷۶۰۶	۲۴۷۲۸۶

اس سے پیشتر ۱۳۴۵ف و ۱۳۴۶ف کے اشیار خام کے اخراجات کی تفصیل بیان کردی گئی ہے۔ ان اعداد شمار اور ان اخراجات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک گونہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ کس قدر خام اشیا سے کتنے سٹ تیار ہوئے۔ مثلاً یہ کہ ۱۳۴۵ف میں ۲۲ ہزار روپیہ کی خام اشیا خریدی گئیں اور کل ۲۱۷۶۰۶ سٹ بٹن تیار ہوئے۔ اوپر کے اعداد شمار سے ظاہر ہو رہا ہے کہ قمیصوں کی گنڈیوں کے سٹ بہ نسبت شیروانی کے گنڈیوں کے سٹ زیادہ تعداد میں تیار ہوتے ہیں۔ اس کے مختلف وجوہات ہیں ان کی قیمت نسبتاً کم ہے، طلب زیادہ ہے، اخراجات نسبتاً کم لاحق ہوتے ہیں، کام بھی کچھ زیادہ نہیں کرنا پڑتا۔ روزانہ اوسطاً (۵۰۰) سٹ تیار ہوتے ہیں۔ واضح رہے کہ سٹ کی تیاری میں کانٹوں کی تیاری بھی شامل ہے اندازہ لگایا گیا ہے سفید بٹن (قمیص و شیروانی کے) سنہری بٹن سے زیادہ تعداد میں بنتے ہیں۔

فینسی رولڈ گولڈ بٹن چھ ماہ سے بننے لگے ہیں اس لئے مندرجہ بالا اعداد شمار میں ان کا حساب شامل نہیں ہے۔ ۶ ماہ کی مدت میں اس کے تقریباً ۵ ہزار سٹ تیار ہوئے ہیں۔

ڈبوں کی تیاری

بٹن کے لئے مختلف قسم کے چھوٹے بڑے ڈبے بھی اسی کارخانہ کے زیر انتظام بنائے جاتے ہیں ڈبوں کی تیاری کو تضمینی صنعت کی حیثیت حاصل ہے۔ کیونکہ یہ ڈبے مستورات (جن کی زیادہ تعداد بیواؤں پر مشتمل ہے) اپنے گھروں پر تیار کرتی ہیں۔ چند سال پہلے ڈبوں کی تیاری کا کام بھی کارخانہ میں عورتوں کے ذریعہ انجام پاتا تھا۔ اس وقت مزدوری، اجرت وقت کے لحاظ سے دی جاتی تھی شلاً۔ مثلاً ۳ر، ۲ر فی یوم کے حساب سے ان مزدوروں میں تقسیم کی جاتی تھی۔ اس زمانہ میں اس کام میں مزدورنیوں کی تعداد بھی کم تھی یعنی تقریباً ۱۲-۱۶ اب ڈبوں کی

تیاری میں ۵۰ عورتیں مصروف ہیں۔ چند سال پہلے مزدور عورتوں کی تعداد میں کمی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ گنڈیوں کے سٹ اتنی زیادہ تعداد میں نہیں بنائے جاتے تھے لیکن اس کی ایک دوسری وجہ طریقہ پیدائش میں بھی مضمر ہے۔ پہلے کارخانہ میں ۱۶ عورتیں کام کرتی تھیں۔ اس لئے کہ عورتوں کی اس قدر تعداد مطلوبہ ڈبے تیار کرنے کے لئے کافی تھی۔ اور اس سے زیادہ تعداد میں مزدورنیوں کو رکھنا غیر ضروری تھا اب ڈبوں کی تیاری کا طریقہ یہ ہے کہ متعلقہ اشیائے خام مستورات تک پہونچا دیئے جاتے ہیں۔ اور ڈبے تیار ہونے کے بعد کارخانہ کو ۵؍ (چھوٹے ڈبوں کے لئے) اور ۸؍ (بڑے ڈبوں کے لئے) فی صد کے حساب سے مل جاتے ہیں گویا ۵؍ اور ۸؍ آنہ فی صد ڈبوں کی تیاری کی اُجرت ہے۔ اس طریقہ پر ڈبوں کو تیار کرنے سے کارخانہ کو مزدورنیوں کی تعداد سے براہ راست کوئی واسطہ نہ رہا۔ اب فیکٹری کو اس سے کوئی مطلب نہیں کہ ۱۶ عورتیں کام کر رہی ہیں یا (۴۰) کیونکہ اضافہ یا کمی تعداد سے کارخانہ کے اخراجات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ گویا اس طریقہ کا یہ نتیجہ نکلا کہ مزدور عورتیں زیادہ تعداد میں مصروف ہوگئیں۔ اگر قدیم طریقہ اب بھی جاری رہتا تو مزدورنیوں کی تعداد میں اس قدر اضافہ نہ ہوتا جس قدر کے اب ہوا ہے۔ غرض ڈبوں کو اس طریقہ پر تیار کرنے سے ایک طرف زیادہ مزدور مصروف ہوسکے اور دوسری طرف بہ حیثیت مجموعی کارخانہ کو پہلے کی بہ نسبت کفایت ہوئی۔ بات یہ ہے کہ پہلے طریقہ میں عورتوں کی مزدوری ۲؍۳؍ آنہ فی یوم تھی اور اُس وقت ایک عورت ایک دن میں تقریباً ۳۰ ڈبے بناتی تھی۔ اس طرح سَو ڈبوں کی تیاری کے لئے تین مزدورنیوں کی ضرورت تھی۔ اس لحاظ سے سَو ڈبوں کی تیاری کے لئے کارخانہ کو ۶؍ و ۹؍ آنہ دینے پڑتے تھے۔ حالانکہ اب اتنے ہی ڈبوں کے لئے ۵؍ و ۸؍ دیئے جاتے ہیں۔ اور اس طرح کارخانہ کو بہ حیثیت مجموعی کفایت ہوئی۔ ممکن ہے کہ اس طریقہ سے ہر مزدور عورت کی اُجرت میں کمی ہوئی ہو۔ لیکن اس کی تلافی دیگر کاروبار کی انجام دہی سے ہو جاتی ہے۔

ڈبوں کے لئے مواد وغیرہ یہاں سے یا اگر یہاں دستیاب نہ ہوسکے تو بمبئی سے منگوایا جاتا ہے سنہ ۴۵ف میں ڈبوں کی تیاری کی اخراجات تقریباً (۱۳۰۲) روپیہ اور سنہ ۴۶ف میں (۳۰۶۱) روپیہ تھے۔ ان اخراجات میں ڈبوں کے اشیاء خام کی قیمت اور ان کی تیاری کی اُجرت شامل ہے۔ یہاں تک ہم نے کارخانہ کے طریقہ پیدائش کی تفصیلات کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اس بیان کو ختم کرنے سے پہلے چند ضروری امور کا تذکرہ کر دینا مناسب ہوگا۔

بٹن کے بنانے میں پیتل جرمن سلور وغیرہ کے جو اجزا بیکار ہو جاتے ہیں اُن کو عام طور پر مقامی لوگوں کو فروخت کر دیا جاتا ہے۔ اس میں تقریباً ۱/۲ حصہ قیمت میں کمی ہو جاتی ہے۔ یعنی پیتل عہ؍ فی سیر کے حساب سے خرید اگیا تھا تو اب

اُس کے بیکار اجزا تقریباً ۵ ؍ آنہ فی سیر کے حساب سے فروخت کئے جاتے ہیں۔ بعض اوقات جب کہ موقتی کام مثلاً موٹر کے نمبرات پلیٹ وغیرہ تیار کرنے کے ہوں تو ان بیکار اجزا کو کام میں لایا جاتا ہے۔ ان اجزا کو کارخانہ ہی میں گلایا، ڈھالا، اور قابل استعمال بنایا جاتا ہے۔

مالک کارخانہ کی مہارت اور فن دانی قابل ذکر ہے۔ چنانچہ آپ کی صنعتی مہارت کے باعث ہی مشین کی درستی اور ڈائیوں کے بنانے کا کام بھی کارخانہ ہی میں انجام پاتا ہے۔ کارخانہ کا بیمہ کرایا گیا ہے۔

مال کی نکاسی اب ہم اشیا کی تیاری کا بیان ختم کرتے اور مال کی نکاسی کا ذکر شروع کرتے ہیں۔

فروخت کا حال سالانہ اوسطاً ۸۰ ہزار روپیہ کا مال فروخت ہوتا ہے۔ ۱۳۴۶ف کے اعداد شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً ۹۰ نود ہزار روپیہ کا مال فروخت ہوا۔ مختلف سنین میں فروخت کے متعلق صحیح اعداد و شمار دستیاب نہ ہوسکے۔ لیکن یہ یقینی ہے کہ مال کی فروخت میں تدریج اضافہ ہوا۔ اس کارخانہ کی گنڈیوں کی رسائی حیدرآباد تک محدود نہیں ہے بلکہ بمبئی۔ کلکتہ۔ کراچی۔ مدراس۔ کولمبو۔ یو۔ پی۔ پنجاب میں بھی اس کی منڈیاں ہیں۔ ایک معزز شخص کا بیان ہے کہ انھوں نے اس کارخانہ کی بنی ہوئی گنڈیوں کو انگلستان میں بھی فروخت ہوتے دیکھا ہے اور یوں بھی اس کارخانہ کی گنڈیاں۔ مصر اور بعض یورپی ممالک کو بطور تحفہ بھیجی جاتی ہیں۔

ممالک محروسہ حیدرآباد اس کارخانہ کا سب سے بڑا بازار ہے۔ جہاں اوسطاً ۳۰ ہزار روپیہ سالانہ مال فروخت ہوتا ہے ۱۳۴۶ف میں تقریباً ۳۵ ہزار کا مال ممالک محروسہ سرکار عالی میں فروخت ہوا۔ اور اس سال کل (۹۰) نود ہزار روپیہ کا مال فروخت ہوا۔ اس لحاظ سے آدھے سے کچھ ہی کم قیمت کا مال حیدرآباد میں صرف ہوتا ہے۔ اس قدر مال کی کھپت کی وجہ یہ ہے کہ حیدرآباد میں قمیصوں اور شیروانیوں کا رواج عام ہے۔

۱۹۲۵ء سے جب کہ برقی مشین سے گنڈیاں تیار کی جانے لگیں، مال برآمد ہونے لگا تو ابتدا میں ظاہر ہے کہ بہت ہی کم مال باہر جاتا تھا۔ ۱۹۲۵ء میں تقریباً ایک ہزار روپیہ کا مال برآمد کیا گیا۔ مال کے برآمد ہوتے ہی ۵ فی صد کے حساب سے محصول برآمد عائد کردیا گیا۔ تقریباً ۱۰ اء تک یہ محصول وصول کیا جاتا رہا۔ لیکن بعد میں جبکہ مالک کارخانہ نے یہ تبلایا کہ اگر محصول برآمد عائد کیا جائے تو ملک کی صنعت کو نقصان پہونچے گا، تو حکومت نے محصول برآمد معاف کردیا۔ حقیقت یہ ہی کہ اگر محصول برآمد عائد کیا جاتا تو ملک کی اس صنعت کو زبردست دھکا لگتا۔ اول تو خام اشیا یہاں دستیاب نہیں ہوتیں پھر ان کے

درآمد کرنے پر محصول ادا کرنا پڑتا ہے اگرچہ بعض اشیا کو اس محصول سے مستثنیٰ بھی کر دیا گیا ہے۔ لیکن اخراجات حمل ونقل الگ برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ اس صورت میں اگر محصول برآمد عاید کیا جاتا تو گویا کارخانہ کو محصول درآمد و برآمد اور اخراجات حمل ونقل ان سب کا بار برداشت کرنا پڑتا۔ ظاہر ہے کہ ایک نوخیز صنعت اتنے اخراجات کے بار کی متحمل نہیں ہو سکتی ——— اور پھر اس حالت میں اگر بیرون حیدرآباد مثلاً بمبئی کلکتہ میں کوئی کارخانہ کھل جائے تو اس کا مقابلہ بہت دشوار ہو گا۔ شاید اسی خیال کی بنا پر حکومت سرکار عالی نے محصول برآمد معاف کر دیا۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں تقریباً ۵ ہزار کا مال باہر جانے لگا ہے۔ اور ہر سال بہ سال اس میں ترقی ہوتی رہی۔ سنہ ۱۳۴۶ف میں برآمد کی مقدار ۵ ہزار روپیہ تھی۔ اور اس وقت اوسطاً ۵۰ ہزار روپیہ سالانہ کی برآمد ہوتی ہے ابتدا میں مال بمبئی اور یو۔ پی جاتا رہا ہے۔ رفتہ رفتہ کلکتہ، کراچی۔ مدراس۔ پنجاب۔ کولمبو اور دیگر مقامات کو جانے لگا۔ بیرونی بازار میں سب سے بڑی منڈی بمبئی اور اس کے بعد کلکتہ ہے (Economic Life of Hyderabad) کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ممالک محروسہ سرکار عالی سے تقریباً ۲ لاکھ روپیہ کی گنڈیاں سالانہ برآمد کی جاتی ہیں۔ اور اس کل برآمد میں دکن بٹن فیکٹری کا بیشتر حصہ ہے کیونکہ ۲ لاکھ روپیہ میں سے تقریباً ۵ ہزار کا مال اسی کارخانہ سے برآمد ہوتا ہے اور بقیہ مال کی برآمد کارخانوں سے مل کر ہوتی ہے۔

انتظام فروخت

مال کی فروخت کا انتظام بھی کافی ترقی یافتہ ہے۔ بیرون حیدرآباد مال کی فروخت کے لئے سول ایجنٹس مقرر ہیں۔ سنہ ۱۹۲۵ء کے بعد سے جب کہ مال کی برآمد ہونے لگی تھی، ۳ سال تک بیرون حیدرآباد مال کی نکاسی کا انتظام (Travelling agents) کے ذریعہ انجام پاتا تھا اور یہ (Travelling agents) کمپنی کے ملازم نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ ان کو کمیشن دیا جاتا تھا اور یہ لوگ مختلف مقامات کا دورہ کرکے مال فروخت کیا کرتے تھے کمیشن کی مقدار مختلف ایجنٹوں کے لئے مختلف ہوتی تھی۔ اور ان کے اعتبار و کاروباری قابلیت وغیرہ کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ سنہ ۱۹۳۰ء یعنی، یا ۳ سال سے سول ایجنسی کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے اور اب بمبئی۔ کلکتہ۔ کراچی۔ مدراس۔ کولمبو۔ یو۔ پی۔ پنجاب میں ایک ایک سول ایجنٹ مقرر ہے۔ سول ایجنٹس کو ۲۳½ فی صد کمیشن دیا جاتا ہے اور اخراجات حمل ونقل بھی فیاکٹری خود ادا کرتی ہے تاکہ نرخ تقریباً ہر جگہ یکساں رہے اور ان ایجنٹوں سے رقمی اور شخصی ضمانت لی جاتی ہے۔ جو مختلف لوگوں کے لئے مختلف ہوتی ہے اور ان کو ایک خاص مقدار میں مال کی نکاسی کا ذمہ دار ٹھیرایا جاتا ہے۔ سول ایجنسی کا طریقہ صرف بیرون ممالک محروسہ سرکار عالی میں موجود ہے لیکن نہ تو بلدہ حیدرآباد میں اور نہ اضلاع پر سول ایجنٹس موجود ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ

سول ایجنسی لینے کی بہت سخت شرائط ہیں۔ اگرچہ کمیشن معقول دیا جاتا ہے۔ شرائط کی سختی کے علاوہ بڑی وجہ غالباً یہ ہے کہ کارخانہ خود بلدہ حیدرآباد میں قایم ہے۔ چلرفروش جب چاہتے ہیں حسب ضرورت مال خرید لاتے ہیں۔ اگرچہ اُن کو اس صورت میں نسبتاً کم کمیشن یعنی ۲ ۱/۲ فی صد دیا جاتا ہے لیکن وہ شرائط کی پابندیوں سے آزاد ہوتے ہیں۔

اندرونی مسابقت ابتدا میں تقریباً ۸ سال تک مسابقت نہیں تھی۔ کیونکہ کوئی اور کارخانہ قائم نہیں ہوا تھا مسابقت کا یہ سلسلہ جو اب روز افزوں ہے تقریباً ۱۳ سال سے شروع ہوا، جب کہ ۱۳۳۲ف ۱۹۲۴ء میں ایک اور کارخانہ کھلا۔ اُس زمانہ سے اب تک تقریباً ۱۴ کارخانے حیدرآباد دکن میں کھلے، جن میں سے ۶ کارخانوں کے سوائے سب دیوالیہ ہو گئے اُس وقت بلدہ حیدرآباد میں ۵ بٹن کے کارخانے (۱) سگری بٹن فیکٹری (۲) حیدرآباد دکن بٹن فیکٹری (۳) بھارت بٹن فیکٹری (۴) دکن بٹن فیکٹری (۵) غوثیہ بٹن فیکٹری۔ اور ایک کارخانہ ضلع میں قائم ہے۔ ان کارخانوں میں سے آخرالذکر دو کارخانے فیکٹری کی تعریف میں داخل نہیں ہیں۔ کیونکہ وہاں چھوٹے پیمانہ پر دستی مشین کے ذریعہ بٹن تیار کئے جاتے ہیں۔ یوں تو مسابقت عرصے سے ہو رہی ہے، لیکن ۱۳۴۵ف سے اس میں شدت پیدا ہو گئی اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ گذشتہ تین سال سے حیدرآباد میں نئے کارخانوں کا قیام عمل میں آیا۔ لیکن مسابقت اتنی تیز نہیں ہے کہ اس کو گلوتراش کہا جا سکے۔

بیرونی مسابقت بیرونی مسابقت کا مسئلہ کچھ اہم نہیں ہے۔ غیر ممالک کے کارخانے مثلاً جرمن وغیرہ جس قسم کی گنڈیاں تیار کرتے ہیں۔ وہ ہمارے یہاں کی گنڈیوں سے مختلف نوعیت کی ہوتی ہیں۔ اُن گنڈیوں کو علی العموم ٹانکا جاتا ہے ——— البتہ تقریباً تین سال سے ——— سفید رنگ کی جاپانی گنڈیاں بازار میں آنے لگی ہیں جن کو شیروانی میں لگایا جاتا ہے۔ لیکن یہ امر کچھ قابل التفات نہیں ہے۔ اولاً اس لئے کہ نرخ میں کچھ ایسی زیادہ کمی نہیں ہے اور دوسرے نوعیت اور پائیداری و وضع کے لحاظ سے ہمارے یہاں کی گنڈیوں سے بہت پیچھے ہیں۔ بیرونی مسابقت اس طرح دیکھی جائے تو تقریباً ہے ہی نہیں۔ اگر ہے تو اس قدر خفیف کہ اس کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایک سال سے کچھ زیادہ عرصہ ہوتا ہے کہ بمبئی میں ایک بٹن فیاکٹری قائم ہوئی ہے۔ اس سے پہلے بھی علیگڈھ میں ایک بٹن فیکٹری قائم ہوئی تھی۔ جو کچھ عرصہ بعد دیوالیہ ہو گئی۔ لیکن اگر بمبئی کی بٹن فیکٹری کامیاب ہو جائے تو دکن بٹن فیکٹری کو اُس کا مقابلہ کرنا آسان نہ ہوگا۔ پہلے تو یہ کہ بیرونی بازار میں بمبئی ہی دکن بٹن فیکٹری کی بڑی منڈی ہے پھر اُس فیکٹری کے مقابل دکن بٹن فیکٹری کو اشیائے خام پر محصول درآمد اخراجات حمل و نقل برداشت کرنے پڑتے ہیں اس طرح اندازہ لگایا گیا ہے کہ تقریباً ۲ ۱/۲ فیصد اخراجات نسبتاً زیادہ لاحق ہوں گے۔ اگرچہ بمبئی میں اُجرتیں زیادہ ہیں۔ اور اس لحاظ سے

دکن ٹین فیکٹری کو ایک قسم کی آسانی اور سہولت حاصل ہے۔ لیکن پھر بھی مندرجہ بالا امور نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔ اور اسی وجہ سے بمبئی کی اس فیکٹری سے جبکہ وہ کامیابی سے چلنے لگے مقابلہ آسان نہ ہوگا۔

مقابلہ کی قوت منافع خام کو مقابلہ کا آلہ کہا جاتا ہے ہم دیکھیں گے کہ ۱۳۴۶ف میں کس قدر منافع خام حاصل ہوا۔

کل قیمت پیداوار	۹۰۰۰۰	روپیہ
قیمت اشیائے خام	۱۲۲۵۲	روپیہ
مزدوروں کی اُجرت	۲۰۳۳۹	روپیہ
اخراجات برقی	۱۴۰۱	روپیہ
متفرق اخراجات	۸۳۷۹	روپیہ
دوسروں کو ادا کردہ رقم	۴۲۳۷۱	روپیہ
منافع خام	۴۷۶۲۹	روپیہ

گویا ۱۳۴۶ف میں منافع خام ۔ ۴۷۶۲۹ روپیہ وصول ہوا یعنی شرح منافع ۲۰ فیصد رہی۔ اس لحاظ سے کارخانہ عرصے تک اندرونی و بیرونی مسابقت کا سامنا کر سکتا ہے۔ کارخانہ کی اپنی عمارت ہے، مشنری جس کی قیمت ۱½ ڈیڑھ لاکھ روپیہ ہے ذاتی ملک ہے۔ اس لئے آجر کی کوشش ہوگی کہ بجائے عمارت اور مشنری پڑی رہنے کے اس سے کام لیا جائے پھر کارخانہ کی ساکھ قایم ہو گئی ہے۔ بہر حال ان تمام امور کا لحاظ کرتے ہوئے صورت حال اتنی نازک نہیں ہے کہ کارخانہ اُس کا مقابلہ نہ کر سکے۔

مسابقت کے اثرات مسابقت کے بعض نمایاں اثرات کو جو کارخانے کے کاروبار پر مُترتب ہوتے ہیں۔ بیان کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

اس مسابقت کا ایک دلچسپ اثر یہ ہے کہ اشیاء کے نرخ میں حیرت انگیز کمی ہوئی۔ ابتدا میں ۲۰ روپیہ فی درجن سٹ روپہلی (سفید) اور ۱۴ روپیہ فی درجن سٹ سنہری گنڈیوں کی قیمت تھی۔ یہ نرخ اُس وقت کا ہے جبکہ مسابقت شروع نہیں ہوئی تھی۔ مسابقت کے شروع ہونے کے بعد نرخ میں حیرت انگیز تخفیف ہوئی۔ چنانچہ ۹ روپیہ فی درجن پیتل کی سنہری گنڈیوں کا اور ۶ چھ روپیہ فی درجن پیتل کی روپہلی (سفید) گنڈیوں کا نرخ ہو گیا۔ گویا پہلے کی بہ نسبت

نرخ میں دوگنے سے زیادہ تخفیف ہوئی۔ اور ۱۳۴۵و۱۳۴۶ف میں مختلف قسم کی گنڈیوں کے نرخ حسب ذیل ہیں۔

	جرمن سلور	پیستل			جرمن سلور	پیستل	
سفید کٹ گلہ	[illegible]	[illegible]	فی درجن سٹ	شیروانی سفید	[illegible]	[illegible]	فی درجن سٹ
سنہری	"	[illegible]	[illegible]	"	شیروانی سنہری	[illegible]	[illegible]	"

گویا مسابقت سے پہلے جن گنڈیوں کی قیمت فی درجن [illegible] روپیہ سٹ تھی۔ بعد میں [illegible] فی درجن ہوگئی اور جن گنڈیوں کا نرخ [illegible] روپیہ فی درجن تھا [illegible] فی درجن سٹ ہوگیا یعنی دوگنے سے زیادہ تخفیف ہوئی۔ لیکن مسابقت ہی کو تمام تر اس تخفیف کا ذمہ دار قرار دینا درست نہ ہوگا۔ اس لئے کہ [illegible] روپیہ فی درجن نرخ کے زمانہ میں دستی مشین کا استعمال ہوتا ہوتا تھا۔ اور بعد میں برقی مشین کا استعمال ہونے لگا۔ اس لئے بھی ممکن ہے کہ نرخ میں کمی ہوئی ہو۔ برقی مشین کے استعمال کے بعد اور اب کے نرخوں پر نظر ڈالنے سے ٹھیک ٹھیک اندازہ ہوجائے گا۔ مثلاً اس وقت نرخ [illegible] روپیہ سفید پیتل کا اور [illegible] روپیہ پیتل کی سنہری گنڈیوں کا تھا۔ اور اب [illegible] - [illegible] ہوگیا ہے۔ یہ تخفیف یقیناً صارفین (صرف کرنے والوں) کے لئے بہت ہی اچھی ہے۔ مقابلہ کا دوسرا اثر یہ ہوا کہ گنڈیاں زیادہ تعداد میں تیار کی جانے لگیں۔ جب نرخ [illegible] روپیہ [illegible] روپیہ تھا۔ اس وقت فروخت شدہ گنڈیوں کی تعداد دستیاب نہ ہوسکی۔ لیکن ۱۳۴۴ف کے (جب کے مسابقت اتنی شدید نہ تھی، جتنی کہ اب ہے) اور ۱۳۴۶ف کے اعداد و شمار کا مقابلہ کرنے سے ایک ہلکا سا اندازہ ہوسکتا ہے چنانچہ ۱۳۴۴ف میں کل (۱۲۳۶۳۲) سٹ بٹن فروخت ہوئے۔ اور ۱۳۴۶ف میں (۲۴۷۶۹۲) سٹ فروخت ہوئے۔ گویا تقریباً دوگنے بٹن تیار ہوئے۔

مسابقت کا ایک برا اثر یہ پڑا کہ مال کی نوعیت اور پائداری میں فرق آگیا۔ لیکن پھر بھی اس فیکٹری کی نسبت اکثر اشخاص کا تجربہ ہے کہ اس کے مال میں بہت کم تغیر ہوا ہے۔ یہ برا اثر اور بھی برا نظر آتا ہے جب کہ ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بیرونی بازاروں میں حیدرآباد کے گنڈیوں کی وقعت جاتی رہی ہے۔ تمام بیرونی بازاروں میں یہ گنڈیاں خواہ کسی کارخانے کی ہوں حیدرآبادی گنڈیوں کے نام سے مشہور ہیں۔ اگرچہ دکن بٹن فیکٹری نے اپنے مال میں بہت کم تغیر کیا ہے۔ لیکن پھر بھی بیرونی بازاروں میں خیال یہی ہے کہ حیدرآبادی گنڈیاں خواہ کسی کارخانہ کی بنی ہوئی ہوں پہلے کی بہ نسبت خراب تیار ہورہی ہیں اس طرح گھن کے ساتھ آٹا بھی پیا جارہا ہے۔

فروخت کا بیان ختم کرنے سے پہلے انتظام فروخت کی چند دقتوں اور خرابیوں کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ ایک خرابی

یہ ہے کہ کارخانہ کی تشہیر کا باقاعدہ انتظام نہیں ہے۔ یہاں تک کہ کارخانہ کے نام سے بعض ذمہ دار اشخاص بھی ناواقف ہیں۔ چنانچہ (Economic Life of Hyder Abad) میں اس کارخانہ کا نام حیدرآباد ٹین فیکٹری لکھا گیا ہے کارخانہ کے نام میں اکثر غلط فہمی ہوتی ہے۔ مثلاً یہ کہ دکن ٹین فیکٹری کے مالک کا نام غوث الدین ہے اور ایک ٹین کے کارخانہ کا نام بھی غوثیہ ٹین فیکٹری ہے چنانچہ اکثر چلر فروش خریداروں کو اس قسم کے مغالطہ میں مبتلا کرکے اپنا اُلو سیدھا کرتے ہیں۔

ایک دوسری خرابی یہ ہے کہ اس کارخانے کے مال کی نوعیت نسبتاً عمدہ رہتی ہے۔ لیکن بادی النظر میں خریداروں کو اس کارخانہ کے مال کی عمدگی اور دوسرے کارخانہ کے مال کی ناپائداری کا فوراً احساس نہیں ہوتا۔ بظاہر دونوں یکساں نظر آتے ہیں۔ اور اسی لئے کم قیمت کا سٹ خرید لیتے ہیں۔

مزدور کارخانہ کی موجودہ حالت۔ طریقہ پیدائش اور انتظام فروخت کے بیان کے بعد مزدوروں پر ایک نظر ڈالی جاتی ہے۔

عام مزدوروں کی عام حالت اور صحت اچھی ہے۔ ٹین سازی کے دیگر کارخانوں کے مزدوروں سے یہاں کے مزدوروں کی حالت لاکھ درجہ بہتر ہے۔ اس کی وجہ صفائی۔ روشنی وغیرہ کا معقول انتظام ہے۔ کارخانہ ایک منزلہ عمارت میں واقع ہے۔ اس کے ہر حصہ میں روشنی اور ہوا کافی گذر ہوتا ہے۔ البتہ ایک خرابی یہ ہے کہ کارخانہ کسی ایسے محلہ میں نہیں ہے جہاں کی آب و ہوا بہت ہی صحت بخش ہو۔ لیکن پھر بھی دیگر کارخانوں کا لحاظ کرتے ہوئے یہ جگہ کچھ اتنی بُری بھی نہیں ہے صفائی کے اہتمام اور روشنی و ہوا کے انتظام کے لحاظ سے اس کارخانہ کا میسور کے کارخانوں سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے

تعداد مزدوروں کی تعداد مختلف سنین میں مختلف رہی سنہ ۱۹۱۷ء میں مزدوروں کی جملہ تعداد ۳۰ تھی تقریباً چار سال بعد سنہ ۱۹۲۰ء میں اُن کی تعداد ۲۰ ہو گئی اور اس کے بعد سے ہر سال ۴-۵ مزدوروں کا اضافہ ہوتا رہا بسنہ ۱۹۲۵ء میں جب کہ برقی مشین سے کام لیا جانے لگا۔ مزدوروں کی تعداد ۴۰ تھی۔ سنہ ۱۳۴۴ف سے مزدوروں کی تعداد میں خاصہ اضافہ ہوا۔ چنانچہ اس سال مزدوروں کی اوسط تعداد ۷۵ فی یوم تھی۔ سنہ ۱۳۴۵ف میں یہ تعداد اوسطاً ۹۵ فی یوم ہو گئی۔ اور سنہ ۱۳۴۶ف میں ان کی تعداد اوسطاً ۱۲۵ تھی۔ گویا ۱۳۴۴ف سے ۱۳۴۶ف تک غیر معمولی اضافہ ہوا۔ اس اضافہ کی وجہ غالباً مسابقت کی شدت ہو مسابقت کی وجہ سے نرخ میں کمی ہوئی۔ اور طلب میں زیادتی ہوئی۔ نتیجتہً مزدوروں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ مزدوروں

میں تقریباً ۹۰ فی صد کی تعداد دیہاتی ہے۔ ان میں سے اکثر مزدور اضلاع محبوب نگر۔ ورنگل۔ اور اطراف بلدہ کے رہنے والے ہیں۔ باقی شہری ہیں۔ یہ دیہاتی مزدور گو اپنے دیہات سے تعلقات رکھتے ہیں۔ مثلاً وقتاً فوقتاً عزیز اقربا سے ملنے جاتے ہیں لیکن ان کی اکثریت دیہات میں زرعی کاروبار انجام نہیں دیتی۔ ان میں سے بعضوں نے تو شہر میں مستقل سکونت اختیار کرلی ہے۔

بھرتی مزدوروں کی بھرتی کارخانہ کے سابقہ مزدوروں کے ذریعہ ہوتی ہے، یعنی اُن کو مطلع کیا جاتا ہے کہ کارخانہ کو اتنے مزید مزدوروں کی ضرورت ہے۔ یہ لوگ علی العموم اپنے عزیز و اقربا کو لاتے ہیں۔ ان مزدوروں میں اگر تھوڑے بہت فن سے آشنا ہوتے ہیں تو اُن کو اسی دن سے اُجرت پر رکھ لیا جاتا ہے اور جو مزدور کام نہ جانتے ہوں ان سے ایک ہفتہ تک بطور امتحان بلامعاوضہ کام لیا جاتا ہے۔ اگر اس کو کام کا اہل پاتے ہیں تو ملازم رکھ لیا جاتا ہے۔

اُجرت ملازم رکھنے کے بعد ادائی اُجرت کا یہ طریقہ ہے کہ دوسرے مہینے دس تاریخ کو اُجرت دی جاتی ہے۔ اُجرت کی تقسیم ماہانہ عمل میں آتی ہے اور اُجرت وقت کا طریقہ مروج ہے۔ مختلف مزدوروں کی اُجرت اُن کی کارکردگی کے لحاظ سے مختلف ہے۔ کم سے کم اُجرت ۶ر آنہ روزانہ اور زیادہ سے ایک روپیہ فی یوم ہے۔ آسانی اور وضاحت بیان کی خاطر ہم مختلف شعبہ جات میں کام کرنے والے مزدوروں کی اُجرت کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن یہاں بھی یکسانیت نہیں ہے۔ مثلاً اس شعبہ میں جہاں چادر کترتے اور صاف کرتے اور ڈزاین بناتے ہیں۔ اُجرتیں ۹ر ۱۱ر ۱۴ر آنہ ہیں۔ پینٹنگ کے شعبہ میں ۶ر ۸ر ۱۰ر ۱۴ر آنہ اور ایک روپیہ اُجرت ہے۔ منصقلہ کے شعبہ میں اُجرتیں ۱۲ر آنہ صہ ہیں۔ پیاکنگ کے شعبہ میں ۶ر ۸ر ۹ر اُجرتیں ادا کی جاتی ہیں۔ جن اُجرتوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ وہ ماہرفن مزدوروں کو دیجاتی ہیں۔ کارآموزوں کو ۴ر ۵ر آنہ دیئے جاتے ہیں۔ ۱۳۴۵ف میں جبکہ کل مزدور اوسطاً ۹۵ تھے۔ مزدوروں کی اُجرت کے اخراجات (۱۷۱۹۹) روپیہ تین آنہ گیارہ پائی تھی۔ اور ۱۳۴۶ف جب کہ مزدوروں کی تعداد ۱۳۵ تھی، کل مزدوری (۲۰۳۳۳) روپیہ تقسیم کی گئی۔

کام کے اوقات قانوناً دس گھنٹہ کام لیا جاسکتا ہے لیکن عملاً ۹ گھنٹہ کام لیا جاتا ہے۔ کام کے اوقات صبح ۸ بجے سے ۱۲ بجے تک شام ایک سے ۵ بجے تک مقرر ہیں درمیان میں ۱۲ تا ایک۔ ایک گھنٹہ کا وقفہ دیا جاتا ہے۔ مہینے میں ۲۶ دن کام ہوتا ہے۔ کیونکہ ہر ہفتہ میں ایک دن جمعہ کو تعطیل دی جاتی ہے۔ خاص خاص ایام مثلاً عیدین وغیرہ میں تعطیل دی جاتی ہے۔ موسم گرما میں کارخانہ کے اوقات یہی رہتے ہیں۔

جرمانہ مزدوروں پر کام کی خرابی اور غیر حاضری کی پاداش میں جرمانے کئے جاتے ہیں۔ بغیر اطلاع غیر حاضر ہونے پر دو دن کی مزدوری کاٹی جاتی ہے۔ ایک دن کی مزدوری تو غیر حاضر ہونے کے باعث اور دوسرے دن کی بطور جرمانہ غالباً اسی کا نتیجہ ہے کہ مزدور کم غیر حاضر ہوتے ہیں۔ خاص خاص مواقع پر رخصت دی جاتی ہے۔ اس صورت میں جرمانہ نہیں لیا جاتا، صرف مزدوری کاٹی جاتی ہے۔

کارکردگی، مہارتِ فنی و تعلیم مزدوروں کی کارکردگی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہر مزدور روزانہ (۵۰۰) سٹ بٹن کی تیاری میں حصہ لیتا ہے۔ ان کی مہارت فن کی یہ حالت ہے کہ سیاح بطور تحفہ یہاں کے بٹن لے جاتے ہیں۔ اور اس کارخانے کے اکثر نمونوں (ڈزاین) کو قبولیت عام حاصل ہے خصوصاً پینٹنگ اور منصقلہ کا کام قابل تعریف ہے۔ مختلف نمائشوں میں جو انعامات ملے ہیں وہ مزدوروں کی فنی مہارت کو ظاہر کرتے ہیں۔ مزدوروں کی فنی تعلیم کا کوئی باضابطہ انتظام نہیں ہے۔ اکثر مزدور کارخانہ ہی میں بطور کار آموز کام کرکے فنی قابلیت پیدا کرلیتے ہیں۔ اور بعض شوقین ایسے بھی ہیں۔ جو مفت کام کرتے ہیں۔ علاوہ بریں حیدرآباد میں بٹن سازی کی صنعت گھریلو طور پر بھی جاری ہے۔ لوگ گھروں پر اس فن سے تھوڑے بہت واقف ہوتے ہیں۔ کارخانہ میں مشاق بن جاتے ہیں۔

مزدوروں کا بیان ختم کرنے سے پہلے چند قانونی اُمور کا تذکرہ ضروری ہے۔ کارخانوں میں کام کرنے والے لڑکوں کے لئے قانوناً ۱۲ سال کے عمر کی قید ہے۔ ۱۲ تا ۱۵ سال کی عمر کے لڑکوں سے صرف چھ گھنٹہ کام لیا جاسکتا ہے۔ اس قانون کا اثر یہ ہوا کہ نفاذ قانون سے پہلے کارخانہ میں لڑکے کام کیا کرتے تھے۔ لیکن اس وقت ایک لڑکا بھی کام کرتا نظر نہیں آتا۔ وجہ یہ ہے کہ کار آموز لڑکے صرف چھ گھنٹے کام کرسکتے ہیں۔ لیکن کار آموز بالغ آدمیوں سے اسی معاوضہ پر دس گھنٹہ کام لیا جاسکتا ہے۔ اسی لئے بالغ آدمیوں کو لڑکوں پر ترجیح دی جاتی ہے۔

کارخانہ کی ترقی کے اسباب ہم بتا چکے ہیں کہ اس کارخانہ نے نہایت معمولی حیثیت سے اتنی ترقی حاصل کی۔ اس کی ترقی کے اسباب پر غور کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ اس طرح حیدرآباد میں بٹن سازی کی صنعت کے فروغ کے اسباب پر بھی روشنی پڑجائے گی۔

(۱) کارخانہ کے قیام اور ترقی میں مالک کارخانہ کی ذاتی محنت و کوشش فنی قابلیت اور ذہانت بہت بڑا دخل ہے۔ حیدرآباد کی موجودہ صنعتی پستی اور ہمت شکن ماحول کو دیکھتے ہوئے ان کی کوششیں یقیناً قابل تعریف ہیں۔

(۲) سستی محنت :- حیدرآباد میں اشیاء خام پر نسبتاً زیادہ اخراجات لاحق ہوتے ہیں۔ لیکن اس کی تلافی یہاں کی سستی محنت سے ہوجاتی ہے۔ بمبئی یا کلکتہ وغیرہ میں اگرچہ خام پیداواروں پر نسبتاً کم اخراجات لاحق ہوں گے لیکن وہاں اُجرتیں زیادہ ہیں۔

(۳) وسیع بازار :- کارخانہ یا بٹن سازی کے ترقی کا سبب یہ بھی ہے کہ اس کو مقامی طور پر ہی ایک بڑا بازار حاصل ہے۔ اسی کارخانہ کا سالانہ ۲۵ - ۲۰ ہزار روپیہ کے مال کی کھپت حیدرآباد میں ہوجاتی ہے۔

(۴) دکن بٹن فیکٹری کے ترقی کا ایک راز یہ بھی ہے کہ یہ فیکٹری ۲۰ سال سے قایم ہے۔ اسی قدامت کے باعث اس کی ساکھ قائم ہے۔ مال کی پائیداری اور نفاست کی وجہ سے عوام میں اس کا وقار پیدا ہوگیا ہے۔

(۵) کارخانہ نے سو روپیہ کے سرمایہ سے ڈھائی لاکھ روپیہ کے سرمایہ تک غیر معمولی ترقی کی ہے۔ اس کا ایک سبب غالباً یہ بھی ہے کہ ۱۹۲۵ء تک غیر معمولی منافع وصول ہوتا رہا۔ اس کے اور بھی وجوہات ہیں۔ اس زمانہ میں مصارف پیدائش بہت کم تھے۔ اس وقت تک یہ کارخانہ فیکٹری کی تعریف میں داخل نہ تھا۔ اور اسی لئے مزدوروں سے زیادہ وقت تک کام لیا جاتا تھا۔ لڑکوں سے بھی قلیل معاوضہ پر کام کرایا جاتا تھا۔ تعلیم کے اخراجات اس طرح زیادہ نہیں تھے۔ اس طرح مصارف پیدائش کم ہوتے تھے۔ اور دوسری طرف بٹن کافی گراں تھے۔ کیونکہ میدان میں کوئی دوسرا مقابلہ کرنے والا موجود نہ تھا چنانچہ پہلے پہل ۳۶ روپیہ فی درجن اور ۲۰ روپیہ فی درجن و ۱۴ روپیہ فی درجن قیمت تھی۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں کارخانہ کو بہت زیادہ منافع ہوا۔ اس کا ثبوت ہم کو اس امر سے بھی ملتاہے کہ ۱۹۲۵ء میں کارخانہ میں اہم تغیرات ہوئے۔ ۱۴ ہزار کا مکان بنوایا گیا۔ برقی مشنری کا استعمال بھی اسی زمانہ سے شروع ہوا۔ اور مزدوروں کی تعداد میں بھی کافی اضافہ ہوا۔ الغرض اس غیر معمولی منافع نے کارخانہ کو یہ رنگ و روپ بخشا۔

اصلاحی تجاویز یہ مضمون نامکمل رہے گا اگر ہم آخر میں بعض اصلاحی تجاویز پیش نہ کریں۔

(۱) بعض قانونی جکڑ بندیوں کو جو قبل از وقت ہیں کم کرنا چاہئے۔ مثلاً لڑکوں کے لئے عمر کی قانونی قید ہی۔ اس وقت ملک میں کئی ایسے لڑکے موجود ہیں جو چارخانوں یا مکانوں پر صد درجہ غیر صحت بخش کام بلا قید وقت انجام دیتے رہتے ہیں۔ اور بہت سے ایسے ہیں جو آوارہ پھر رہے ہیں۔ عمر کی اس قید سے ایک طرف صناعوں کو نقصان پہونچا کہ وہ لڑکوں کی سستی محنت کو حاصل نہیں کرسکے۔ اور دوسری طرف قوم کو بھی نقصان پہونچا کہ اس کا ایک ہونہار طبقہ فنی تعلیم کے حصول سے محروم رہا۔

عمر کی یہ قید اس وقت مناسب ہوتی جبکہ ابتدائی تعلیم لازمی کردی جاتی۔ اس لئے اس منزل سے پہلے عمر کی تحدید کرنا دانائی نہیں ہے خصوصاً اس حالت میں کہ کارخانوں کے علاوہ دیگر غیر صحت بخش کام کرنے کی ہمارے ہاں کوئی ممانعت نہیں ہے۔

عمر کی تحدید سے کہیں زیادہ ضروری مزدوروں کو حادثات کا معاوضہ دلانا تھا لیکن قانون میں اس طرف توجہ نہیں کی گئی

(۲) اوقات کار:- کام کے اوقات کا سوال بہت اہم ہے۔ موجودہ اوقات کار مناسب ہیں اس کارخانہ کے ترقی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ یہاں محنت نسبتاً سستی ہے۔ ایسی صورت میں اگر موجودہ کام کے اوقات گھٹا دیئے جائیں تو لازماً مزدوروں کی تعداد کو بڑھانا پڑے گا اور اس طرح اُجرت کی مقدار میں اضافہ ہوجائے گا۔ اور بالآخر ممکن ہے کہ مصارف پیدائش میں زیادتی ہوجائے۔ اس لحاظ سے موجودہ اوقات کار مناسب ہیں اس میں صرف اتنی اصلاح مناسب ہے کہ موسم کے لحاظ سے اوقات کار میں تبدیلی ہو۔

(۳) کارخانہ کی صفائی کے متعلق صرف اس قدر کہنا ہے کہ مزدوروں کے واسطے کھانا کھانے کے لئے کمرے وغیرہ کا معقول انتظام کیا جائے اس وقت اس قسم کا کوئی انتظام موجود نہیں ہے

(۴) فروخت کی مشکلات دور کرنے کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ باضابطہ تشہیر کی جائے۔ یہ مقصد ایک حد تک بڑے پیمانہ پر مصنوعات ملکی کی نمایش سے حاصل ہوسکتا ہے۔ حیدرآباد میں اور اضلاع پر زرعی نمائشیں ہر سال ہوا کرتی ہیں لیکن مصنوعات کی نمایش کی طرف کوئی توجہ نہیں کی جاتی۔ چند سال قبل ہمارے رعایا پرور بادشاہ نے جن کو ملکی صنعتوں کی ترقی سے بیحد دلچسپی ہے۔ ایک فرمانِ مبارک کے ذریعہ ملکی صنعتوں کی نمایش کرنے کا حکم جاری فرمایا تھا۔ اس فرمان واجب الاحترام کی تعمیل میں دو سال تک ملکی صنعتوں کی نمایش ہوتی رہی۔ لیکن بعد میں نہ معلوم کس لئے یہ نمایش بند ہوگئی۔ بزم معاشیات جامعہ عثمانیہ قابل مبارکباد ہے کہ اس نے پیوستہ سال مصنوعات ملکی کی نمایش منعقد کرکے ملکی صنعتوں کو تعلیم یافتہ طبقہ میں مقبول بنانے کی کوشش کی۔ ضرورت ہے کہ ممالک محروسہ میں ملکی صنعتوں کی نمایش ہوتی رہے ادارہ فروخت گاہ مصنوعات ملکی ہماری مصنوعات کو ہندستان کی مختلف نمایشوں میں بھیجکر ایک اچھا کام انجام دے رہا ہے۔

(۴) کارخانہ کے لئے یہ مناسب ہے کہ فروخت کی دقتوں میں کم سے کم پھنسے۔ اگر فروخت گاہ مصنوعات ملکی حیدرآباد اس کی سول ایجنسی لے لے تو بہت اچھا ہوگا۔ ایسی صورت میں کارخانہ اس ادارہ سے ڈپازٹ نہ لے تو بہتر ہے۔ اگر یہ ادارہ اپنے ذمہ یہ کام لے تو حکومت، اور کارخانہ دونوں کا فائدہ ہوگا۔ اور ادارہ کو کمیشن کی صورت میں نفع حاصل ہوگا۔ اور کارخانہ کو فروخت کی دقتوں سے نجات ملے گی۔

احمد خاں متعلم سال چہارم

غزل

نالۂ جانِ خستہ جاں عرشِ بریں پہ جائے کیوں
میرے لئے زمین پر، صاحبِ عرش آئے کیوں
دیکھے تجھے جو اک نظر، ہوش میں پھر وہ آئے کیوں
جس کو ترے قدم ملیں، سجدے سے سر اُٹھائے کیوں
بخشنے والا جب مرا عفو پہ ہے تلا ہوا
مجھ سا گناہ گار پھر جرم سے باز آئے کیوں

جس نے چڑھائیں تیوریاں نام سے میرے عمر بھر
اب وہ مرے مزار پر پھول چڑھانے آئے کیوں
امجد خستہ جان کی پوری ہو کیوں کر آرزو
دل ہی نہیں جب اس کے پاس مطلب دل بر آئے کیوں

امجد

مشرقی لندن کی سیر

پرانے زمانہ سے یہ کہاوت چلی آرہی ہے کہ "سیر و سیاحت سے تجربہ بڑھتا ہے اور معلومات میں اضافہ ہوتا ہے"۔ ایک تو اس کہاوت کے مدنظر دوسرے اس خیال سے کہ اس سال انڈین سائنس کانگریس کی جوبلی منائی جانے والی ہے اور اس میں نہ صرف ہندوستان بلکہ ممالک یورپ و برطانیہ کے بھی مشہور سائنس داں شرکت کرینگے۔ ہم نے بھی کلکتہ کے سفر کا ارادہ کرلیا۔ اور "ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم" کہہ کر ہم ٹرین میں سوار ہو گئے۔ (۶) بج کر (۵۵) منٹ پر گاڑی پلیٹ فارم سے آہستگی کیساتھ آگے بڑھی اور ہم دلچسپ تخیلات اور گوناگوں تصورات لئے ہوئے کلکتہ کی طرف روانہ ہوئے۔

بہت سی باتیں یاد آآکر مغموم کررہی تھیں اور بہت سی باتیں یاد آآکر ایک قسم کی مسرت کا احساس دل میں پیدا کررہی تھیں اکثر لوگوں سے ایک طویل مدت کی جدائی کے خیال سے دل بےچین ہو رہا تھا۔ اور بعض نئے نئے غیب دان احباب کے ملنے کے خیال سے ایک طرح کی خوشی بھی ہو رہی تھی۔ بہرکیف احساسات کے اس دریا میں بہتے ہوئے اور جذبات کے مدوجزر کا سامنا کرتے ہوئے ہم چلے جارہے تھے۔

ہمارے کمپارٹمنٹ میں زیادہ تر شمالی ہند اور بالخصوص دہلی، آگرہ، لکھنؤ وغیرہ جانیوالے لوگ تھے جس نشست پر ہمکو جگہ ملی اس پر ہماری یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کے ایک مولانا بھی تشریف فرما تھے، مقابل کی نشست پر اور لوگوں کے علاوہ

دو نوجوان شریف آدمی بھی تھے جن کی گفتگو سے پہلے یہ اندازہ ہوا کہ یہ شمالی ہند کے رہنے والے ہیں۔ اور بعد میں اس کی تصدیق ہوگئی۔ ایک صاحب رامپور جارہے تھے۔ اور دوسرے صاحب شاید میرٹھ۔ دوران گفتگو میں۔ "اردو ادب"، "شاعری"۔ "شاعر" "منتخب اشعار" وغیرہ پر ان کے خیالات سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ بعض شاعروں اور ادیبوں کے کلام کو بہت پسند کرتے ہیں۔ اور ایک طرح اُن کا پروپیگنڈا کر رہے ہیں۔ منجملہ اور شعراء کے انہوں نے علی اختر صاحب اختر کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ صاحب موصوف شمالی ہند میں بہت ہردلعزیز ہوگئے ہیں۔ اور ہر شخص آپکے کلام کو پسند کرتا ہے۔ خاص طور پر اختر صاحب کی نظم "اُو دیس سے آنیوالے بتا کس حال میں ہیں یاران وطن"۔ بہت مقبول ہوئی ہے۔ ان حضرات نے علی اختر صاحب کے علاوہ اور متعدد شعراء کے منتخب اشعار سنائے۔

جہاں تک میری ذاتی رائے کا تعلق ہے۔ اور میں نے علی اختر کے کلام کا مطالعہ کیا ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ علی اختر عہد حاضرہ کے شعراء کی صف اول میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔

یہ گفتگو کچھ اس قدر دلچسپ تھی کہ ہمارے شعبہ دینیات کے لکچرار صاحب بھی اس میں حصہ لئے بغیر نہ رہ سکے۔ قدیم شاعروں کے عشقیہ جذبات سے لبریز اشعار کے بہترین نمونے پیش فرمائے جو مجھے یاد نہیں ہیں اور جو زیادہ تر "وصل"۔ "فراق"۔ "آہ" و "نالہ" سے مملو تھے۔ لکچرار دینیات کی زبان سے اس قسم کے اشعار سُن کر مجھے حیرت ہوئی لیکن مجھے حیرت نہ ہونی چاہیئے۔ اس لئے کہ شاعری کسی خاص فرقہ کسی خاص قوم یا کسی خاص گروہ کے لئے نہیں ہے بلکہ وہ "صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے"۔

ایک شعر جو "مولانا" نے سنایا وہ مجھے اچھا معلوم ہوا۔ اور مجھے یاد بھی ہوگیا۔ اس لئے کہ نہ صرف اس میں شاعری ہے بلکہ سچے جذبات بھی ہیں۔ وہ شعر یہ ہے :-

~~گیا~~ کلپے ہے سجنی سجن کے لئے   جیسے کلپے مسافر وطن کے لئے۔
ایسے

(۲)

صبح وارد ھا پہنچ کر گاڑی تبدیل کی اور بنگال ناگپور ایکسپریس کے ذریعہ کلکتہ کی طرف روانہ ہوئے۔ وارد ھا سے کلکتہ تک کا سفر بہت بے لطفی سے گذرا۔ چند بمبئی کے مسلمان تاجر تھے، جو یا تو تاش کھیلتے تھے یا ڈیڑھ ڈیڑھ بالشت کی لانبی بیڑیاں پی کر سارے کمپارٹمنٹ میں دھواں دھار مچارہے تھے۔ اس لئے ان میں کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا جس سے میں گفتگو کرتا۔ چند بنگالی ہندو اور چند مارواڑی بھی تھے لیکن کوئی میری دلچسپی کو اپنی طرف منعطف نہ کرسکا۔ اور اس لئے مجھے بالکل خاموش رہنا پڑا۔

اس سفر کی ایک دلچسپ اور نہایت اہم بات یہ ہے کہ اس کمپارٹمنٹ میں مختلف مذہب اور مختلف صوبوں کے باشندے تھے۔ اور ہر ایک کی الگ الگ مادری زبان تھی مثلاً گجراتی، بنگالی، مرہٹی، پنجابی، اور اردو وغیرہ، اور وہ سب اپنے ہم قوموں سے اپنی مادری زبان میں گفتگو کرتے تھے لیکن جب ایک صوبہ کا باشندہ دوسرے سے گفتگو کرتا تو وہ آسانی سے اردو میں بات چیت کرتا۔ اور میں نے اس امر پر غور کیا کہ بنگالی، گجراتی، مرہٹی اور پنجابی زبانیں بولنے والے بھی نہایت آسانی سے اردو میں بات چیت کر سکتے تھے۔ اور اپنا مفہوم سیدھی اور آسان زبان میں ادا کر سکتے تھے۔ چنانچہ یہ بات دلیل ہے اس حقیقت کی کہ، اگر ہندوستان میں کوئی قومی یا ملکی عام زبان ایسی ہو سکتی ہے جس کو لنگوا فرانکا کہا جائے تو وہ صرف اردو (ہندوستانی) ہی ہے جس کو ہر صوبہ کا باشندہ آسانی سے سمجھ اور بول سکتا ہے۔

(۳)

جس نے کلکتہ دیکھا ہے اسکے لئے تو وہ کوئی نئی بات نہیں لیکن جس نے اب تک کلکتہ نہیں دیکھا اس کو ایک بار ضرور دیکھنا چاہیئے۔ اس لئے کہ کلکتہ "مشرق کا لندن" اور حکومت برطانیہ کا دوسرا سب سے بڑا شہر ہے۔ اور اگر مجموعی حیثیت سے کلکتہ کو دیکھا جائے وہ "مشرق کا لندن" کہلائے جانے کا مستحق بھی ہے۔

ٹرین صبح (۷) بجے کلکتہ کے مشہور اسٹیشن "ہاوڑہ" پر پہنچی۔ یہ اسٹیشن بہت بڑا ہے اور اپنی چہل پہل اور کاروبار، ٹرینوں کی آمد و رفت اور شور و غل کی وجہ سے اس قابل ہے کہ یہاں کچھ دیر ٹھہر کر سیر و تفریح کی جائے۔

اسٹیشن سے، پریزیڈنسی کالج کو جاتے ہوئے۔ ہم جس سڑک پر گذرے اس کی دونوں جانب بازار اور دوکانیں اور مکانات تھے۔ وہ اپنے اندر "باروداریت" لئے ہوئے تھے۔ سڑکیں بھی صاف نہ تھیں۔ مکانات قدیم ہندوانہ طرز کے کئی کئی منزلہ، خوش مذاقی اور خوش نمائی کا ان میں پتہ بھی نہ تھا سب بالکل کاروباری انداز کے۔ چنانچہ اس سڑک کو دیکھ کر تو ہماری سمجھ میں بالکل نہ آیا کہ ہم اسکو "مشرق کا لندن" تصور کریں۔

ہم کو اپنی قیام گاہ تک پہنچنے میں اور بھی دو چار سڑکوں پر سے گذرنا پڑا۔ اور بعض سڑکیں اپنی نفاست، پاکیزگی، صفائی اور دوکانوں کی آراستگی اور خوش نمائی کے لحاظ سے پہلی سڑک سے بدرجہا بہتر تھیں۔

(۴)

کلکتہ میں تقریباً تین ہفتہ تک میرا قیام رہا۔ اور اس مدت میں مجھے کلکتہ کو بہت تفصیلی طور پر گھوم پھر کر دیکھنے کا موقع ملا۔ میں نے اس کی بیرونی حالت کو بھی دیکھا۔ اور اسکی اندرونی کیفیتوں کا بھی مشاہدہ کیا۔ میں نے وہاں کی اُن سڑکوں کو بھی دیکھا۔ جہاں سیر و تفریح کرنے سے فرحت حاصل ہوسکتی ہے۔ اور میں اُن غلیظ، تنگ و تاریک گلیوں میں سے بھی گذرا جنکے اندر پہنچ کر ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ انسان کسی دنیاوی جہنم کے کسی تاریک گوشہ میں ڈال دیا گیا ہے۔ اُن عالیشان، فلک بوس، عمارتوں کو بھی دیکھا، جن میں رہنے سے دنیا کی تمام راحتیں اور نعمتیں میسر ہوسکتی ہیں اور جن میں رہنے والے اپنے آپ کو عام انسانوں سے کسی قدر بالا و برتر سمجھتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ۔ اُن بھول بھلیاں نما مکانوں، بلکہ تہ خانوں اور سرنگوں کو بھی دیکھا۔ جنکے اندر بسنے والے آدمیوں کو نہ تو تازہ ہوا نصیب ہوسکتی ہے اور نہ دھوپ کی حدت اور روشنی جنکے چہروں پر نہ تو تازگی نظر آتی ہے اور نہ فرحت، اسکے برعکس وہ مرجھائے، کمھلائے اور افسردہ نظر آتے ہیں چنانچہ یہ کہنا کہ کلکتہ میں دن ہی دن ہے اور رات نہیں ہوتی، صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ دن کے ساتھ رات اور نور کیساتھ تاریکی ضرور ہوتی ہے۔ اور کلکتہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہوسکتا۔

کلکتہ کی سڑکیں عموماً کشادہ اور وسیع ہیں۔ بعض خاص سڑکوں پر آمد و رفت کی کثرت کی وجہ سے میلہ سا لگا رہتا ہے یہاں نقل و حرکت کے ذرائع بھی کافی ہیں۔ اور کرایہ بھی دوسرے بڑے شہر مثلاً دہلی، لاہور، لکھنؤ وغیرہ کے مقابلہ میں کم اور سستا ہے بڑی سڑکوں پر ٹرام گاڑی کے علاوہ موٹر بسیں، فٹن، وکٹوریہ، موٹر ٹیکسی اور رکشا (آدمی اس گاڑی کو کھینچتا ہے) چلتی ہیں۔ چھوٹی سڑکوں اور کوچوں میں، فٹن اور رکشا عام طور پر بہت کم کرایہ پر چلتی ہیں۔ ٹرام گاڑیاں آرام دہ ہیں اور اُن کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ انکے نگران یا کنڈکٹر اس قدر بدتمیز اور بداخلاق نہیں ہوتے جیسے ہمارے یہاں کے بسوں کے ہوتے ہیں، وہ عموماً بہت نیک اور بااخلاق ہوتے ہیں۔ ٹرام گاڑیوں کے کرایہ میں ایک رعایت یہ بھی رکھی گئی کہ ہر اتوار اور بنک کی تعطیل کے چھ آنہ کا ٹکٹ جاری کیا جاتا ہے جو تمام دن کے لئے ہوتا ہے۔ اس ٹکٹ سے آپ سارے دن صرف ٹرام میں بیٹھ کر پورا شہر جہاں جہاں ٹرام جاتی ہے پھر سکتے ہیں۔ ایسے رعایتی ٹکٹ اگر ہمارے یہاں سرکاری بسوں میں بھی جاری کر دیئے جائیں تو عوام الناس کو بہت آرام ہو جائے اور ریلوے بسوں کو بھی نفع ہو۔

سنتے تھے کہ کلکتہ کرسمس کے دن دیکھنے کے قابل ہوتا ہے - اسی خیال سے ہم بھی ٹھیک کرسمس کی صبح کو کلکتہ پہنچ گئے۔ تاکہ کرسمس کا لطف کامل طور پر اٹھا سکیں۔

قیام گاہ سے روانہ ہو کر اپنے ایک دوست کے ساتھ "چورنگی" گیا جو کلکتہ کا ایک بہت ہی مشہور مقام اور تفریح گاہ بھی کہی جا سکتی ہے۔ یہاں پہنچ کر کرسمس کے اصل منظر نظر آئے یعنی، یوروپین، اینگلو انڈین اور دیسی عیسائی، مرد اور عورتیں، نئے نئے اور فیشنی لباس میں، سینما کی متحرک تصاویر کے مانند ہر طرف حرکت کرتی ہوئی نظر آرہی تھیں- لڑکے، بچے، جوان، بوڑھے، عورتیں اور لڑکیاں سب ایک خاص مسرت اور خوشی کا اظہار کر رہے تھے- بڑی بڑی، یوروپین اور اکثر اس مقام پر واقع ہوئی ہندوستانی دوکانوں کو بھی بہت سلیقہ سے آراستہ کیا گیا تھا- اور ان دوکانوں میں کرسمس اور نئے سال کی مبارکبادی نئے نئے طریقوں سے لکھ کر آویزاں کی گئی تھیں۔

مجھے کلکتہ میں کرسمس کے بعد بھی رہنے کا موقع ملا لیکن ایسی چہل پہل اور لوگوں کی ایسی کثرت نظر نہیں آئی- اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان کے ہر گوشہ سے یوروپین عام طور پر کلکتہ آکر کرسمس کی خوشیاں مناتے ہیں اور اسی وجہ سے کلکتہ میں کرسمس کی چہل پہل اور رونق زیادہ رہتی- اور نہ صرف یہی کہ لوگ زیادہ چلتے پھرتے ہیں بلکہ خرید و فروخت بھی بہت بڑھ جاتی ہے- بڑے بڑے ہوٹلوں اور سینما ہالوں میں بھی خاص رونق اور ہنگامہ برپا رہتا ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے "چورنگی" سے روانہ ہو کر ہم لوگ نیو مارکٹ گئے- جو کلکتہ کا بہترین، اور ہندوستان کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ خوب صورت اور سب سے زیادہ بارونق مارکٹ ہے- یہاں بھی کرسمس کی رنگینیاں ہر طرف رنگ پاشی کر رہی تھیں اور ایک ناظر کی توجہ اپنی طرف منعطف کر رہی تھیں۔

ان مقامات کے علاوہ مجھے اور بھی دوسرے مقامات، مثلاً پارک سرکس، ویلزلی اسٹریٹ وغیرہ بھی جانے کا موقع ملا- جہاں یوروپین اور دیسی عیسائیوں کی آبادی ہے۔ ہر جگہ کرسمس کی دھوم دھام نظر آرہی تھی۔

چونکہ یہاں مچھلی بکثرت پائی جاتی ہے اس لئے بنگالی عموماً ماہی خور ہوتے ہیں اور ہر وقت کے کھانے میں مچھلی کسی نہ کسی صورت میں دسترخوان پر ضرور موجود ہوتی ہے۔

سڑکوں پر چلنے والے رہرو عموماً ٹوپی سے بے نیاز نظر آتے ہیں- کرتا، دھوتی، اور ایک چادر کندھے اور کرتے لپیٹے رہنا بنگالی ہندوؤں کا خاص لباس ہے- غریبوں اور مزدوروں کی تعداد بعض سڑکوں پر زیادہ نظر آتی ہے۔

ترکی ٹوپی تبرک کے طور پر کہیں کہیں دکھائی دیتی ہے۔ اور یہی حال شیروانی کا ہے۔

کلکتہ کے قابل دید مقامات اور عمارات

باغ حیوانیات Zoological garden ہندوستان کے تمام حیوانی باغوں میں سب سے بڑا باغ سمجھا جاتا ہے یہ ایک بہت وسیع اور کشادہ رقبہ پر محیط ہے۔ اسکے اندر کئی ایک قدرتی تالاب ہیں اور مصنوعی جھیلیں بنائی گئی ہیں۔ اور ہر قسم کے جانوروں کو جو دنیا کے ہر گوشہ میں پائے جاتے ہیں فراہم کیا گیا ہے۔ ان جانوروں کی فہرست طوالت کے باعث درج نہیں کیجا سکتی۔ مختصر یہ کہ ہر قسم کے پرندے، ہر قسم کے رینگنے والے جانور، ہر قسم کے چوپائے اور دودھ پلانے والے جانور ہر قسم کے یہاں موجود ہیں۔ ہیپوپٹاس (سمندری گھوڑا) اور گینڈا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ہاتھی، اونٹ اور جیراف بھی رکھے گئے ہیں۔ جانوروں کے ساتھ اُن کا نام، اُن کا جائے وقوع، اُن کی زندگی کے مختصر حالات بھی تختیوں پر درج کئے گئے ہیں۔ اور ایک شخص ان تختیوں کو پڑھ کر بآسانی ایک جانور کے متعلق تھوڑا بہت علم حاصل کر سکتا ہے۔

باغ نباتات Botanical garden دریائے ہگلی کے دوسرے کنارے پر واقع ہے۔ اور اسمیں جانے کے لئے دخانی کشتیاں یا معمولی کشتیاں ہیں۔ جو بہت کم اجرت پر لوگوں کو باغ تک پہنچا دیتی ہیں۔

باغ ایک بہت ہی وسیع اور کشادہ رقبہ پر پھیلا ہوا ہے اور بہت دور تک دریا کے کنارے کنارے چلا گیا ہے۔ اس باغ کو کامل طور پر گھوم پھر کر دیکھنے کے لئے پورے ایک دن کی ضرورت ہے۔ یہاں قدرتی درخت اور پودوں کے علاوہ خاص طور پر لگائے ہوئے درخت بھی بے شمار ہیں۔ جا بجا تالاب ہیں جنکے اندر سرخ زرد سفید رنگ کے کنول تیرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور بہت خوش نما معلوم ہوتے ہیں۔

سب سے زیادہ قابل دید، بڑ (برگد) کا ایک عجیب و غریب درخت ہے جو ایک سو اڑسٹھ (۱۶۸) سال کا پرانا ہے۔ اس میں (۶۴۱) ہوائی شاخیں ہیں جو درخت سے نکل کر زمین کے اندر داخل ہو گئی ہیں اور ستون کی مانند نظر آتی ہیں۔ یہ تمام شاخیں ایک بہت بڑے دائرہ رقبہ پر پھیلی ہوئی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک شامیانہ ہے جو متعدد ستونوں پر کھڑا کیا گیا ہے۔ ہم نے اس درخت کی دو تین تصویریں بھی کھینچیں۔

عجائب خانہ یہ عجائب خانہ چورنگی کی بڑی سڑک پر ہی واقع ہیں اور ہندوستان کا سب سے بڑا عجائب خانہ

سمجھا جاتا ہے۔ پورے عجائب خانہ کو تفصیل کے ساتھ دیکھنے کے لئے دو دن بھی کافی نہیں ہو سکتے۔ اگر سرسری طور پر بھی دیکھا جائے تو کم سے کم چار پانچ گھنٹے درکار ہونگے۔ عمارت بہت وسیع دو منزلہ اور قدیم طرز کی ہے اس عجائب خانہ میں تاریخی یادگاریں بھی ہیں اور صنعت و حرفت کے نادر اور نایاب نمونے بھی موجود ہیں۔ ہر قسم کی دھاتیں، انواع و اقسام کے پتھر، کپڑے، جڑی بوٹی، درختوں کے تخم، لکڑی کا سامان، پیتل، تانبا اور لوہے کی اشیاء، فن مصوری کے بیش قیمت نمونے، دستی صنعتوں کی عدیم المثال اشیاء۔ آلات حرب اور بے شمار دیگر اشیاء جو ایک مستقل فہرست کا مطالبہ کرتی ہیں، موجود ہیں اور دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

مندرجہ بالا اشیاء کے علاوہ، مردہ جانوروں کو بھی محفوظ رکھا گیا ہے۔ یا ان کے ڈھانچے جو مل سکے ہیں ان ڈھانچوں میں خاص طور پر وہیل مچھلیوں کی ہڈیاں، ہاتھی، گینڈا اور بہت سے دوسرے بڑے اور چھوٹے جانوروں کے پورے ڈھانچے قابل دید ہیں۔ تقریباً ہر قسم کے چھوٹے بڑے جانور محفوظ رکھے ہیں۔ جن میں پرندے اور رینگنے والے جانور، جل تھلئے، سانپ، مچھلیاں، بندر، گھڑیال، مگر اور تمام دوسرے دودھ پلانے جانور بھی موجود ہیں۔

وکٹوریہ میموریل یہ ایک نہایت خوب صورت عمارت ہے جو ریس کورس سے قریب واقع ہے۔ یہ ساری عمارت سنگ مرمر سے بنائی گئی ہے۔ کلکتہ کے لوگوں میں اس عمارت کے متعلق یہ روایت عام طور پر مشہور ہے کہ لارڈ کرزن نے یہ خواہش کی تھی کہ تاج محل کے جواب میں ایک عمارت تعمیر کی جائے۔ چنانچہ اس عمارت کی بنا ڈالی گئی اور اس کو اختتام تک پہنچایا گیا لیکن مکمل ہو جانے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ عمارت تاج محل کے پاسنگ بھی نہیں ہو سکتی۔ یہ ضرور ہے کہ یہ عمارت اپنی خوب صورتی کے اعتبار سے تاج محل کے بعد ہندوستان کی سب سے پہلی عمارت سمجھی جاتی ہے۔ اس عمارت کے چاروں طرف ایک وسیع اور کشادہ باغ ہے اور اسکے سب سے اونچے گنبد پر کھڑے ہونے سے سارا شہر نظر آتا ہے۔ اسکے اندر سب سے زیادہ قیمتی اور خوب صورت ہندوستانی فن مصوری کا ایک نمونہ ہے۔ جو اسکے ایک بڑے ہال کے بیچ میں دیوار پر لگایا گیا ہے۔ یہ تصویر بہت بڑی ہے اور اتنی بڑی ہے کہ ہم نے آجتک اتنی بڑی اور ایسی خوب صورت تصویر نہیں دیکھی۔ اس تصویر میں راجہ جودھپور کے ہاتھیوں کا ایک جلوس سڑک پر سے گذرتا ہوا دکھایا گیا ہے۔ اس میں راجہ خود سب سے اگلے ہاتھی پر بیٹھا ہوا ہے وہاں سے ایک

ضعیف یوریپین ظریف طبع رہنمانے ہم سے کہا کہ امریکن سیاح اس تصویر کی قیمت (۱۲) لاکھ دیرہے تھے لیکن گورنمنٹ نے اس تصویر کو نہیں دیا اور نہ دینے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس تصویر کے علاوہ بے شمار دوسری تصاویر ہیں جن کا تعلق زیادہ تر وکٹوریہ کے عہد حکومت سے ہے۔ ان تصویروں کے علاوہ بعض قیمتی کپڑے اور لباس وغیرہ ہیں۔ اکثر کمروں میں، جارج پنجم ایڈورڈ اور اکثر گورنر جنرلوں کے قدآدم مجسّمے ہیں۔ وکٹوریہ کے متعدد مجسّمے ہیں جو اکثر کمروں میں رکھے ہوئے ہیں۔ گورنروں اور پادشاہوں کی قد آدم تصویروں کے علاوہ بعض مشہور ہندوستانیوں کی بھی تصاویر ہیں۔ مثلاً راجہ رام موہن رائے۔ کشب چندرسین۔ بانی برہموسماج مذہب وغیرہ۔

نیو مارکٹ

سیّاحین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ کلکتہ کا نیو مارکٹ اپنی وسعت۔ اپنی خوب صورتی۔ اپنی سجاوٹ اور آراستگی کے لحاظ سے ہندوستان کا سب سے بڑا مارکٹ ہے۔ یہ مارکٹ چورنگی سے بالکل قریب اور سڑک سے کسیقدر پیچھے ہٹ کر ہے۔ یہ ایک وسیع رقبہ پر پھیلا ہوا ہے اور اسکے اندر جانے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک بہت بڑی دوکان کے اندر ہیں جسکے اندر بہت لانبے لانبے ہال اور کمرے ہیں۔ اسکے اندر دنیا بھر کی چیزیں موجود ہیں۔ مختلف اشیاء کی شاخیں الگ الگ ہیں اور ایک شاخ صرف ایک ہی قسم کی متعدد دوکانیں ہیں۔ جو نہایت عمدگی اور سلیقہ سے آراستہ کی گئی ہیں ان کی الماریاں، نمائشی خانے، ان کی صفائی، ان کی ترتیب۔ غرض ہر ہر بات پر داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ اس قدر عمدہ، اتنی پاک صاف، اتنی بڑی اور شاندار مارکٹ ہم نے اب تک کہیں نہیں دیکھی۔ جب ہم اس مارکٹ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے شہر کی مارکٹ کے سکوت اور سناٹے کا خیال کرتے ہیں تو سخت افسوس ہوتا ہے۔ کہ کتنی شاندار اور قیمتی مارکٹ کیسی سنسان پڑی رہتی ہے۔ کرسمس کی وجہ سے اس کی رونق دوبالا ہوگئی تھی۔ یہاں عموماً ہر قوم اور مذہب کے شرفاء اور خواتین خرید و فروخت کرنے کیلئے آتی ہیں۔ اور شام کو تو ایک اچھا خاصہ میلا لگا رہتا ہے۔ عموماً لوگ شام کو یہاں تفریح کی غرض بھی آیا کرتے ہیں۔

نیو مارکٹ کے متعلق ایک یہ بات قابل افسوس معلوم ہوتی ہے کہ یہاں اشیاء کا نرخ مقررہ نہیں بلکہ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ اور جس حیثیت کا گاہک ہوتا ہے اسی لحاظ سے قیمت بتائی جاتی ہے۔ اکثر اجنبی اُن کے فریب میں آکر قیمتیں زیادہ دیدیتے ہیں۔ اس لئے ہوشیار رہنا چاہیئے۔

ایڈن باغ

ڈلہوزی اسکوئر سے تھوڑے فاصلہ پر ہگلی کو جانے کے راستہ میں پڑتا ہے۔ اور کلکتہ کے

اس سمت کے باشندوں کے لئے ایسی ہی تفریح و سیر کی جگہ ہے۔ جیسا کہ ہمارے یہاں کا باغ عام۔ اس کا رقبہ بھی باغ عام سے زیادہ ہے اور مقابلتہً زیادہ نیچرل ہے۔ اسکے اندر قدرتی مناظر، قدرتی تالاب. گھاس کے فرش، اور روشوں کے سایہ دار کنج ہیں۔ سبزہ زاروں کے بیچ بیچ میں راستے بنائے گئے ہیں۔ زمین کی سطح نیچی اونچی اور غیر ہموار ہے۔ اسکے اندر کھلی ہوئی زمین زیادہ ہے اور درخت کم ہیں۔ پھولوں کے تختے جا بجا نظر آتے ہیں۔ تالابوں کے اندر سرخ رنگ کے کنول کے پھول اور پتے، اور پانی کے اندر تفریح کرنے والوں کا انعکاس خاص دلکشی رکھتا ہے۔ اسکے اندر ایک چینی وضع کی مختصر سی سائبان نما عمارت ہے جس کا رنگ سیاہی مائل سرخ ہے۔ یہ عمارت دیکھنے میں خوبصورت معلوم ہوتی ہے یہاں پر لوگوں کا ہجوم تھا جن میں مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے، لڑکے، لڑکیاں سب ہی تھے۔ مجموعی طور پر یہ باغ بڑا دلکش ہے۔ اس کی دوسری سرحد اس سڑک پر ختم ہوتی ہے جو بالکل ہگلی کے کنارے ہے اور یہاں سے ہگلی کے اندر جہاز اور کشتیوں کا منظر بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔

پریزیڈنسی کالج اور میڈیکل کالج یہ دونوں عمارتیں قدیم وضع اور قدیم زمانہ کی ہیں اور بہت وسیع اور دلکش ہیں۔ میڈیکل کالج کے انتظامات بہت باقاعدہ اور آرام دہ ہیں۔ ان کے یونیورسٹی کالج آف سائنس کی عمارت بھی دیکھنے کے قابل ہے۔

ڈلہوزی اسکوئر کے اطراف میں قدیم زمانہ اور قدیم وضع کی انگریزوں کی تجارتی کوٹھیاں اور انگریزوں کی آبادی ہے۔ یہ مقام بہت صاف اور ستھرا معلوم ہوتا ہے۔ یہاں پر ڈاکخانہ کی عالیشان عمارت، ہائکورٹ کی عمارت اور متعدد انشورنس کمپنیاں اور بڑے بڑے کارخانوں اور ریلوں کے دفتر ہیں۔ اسی مقام پر گورنمنٹ ہاوس یا گورنرس کوٹھی ہے۔ یہ ایک قدیم وضع کی بہت بڑی عمارت ہے اور اس پر گنبد بھی بنے ہوئے ہیں۔ اسکے چاروں طرف بہت وسیع پارک اور سبزہ زار ہیں جو ایک چار دیواری سے گھرے ہوئے ہیں۔

ڈلہوزی اسکوئر میں ایک بہت بڑا پارک بھی ہے۔ جہاں عموماً شام کو لوگوں کا مجمع رہتا ہے

تفریح گاہیں مشرقی لندن میں سیر و تفریح کے لئے بہت سے دلچسپ اور دلکش مقامات ہیں۔ نیچرل بیوٹی اور مناظر کے لحاظ سے، ڈھکوریا جھیل قابل دید ہے۔ یہ شہر کے مضافات میں، بالی گنج کے حدود میں واقع ہے جھیل قدرتی ہے اور بہت بڑی ہے اس کا رقبہ تخمیناً حسین ساگر کے برابر ہے۔ بیچ میں کہیں کہیں

جزیرے ہیں اور ان میں کھجور اور اسی قسم کے دوسرے درخت پائے جاتے ہیں۔ ایک جزیرہ سڑک سے قریب ہے۔ اس جزیرہ میں جانے کے لئے ایک چھوٹے کا پل بنایا گیا ہے۔ اور اس پر چلنے سے پل ہلتا ہے۔ جزیرہ میں ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد ہے جسکے چاروں طرف پارک ہے۔ رات کو ایک کنارے سے اس پر روشنی ڈالی جاتی ہے تو یہ مسجد بڑی خوب صورت معلوم ہوتی ہے اور رات کے وقت یہاں کا منظر بہت خوش نما اور دلکش ہوتا ہے۔

یہاں تقریباً ہر بڑی سڑک پر ایک باغ عام ہے جس کے اندر عموماً بڑے بڑے مصنوعی تالاب بنائے گئے ہیں اور یہاں لوگوں کی کثیر تعداد تفریح کرتی نظر آتی ہے۔

سینما ہال، یہاں سب سے بڑی تفریح گاہیں ہیں۔ مجھے معلوم ہوا کہ تقریباً ڈیڑھ سو سینما ہال سارے شہر میں پائے جاتے ہیں چند انگریزی اور چند بنگالی اور بقیہ ہندوستانی زبان کی فلموں کے لئے مختص ہیں۔ چورنگی پر انگریزوں کا ایک خاص سینما ہال ہے جس کا نام "میٹرو" ہے سنا جاتا ہے کہ اس پر چار پانچ لاکھ روپیہ صرف کیا گیا ہے۔ یہ بالکل انگریزی وضع کا ہے اور اسکے انتظامات بہت اعلیٰ پیمانہ کے ہیں۔ عمارت بہت خوب صورت اور بڑی ہے۔ ہندوستان کا یہ ایک بڑا سینما ہال سمجھا جاتا ہے۔ اس میں صرف انگریزی فلموں کی نمائش ہوتی ہے۔ اسکے قریب ہی تھوڑی دور دائیں جانب ہندوستانیوں نے ایک بہت اچھا سینما ہال تعمیر کیا ہے جس کا نام پیراڈائز (بہشت) ہے اس پر بھی دو لاکھ روپیہ صرف کیا گیا ہے اور بہت اچھا ہال ہے۔

کلکتہ میں ہوٹلوں کی بھی کثرت ہے۔ ادنی اور اعلیٰ ہر قسم کے ہوٹل موجود ہیں۔ گرانڈ ہوٹل - فرپوس - وغیرہ بہت اعلیٰ پیمانہ کے اور قابل دید ہوٹل ہیں۔

دوکانیں بہت بڑی بڑی ہیں اور متعدد کارخانے ہیں۔ جہاں کپڑے، دوائیں اور دوسرا سامان تیار ہوتا ہے۔ سب سے بڑی دوکان "وائٹ وے لیڈلا" کی ہے جو بذات خود ایک مارکٹ ہے۔ اور یہاں ہر قسم کا سامان فروخت ہوتا ہے۔

(۶)

علمی دلچسپیاں

"مشرقی لندن" ادبی دلچسپیوں سے خالی نہیں ہے، اگر ایک طرف ٹیگور اور قاضی نذر الاسلام جیسی بلند پایہ، قابل، اور عالم شخصیتیں بنگالی زبان میں لکھنے والی موجود ہیں تو دوسری طرف

علامہ ابوالکلام آزاد، اور علامہ رضا علی وحشت، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی، علامہ ہندی، مولانا ناطق لکھنوی، حضرت آرزو لکھنوی، پروفیسر بیخود، جناب اصغر حسین صاحب شور باغ اردو کی آبیاری کر رہے ہیں۔ اور بنگال جیسے خطہ میں بھی "اردو" اسی طرح پھول پھل رہی ہے جس طرح دوسرے صوبوں میں، اور ہر بنگالی (خواہ ہندو ہو یا مسلمان) اردو بول اور سمجھ سکتا ہے۔ اور یہی اردو کی ہمہ گیری کی دلیل ہے۔ اور اسکے "لنگوا فرانکا" بننے کی اہلیت کا ثبوت ہے جس طرح ٹیگور بنگال کا ایک زبردست مضمون نگار اور شاعر ہے۔ اسی طرح قاضی نذرالاسلام کو بھی ہر دلعزیزی حاصل ہو چکی ہے اور تمام ہندو مسلمان اس کو ایک بہت بڑا عالم، شاعر، ادیب سمجھتے ہیں۔ جن حضرات نے قاضی نذرالاسلام کے کلام کا مطالعہ کیا ہے وہ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں اسکے کلام میں کتنی جدت، کتنا جوش، کس قدر اعلیٰ جذبات اور کتنے بلند پایہ خیالات ہوتے ہیں، میرے ایک ہندو بنگالی دوست مسٹر مکرجی نے (جو سنٹرل سرائے کے ریلوے اسکول میں ماسٹر ہیں) مجھے نذرالاسلام کی متعدد نظمیں بنگالی زبان میں سنائیں جو اُن کو حفظ تھیں۔ مثلاً بدروہی (باغی) اُن کا مفہوم سمجھایا اور بتایا کہ وہ اپنے رنگ کا ایک انوکھا شاعر ہے اور اس کا رنگ سب سے جدا ہے۔ تخیل کی بلند پروازی میں وہ کبھی کبھی ٹیگور سے بھی بڑھ جاتا ہے اور کیا عجب ہے کہ ایک روز وہ بھی ٹیگور کے مانند سارے ہندوستان کا ہر دلعزیز شاعر اور ادیب بن جائے۔

ادبی لوگوں میں، سب سے پہلے میری ملاقات علامہ رضا علی وحشت سے ہوئی جو کلکتہ کی ایک بہت ہر دلعزیز با اخلاق اور محترم ہستی ہیں۔ آپ کو گورنمنٹ کی طرف سے خان بہادر کا خطاب بھی عطا ہوا ہے۔ آپ اسلامیہ کالج میں اُردو کے پروفیسر تھے لیکن اب وہ وظیفہ پر سبکدوش ہو چکے ہیں۔ پھر بھی سن رسیدگی اور ضعیفی میں کمی نہیں علمی اور ادبی مشاغل کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ آپ کے بے شمار شاگرد ہیں جن پر آپ کی نظر کرم ہر وقت رہا کرتی ہے۔ اردو "ادب" سے دلچسپی رکھنے والے حضرات علامہ کے اسم گرامی سے واقف ہونگے۔ صاحب موصوف راقم کے نام سے بہت زمانہ سے واقف تھے۔ انتہائی اخلاق اور مہربانی سے پیش آئے۔ ان کی گفتگو اور ان کے اخلاق سے میں بیحد متاثر ہوا۔

صاحب موصوف نے راقم کے اعزاز میں ایک عصرانہ ترتیب دیا تھا جس میں وہاں کے بعض ادیبوں اور شاعروں سے تعارف کرایا گیا تھا۔ اس مجلس میں مولانا ناطق لکھنوی، خان بہادر ہدایت اللہ صاحب (علیگڑھ) مسٹر سید حسین (پروفیسر امریکہ) پروفیسر بیخود، مسٹر محفوظ الحق (خیام کے ریسرچ اسکالر) مولانا آزری۔ مولانا محمود طرزی اور مسٹر قمر موجود تھے۔

علمی و ادبی گفتگو ہوئی اور پھر شاعروں نے باری باری سے اپنا اپنا کلام سنایا۔ خان بہادر ہدایت اللہ صاحب اکبر کے رنگ میں مزاحیہ اور طنز آمیز نظمیں لکھتے ہیں اور انگریزی الفاظ اور محاوروں کا استعمال اسی طرح کرتے ہیں۔ جیسے حضرت اکبر کے کلام موجود ہوتا ہے اور میرا خیال ہے کہ خان بہادر صاحب نے اکبر مرحوم کے رنگ میں لکھنے کی بہت کامیاب سعی کی ہے۔ گو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اکبر نے کوئی موضوع ایسا نہیں چھوڑا جس پر اب کوئی نئی بات کہی یا لکھی جا سکے۔

مولانا ناطق لکھنوی کا کلام صاف شستہ، عام فہم، اور لکھنوی رنگ کا حامل ہوتا ہے۔ زبان کی پاکیزگی اور سلاست خاص طور پر ان کے کلام میں پائی جاتی ہے۔

مسٹر سید حسین، مشہور ہندوستانی مقرر بھی جن سے میں پہلے بھی مل چکا ہوں۔ اس اردو بزم شعر و شاعری سے بہت محظوظ ہوئے، اور خود بھی بعض اشعار سنائے۔ امریکہ میں برسوں رہنے کے باوجود پروفیسر صاحب اپنی اردو زبان کو نہیں بھولے۔ بلکہ یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ گو "اردو زبان" ایک بہت کم مایہ اور محدود زبان ہے۔ اس کا احترام اور اسکی قدر اس لئے کرتے ہیں کہ وہ اُن کی قومی، ملکی، مادری زبان ہے۔ پروفیسر صاحب کا یہ جذبہ وطن پرستی اور اپنی مادری زبان کی یہ محبت اور قدر قابل ستائش ہے۔ اُن انگریزی داں حضرات کو جن کے دل میں زبان اردو کا درد نہیں ہے، باوجودیکہ وہ ان کی مادری زبان ہے سبق لینا چاہیئے کیونکہ آپ اگر اپنی عزت کریں تو دوسرے بھی آپ کی عزت کرینگے۔ اگر آپ اپنی زبان کی قدر دانی کرینگے تو دوسرے بھی اس "زبان" کی اہمیت کو سمجھنے لگیں گے۔

دوسری علمی ملاقات مولانا ابوالکلام آزاد سے ہوئی۔ صاحب موصوف کی علمیت اور ادبیت سے ہندوستان کا کون ایسا فرد ہے جو واقف نہیں، کون ایسا شخص ہے جو الہلال کے اعلیٰ علمی، ادبی اور تاریخی مضامین سے بہرہ ور نہیں۔ مولانا ایک بہت بڑے ادیب اور عالم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑے "کانگریسی" ہیں۔ مجھے مولانا کی نسبت اتنا ضرور کہنا ہے کہ خواہ وہ "کانگریسی ہوں یا مسلم لیگی"۔ انھوں نے "سیاسیات" میں پڑکر "اردو ادب" کو اپنے افکار عالیہ سے محروم کر کے اس پر بہت بڑا ظلم کیا ہے۔

مولانا سے تقریباً ایک گھنٹہ تک گفتگو ہوئی۔ ہمارا موضوع زیادہ تر علمی و ادبی تھا۔ بالخصوص ادیبوں ا

شاعروں کی تحریرات اور خطوط کے متعلق صاحب موصوف نے بہت سے پرانے قصے بیان کئے۔

علامہ ھندی کی شخصیت بھی کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ آپ ایک معمر بزرگ ہیں۔ اور آپ کی معلومات علمی و مذہبی بہت وافر ہیں۔ علامۂ موصوف گو انگریزی زبان سے قطعی ناواقف ہیں تاہم انھوں نے مجھے اپنی بعض تصنیفات دکھائیں جو زیادہ تر مذہبی ادب اور سائنس کے ادب پر مشتمل ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ علامہ نے آج سے بیس سال قبل کیمیا، طبعیات، علم حیوانات اور علم نباتات میں بہت اعلیٰ پایہ کی کتابیں تصنیف فرمائی ہیں۔ اور ان میں بعض نظریئے تو ایسے ہیں کہ جو عہد موجودہ کی انگریزی کتابوں میں بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ اہل اردو نے اس قیمتی علمی اور تاریخی اور سائنٹیفک ادب کی کوئی قدر نہیں کی۔ اور وہ ایسا طرح کنج گمنامی میں پڑا ہوا ہے۔ صاحب موصوف نے "عالم زر" کے نام سے مجھے ایک تصنیف کا مسودہ دکھایا۔ میں نے سرسری طور سے اس کو دیکھا۔ اس میں کیمیا، طبعیات، نباتات، اور حیوانات کے متعلق بہت دلچسپ مضامین درج ہیں۔ صاحب موصوف نے فرمایا کہ چونکہ وہ ان کتابوں کو چھپوانے کے اسباب فراہم نہیں کر سکتے۔ اس لئے اگر کوئی پبلشر یا کوئی صاحب اس کو چھپوانا چاہیں تو وہ ان کو بلا معاوضہ یہ تصانیف دینے کے لئے آمادہ ہیں۔ میرا ارادہ ہے کہ علامہ موصوف کی تصانیف کو کسی نہ کسی صورت سے دنیائے ادب کے سامنے پیش کیا جائے۔ علامہ کی بعض مذہبی تصانیف کا ترجمہ انگریزی میں بھی کیا جا چکا ہے۔ مسعود حسین صاحب پروفیسر نظام کالج نے بھی ایک مذہبی کتاب کا ترجمہ انگریزی میں شائع کیا ہے۔ مجھے اس وقت اس کتاب کا نام یاد نہیں ہے۔

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ایڈیٹر "ہند" (اخبار کلکتہ) ایک بڑے آزاد خیال اور نڈر لکھنے والوں میں سے ہیں۔ اور باوجود کہ کلکتہ کی فضا آپ کے اخبار کے لئے۔ آپ کی آزاد خیالی کی وجہ سے ناگوار بن گئی ہے پھر بھی آپ ہمت نہیں ہارے۔ اور سرگرمی کے ساتھ اپنے مقاصد کی تکمیل اور اپنے خیالات کی تبلیغ کر رہے ہیں آپ ہندوستان کے ایک قابل اخبار نویس سمجھے جاتے ہیں۔

میں نے کلکتہ میں اس امر کو محسوس کیا کہ ہماری یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ مضمون نگار اور ہمارے ملک کے ادیب اور شاعر کلکتہ کی اردو دنیا میں بہت کم متعارف ہوئے ہیں۔ اور اکثر نام میں نے جو وہاں کے آدمیوں کے سامنے لئے۔ ان سے انھوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ یہ دیکھ کر اور بھی افسوس ہوا کہ ہماری اردو یونیورسٹی

اور اردو کے اتنے بڑے مرکز ادیبوں اور شاعروں میں سے صرف تین چار ہی حضرات ایسے ہیں جن کے نام وہاں سنے جاتے ہیں مثلاً مولانا عبدالحق، مولانا امجد حیدرآبادی، ایک شاعر (آخر میں راقم ایک افسانہ نگار) کی حیثیت سے۔

(۷)

کانگریسی دلچسپیاں اس مرتبہ سائنس کانگریس نے اپنا جوبلی سیشن، برٹش ایسوسی ایشن کے سالانہ جلسہ کے ساتھ متحدہ طور پر منعقد کیا۔ اس میں انگلستان اور یورپ کے مشہور سائنس داں بھی شریک ہوئے جنکی تعداد تقریباً ایک سو تھی۔ کل نمایندے جو ہندوستان کے مختلف صوبوں سے اس میں شریک ہوئے تقریباً ایک ہزار چھ سو تھے۔ جن میں بیرون ہند کے ایک سو نمایندے بھی شامل ہیں۔

انتظامات کا جہاں تک تعلق ہے، کانگریس کامیاب نہیں کہی جا سکتی۔ ہر قسم کی بدنظمیاں موجود تھیں، اور ہر شخص شاکی تھا۔ اور لوگ گذشتہ سال کی کانگریس کے انتظامات کی تعریف کر رہے ہیں جو حیدرآباد میں منعقد ہوتی تھی۔ ڈاکٹر قریشی صاحب، صدر شعبۂ کیمیا نے، ایک عصرانہ میں، مجھ سے دوران گفتگو میں کہا کہ لوگ ایک سال کے بعد اس کانگریس میں حیدرآباد کے انتظامات کی تعریف کر رہے تھے اور یہ ایک واقعہ ہے۔

کانگریس کا تفریحی نظام العمل بھی کچھ اطمینان بخش نہ تھا۔ البتہ جہاں تک مضامین، بحث مباحثوں اور عام فہم لکچروں کا تعلق ہے۔ کانگریس بڑی دلچسپ کہی جا سکتی ہے۔

کانگریس کا آغاز ۳ جنوری سے ہوا۔ ویسرائے بہادر نے افتتاح کیا۔ تقریباً (۲۰) منٹ تک تقریر کی اور بعض ہندوستانی سربرآوردہ سائنس دانوں کے کارناموں کو سراہا۔ اور تعریفی الفاظ میں ان کا ذکر کیا۔ تقریباً بارہ بجے جلسہ ختم ہوا۔ اس جلسہ کے انتظامات بہت باقاعدہ تھے۔

کانگریس کے اجلاس روزانہ صبح (۹) بجے سے شروع ہوتے تھے۔ دوپہر میں کھانے کے لئے وقفہ دیا جاتا تھا اور پھر سلسلہ شام تک رہتا ہے۔

عصرانے تقریباً روزانہ شام کو، نمائندوں کو کسی نہ کسی جگہ ضرور عصرانہ کی دعوت میں شریک ہونا پڑتا تھا۔ چنانچہ ۳ جنوری کی شام کو کانگریس کی جانب سے ویلنگ ہنگلی ہن سٹیڈیم کی

تفریح کی دعوت اور اسی میں عصرانہ کا انتظام کیا گیا گنجایش کم، لوگ زیادہ اور انتظامات ناقابل اطمینان تھے۔

۴ جنوری کو تھیٹر روڈ پارک میں میئر آف کلکتہ کی جانب سے عصرانہ دیا گیا تھا۔ یہاں کے انتظامات بہت معقول تھے۔

۵ جنوری کو کلکتہ کیمیکل اور فارمیسوٹیکل کمپنی نے عصرانہ پر مدعو کیا تھا۔ چونکہ یہ کارخانہ شہر کے بیرونی حدود میں ہے۔ اس لئے خود کمپنی نے اپنی طرف سے آمد و رفت کا انتظام (موٹربس) کیا تھا۔ انتظامات بہتر تھے۔ چاء نوشی کے بعد مہمانوں کو کارخانہ دکھلایا گیا۔ جہاں مختلف قسم کے دوائیں تیار کی جا رہی تھیں۔

۷ جنوری کو گورنمنٹ ہاؤس میں گورنر کی طرف سے عصرانہ تھا۔ اور میرا خیال تھا کہ باوجود سخت پابندیوں کے یہاں سب سے زیادہ مہمانوں کی تعداد تھی۔ انتظامات کا اندازہ صرف اسی بات سے کیا جاسکتا ہے کہ وہ عصرانہ گورنر کی طرف سے تھا۔ چاء نوشی میں گورنر اور ان کی لیڈی محترمہ نے شرکت کی۔ بینڈ سامعہ نوازی کر رہا تھا۔ چاء نوشی کے بعد بعض مشہور سائنس دانوں کا تعارف گورنر سے کرایا گیا۔ اور اس طرح گورنر اور سائنس دانوں میں کچھ باتیں بھی ہوئیں اور تقریباً ایک گھنٹہ کے بعد گورنر واپس گیا۔

۸ جنوری، آج بنگال امیونٹی لیبوریٹری (بڑانگر) میں عصرانہ تھا۔ آمد و رفت کا انتظام میزبان نے کیا تھا کیونکہ یہ مقام بھی شہر کے بیرونی حدود میں واقع ہے۔ یہاں کے انتظامات بھی معقول تھے۔ چاء نوشی کے بعد برتجاری جماعت نے اپنے کرتبوں اور ناچوں کی نمائش کی۔ میرا ذاتی خیال اس جماعت کے متعلق یہ ہے کہ یہ تحریک کچھ زیادہ امید افزا نہیں معلوم ہوتی اور ہر صوبہ میں اس کو ہردلعزیزی حاصل ہونا یقینی امر نہیں ہے۔

۹ جنوری۔ آج شام کو کلکتہ یونیورسٹی کی جانب سے وداعی عصرانہ ترتیب دیا گیا تھا جس طرح انتظامی امور میں بہت سی بدنظمیاں تھیں۔ یہی خصوصیت عصرانہ میں بھی تھی۔ اس کا اندازہ اس امر سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ ایک پیالی گرم چاء کے لئے کم از کم نصف گھنٹہ تک انتظار کرنا پڑا۔ اور بعض حضرات کو تو ٹھنڈی چاء بھی مل نہ سکی۔

کانگریس کا دفتر استفسارات انتہائی مضحکہ خیز تھا یعنی اسکے اندر چار حضرات کرسی نشین تھے لیکن کسی مستفسر کو ایک بات کا جواب بھی کبھی صحیح نہیں ملا۔ اگر ان لوگوں سے کوئی اہم استفسار کیا جاتا تھا تو وہ مقامی سکریٹری سے ملنے کو کہتے تھے۔ اور جب مقامی سکریٹری کے پاس جائیں تو وہ ہمیشہ ندارد۔ چنانچہ میرا تو یہ تجربہ ہے کہ ۲ سے ۹ جنوری کی شام تک

مقامی سکریٹریوں میں سے ایک کو بھی نہ دیکھ سکا۔ اور نہ اُن سے کوئی استفسار کر سکا۔

اسی سلسلہ میں ایک واقعہ اور سن لیجئے۔ ایک مرتبہ چھوٹے سہانی صاحب (آپ ہندوستان کے مشہور نباتیات داں ڈاکٹر بیربل سہانی کے برادر خورد ہیں) نے مجھ سے کہا کہ ان کو کسی امر کے متعلق کچھ دریافت کرنا تھا۔ وہ دفتر استفسارات میں گئے وہاں چار اشخاص موجود تھے۔ چنانچہ جب سہانی صاحب نے اُن میں سے کسی ایک شخص سے پوچھا۔ اس نے کہا دوسرے شخص سے پوچھیے وہ بہتر جانتا ہے۔ دوسرے نے تیسرے سے۔ تیسرے نے کہا چوتھے سے دریافت کیجئے وہ بہتر جانتا ہے۔ چوتھے نے کہا سکریٹری صاحب سے دریافت کریں تو مناسب ہوگا کیونکہ وہ سب سے زیادہ جانتے ہیں۔

والنٹیرس (رضاکار) کے متعلق صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ ان کی تعداد بہت ہی کم تھی۔ کانگریس سائنس کی تھی لیکن والنٹیر سب شعبۂ فنون کے تھے۔ اور اکثر اوقات تو وہ بیچارے شعبوں کے نام بھی سمجھ نہ سکتے تھے۔ مثلاً ایک والنٹیر سے پوچھا گیا کہ شعبۂ ارضیات کہاں ہے تو اس نے کہا مجھے معلوم نہیں۔

کانگریس کا تفریحی پروگرام

کانگریس نے مندرجہ ذیل مقامات کی تفریح کے لئے انتظامات کئے تھے۔ اور ان کے چار آنے اور آٹھ آنے ٹکٹ رکھے گئے تھے۔ یہ تمام پروگرام موٹر بسوں کے ذریعہ سے انجام دیا گیا۔

(۱) باغ حیوانات (۲) انڈین سوسائٹی آف اورینٹل آرٹس (۳) وکٹوریہ میموریل (۴) جین مندر (۵) دکھنیشور (۶) کارمائکل میڈیکل کالج (۷) اسنیک وینم لیبوریٹری (۸) رادھا فلم کمپنی۔ انڈیا الکٹرک ورکس (۹) ڈھکوریا جھیل (۱۰) انڈین اسٹیٹ براڈ کاسٹنگ اسٹیشن (۱۱) اگرپارا جوٹ ملس (۱۲) عجائب خانہ (۱۳) علاج حیوانات کالج (۱۴) سالٹ لیک (۱۵) بوس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (۱۶) لازا یوپری (۱۷) جیترنجن ہسپتال (۱۸) جادوپور دق کا ہسپتال وغیرہ

پروگرام میں ایک یہ دشواری تھی کہ آپ ان میں سے بیک وقت دو یا تین مقامات دیکھ سکتے تھے۔ پروگرام چار دن مختلف اوقات میں رکھا گیا تھا۔ مختلف مقامات کے تفریحی سفر ایک ہی مقررہ وقت سے شروع ہوتے تھے۔ چنانچہ اس پروگرام کے بعض مقامات میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا بعض کانگریس کے پروگرام کے ساتھ دیکھے۔ مثلاً رادھا فلم کمپنی، انڈیا الکٹرک ورکس۔ وکٹوریہ میموریل وغیرہ۔

انڈیا الکٹرک ورکس۔ اس کارخانہ میں چھت اور میز کے پنکھے برقی تیار ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس پنکھے کے تمام کل پرزے

اسی کارخانہ میں بنتے ہیں۔ وہاں کے ایک نگران نے ہم لوگوں کو پنکھا بننے کے تمام مدارج کو ابتدا سے انتہا تک دکھلایا۔ یہاں پرچار وغیرہ کا انتظام بہت اعلیٰ پیمانہ پر کیا گیا تھا۔ اسکے علاوہ ہم لوگوں کا فوٹو گروپ بھی لیا گیا۔ ناظم کمپنی نے ہم لوگوں کا بہت پرتپاک خیر مقدم کیا۔ کمپنی کے اشتہارات او کلینڈر بھی تقسیم کئے گئے۔ مینیجر نے ایک چھت میں لگے ہوئے پنکھے کی طرف اشارہ کرکے بتایا کہ یہ پنکھا ۲۲ ڈسمبر سنہ ۱۹۳۵ء کو چلایا گیا تھا اور یہ اس تاریخ سے آجتک برابر چل رہا ہے۔ آج بند کرنے کا سوچ نہیں رکھا گیا۔ اسکے لحاظ سے یہ ایک تاریخی پنکھا ہے کہ تقریباً تین سال سے ایک سکنڈ کو بھی نہیں رکا۔

کانگرس نے مشہور سائنس دانوں کے عام فہم لکچروں کا بھی انتظام کیا تھا۔ چنانچہ سر اڈینگٹن اور سر جیمس جینس صدر سائنس کانگرس کی تقریریں اور مسٹر کریو کی تقریر ''موت کیا ہے'' بہت دلچسپی سے سنی گئیں۔

کانگرس کی طرف سے ایمپائر تھیٹر میں ''رقص و سرود'' کی ایک مجلس منعقد ہوئی تھی جس میں کلکتہ کی شریف خاندان کی لڑکیوں اور لڑکوں نے اپنے رقص کے کمالات پیش کئے تھے۔ سب رقص قدیم ہندو سوسائٹی اور معاشرت کے تھے۔ گانے زیادہ تر بنگال اور کم اردو اور ہندی میں تھے۔

(۸)

فلمی دلچسپیاں

سائنس کانگرس کے تفریحی پروگرام میں ایک فلم اسٹڈیو (نگارخانہ) کی سیر کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ چنانچہ ہم لوگ ۲½ بجے اسٹوڈیو پہنچے۔ کمپنی کے منیجر اور دیگر لوگوں نے ہم سب کا خیر مقدم کیا اور اسٹوڈیو منیجر نے ایک مختصر سی تقریر کی۔ ہم لوگ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اور فلم بندی (شوٹنگ) شروع کی گئی۔ عجیب اتفاق تھا کہ اس وقت کمپنی میں ایک تامل زبان کی فلم تیار ہو رہی تھی۔ اسی کا ایک منظر پیش کیا جس میں ایک راجہ کو گاتے ہوئے دکھلایا گیا تھا۔ اس حصہ کی شوٹنگ کی گئی۔ اسکے بعد ہم لوگوں نے کمپنی کی لیبوریٹری (معمل) دیکھی جہاں فلم دھوئے اور چھاپے جاتے ہیں اور جہاں آواز بھری جاتی ہے۔

فلم کی شوٹنگ کے علاوہ کمپنی کے ایک اداکار نے اداکاری کے مختلف نمونے پیش کئے۔ اسکے بعد مسٹر بخشی نے کچھ ''دیوانوں'' کے سے رقص دکھائے اور آخر میں ایک شریف خاندان کی لڑکی ''شیلا ہالدر'' نے اپنا بہترین رقص دکھایا

اسٹوڈیو منیجر نے اس لڑکی کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ اس کا دادا کشیب چندر سین برہمو سماج مذہب کا بانی تھا۔ اس شخص کی تصویر وکٹوریہ میموریل میں بھی لگی ہوئی ہے۔

کلکتہ میں عام طور پر خاندانی لڑکیاں خاص خاص موقعوں پر اسٹیج پر آکر اپنے فن اور کمال کو پیش کرتی ہیں کیونکہ رقص از منۂ قدیم سے ہندوستان میں ایک بلند پایہ فن تصور کیا جاتا ہے۔ کلکتہ کے ہر خاندان میں لڑکیوں کو ناچ اور گانے کی تعلیم دینا فرائض زندگی میں سے ہے۔

چار نوشی کے بعد جملہ کانگریسی نمایندوں کا فوٹو گروپ لیا گیا۔ اسکے بعد مہمانوں نے میزبان کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے رخصت ہوئے۔

نیو تھیٹرز کے اداکاروں میں سب سے پہلی ملاقات مسٹر نواب کشمیری سے ہوئی جو ہندوستان میں میرے نقطۂ نظر سے ایک تجربہ کار اور بہترین اداکار کہے جا سکتے ہیں۔ آپ کو میں بہت زمانہ سے جانتا ہوں لکھنؤ کے ایک شریف خاندان کے رکن ہیں۔ ایک بہت بڑے اداکار ہونے کے باوجود آپ ایک بہت با اخلاق، عالی حوصلہ، با مروت، ہمدرد، اور اعلیٰ کردار کے حامل ہیں۔ آپ کی ملاقات سے میں بے حد متاثر ہوا۔ ہندوستان میں بہت کم ایسے لوگ ہیں۔ جو فن اداکاری کو فن سمجھ کر کر رہے ہیں۔ نواب وہ پہلے آدمی ہیں جو جنہوں نے اس فن کو فن کی حیثیت سے عوام کے سامنے پیش کیا۔ انھوں نے اس فن کو بلند مدارج تک پہنچانے کے لئے جسمانی قربانیاں بھی کی ہیں جسکی مثال "یہودی کی لڑکی" میں پائی جاتی ہے۔ آپ کی خودداری آپ کے مذہبی عقائد اور آپ کا خلوص اس قابل ہے کہ اُن سے سبق لیا جا سکتا ہے۔

مسٹر مرزا محمد بیگ (مسٹر ایم۔ ایم۔ بیگ) دوسرے شخص ہیں جن کی ملاقات سے مجھے بڑی مسرت ہوئی۔ آپ فلمی دنیا میں "مسٹر تیمو" کے نام سے مشہور ہیں۔ نیو تھیٹرز کے سب سے تازہ فلم "دیا تیج" میں آپ نے راجہ کے مصاحب (دوشنک کا) پارٹ بڑی خوبی سے ادا کیا ہے۔ آپ بڑی خوبیوں کے آدمی ہیں، اور بڑے دلچسپ، خاندانی اعتبار سے آپ کا تعلق آخری تاجدار اودھ شاہ واجد علی شاہ کے خاندان سے ہے۔ آپ کمپنی کے فلمی رسالہ عکاس کے اڈیٹر، ایکٹر، ایک یتیم خانہ کے سکریٹری، امام باڑے وغیرہ کے ناظم و نگراں ہونے کے علاوہ بلیرڈ کے مشہور کھلاڑی بھی ہیں۔ اسٹوری بھی لکھتے ہیں اور مکالمہ نویسوں کو بھی مکالموں میں مشورہ دیتے ہیں۔ مسٹر سرکار، فلم کمپنی کے مینجنگ ڈائرکٹر کے دوست ہونیکی وجہ سے آپ کا

خاص لحاظ کیا جاتا ہے۔ ایک شخص میں اتنی سب خوبیاں، اتنی سب قابلیتیں بہت کم نظر آتی ہیں۔

نیو تھیٹرز کے مالک مسٹر سرکار سے بھی ملاقات ہوئی۔ ان سے ملکر ایک شخص فوراً اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ وہ ایک نہایت سنجیدہ اور با اخلاق اور منصف مزاج آدمی ہیں۔ ہر کام کو بہت سوچ سمجھ کر کرتے ہیں۔ اور بہت فکر و غور کے بعد کوئی تصفیہ کرتے ہیں۔ سب سے بڑی خوبی آپ میں بے تعصبی ہے جس نے آپ کو سارے ہندوستان کے ہندو مسلمانوں میں ہر دلعزیز بنا رکھا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ نیو تھیٹرز فلم کمپنی میں ہندو اور مسلمانوں کا مرتبہ برابر ہے اور دونوں فرقے دوش بدوش کام کرتے ہیں۔ عموماً نیو تھیٹرز کے اداکار مسٹر سرکار کے بہت مداح ہیں۔

مذکورہ بالا حضرات کے علاوہ میری ملاقاتیں اور بھی متعدد اداکاروں سے ہوئی ہیں جن میں مسٹر پرتھوی راج بی۔اے، مسٹر جگدیش سیٹھی، مسٹر کپور، مسٹر کمار شرما بی۔اے۔ ودیاپتی اور دیوداس کے مکالمہ نویس، مسٹر اختر نواز (میڈن تھیٹرس کے اداکار سابق) مسٹر جواد، مسٹر انصاری وغیرہ۔

ڈائرکٹروں میں مسٹر ہیم چندر سے متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔ آپ "کروڑپتی" اور "آناتھ آشرم" کے ڈائرکٹر رہ چکے ہیں۔ ان سب میں نے فلمی صنعت ان کی خانگی زندگی، ان کے خیالات فلمی زندگی کے متعلق" جیسے موضوعات پر گفتگو کی۔ ان سب سے جو گفتگو ہوئی۔ اور ان کے حالات وغیرہ کی اس مضمون میں تحریر کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ سب تفصیلات آپ میری زیر ترتیب کتاب (فلمی دنیا) میں ملاحظہ فرمائنگے۔ البتہ یہاں صرف ایک اداکار کے یہ الفاظ درج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پبلک اور اداکاروں کے درمیان ایک تنفر اور حقارت کی جو دیوار حائل ہے اس کو مضمون نگار اور ادیب حضرات دور کرنے کی سعی کریں۔ اور پبلک کو یہ بتائیں کہ اداکار محض ایک بھانڈ یا پرانے زمانہ کا نقال نہیں رہا بلکہ وہ ایک فن (آرٹ) کو آپکے سامنے پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ آرٹ بھی وہی اہمیت رکھتا ہے جو دوسرے فنون لطیفہ مثلاً موسیقی اور پینٹنگ وغیرہ کو حاصل ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ ایک موسیقار اور ایک مصور کی آپ قدر کرتے ہیں اور ایک اداکار کو عزت و احترام کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ لوگوں کے سامنے جب ایک اداکار کا نام آتا ہے تو اس کے ساتھ ہی ان کو وہ تمام برائیاں، وہ تمام عیوب اور وہ تمام ذلیل افعال و حرکات نظر آنے لگتی ہیں جو محض ایک اداکار کی زندگی سے وابستہ کی جاتی ہیں۔ لیکن میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا یہ صحیح ہے کہ صرف اداکار ہی کی زندگی اس قدر معصیت اور گناہوں کا گہوارہ ہوتی ہے۔ کیا وہ ایک شخص جو اداکار نہیں ہے۔ ان گناہوں اور ان برائیوں سے

ہمیشہ ایک ہوتا ہے۔ سینکڑوں ایسے شرفا ہیں جن کی زندگی انتہائی لہو ولعب عیش وعشرت اور بقول کسے پاؤں کے سمندر میں تیرتے ہوئے گذرتی ہے۔ پھر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ آپ ہر اداکار کو ذلیل، اس کی زندگی کو قابل نفرت اور اس کی سوسائٹی کو، سوسائٹی کے لئے دھبہ تصور کریں جبکہ ان میں بھی اکثر ایسے ہیں جن کی زندگی بہت شریفانہ طور پر گذر رہی ہے۔ جو خاندانی ہیں خاندان رکھتے ہیں اور خاندان کے ساتھ خاندانی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ براہ کرم میرے اس پیغام کو تعلیم یافتہ شرفا کے طبقہ تک پہونچایا جائے۔"

۱۰ر جنوری ۳۸ء کو مسٹر بیگ مجھے نیو تھیٹرز کے اسٹوڈیو کی سیر کرانے لے گئے۔ اسٹوڈیو ٹالی گنج میں واقع ہے۔ اور ایسٹ انڈیا فلم کمپنی کے بعد اسی کا نمبر ہے۔ کمپنی کے دو اسٹوڈیو ہیں۔ ہم دونوں اسٹوڈیو میں گئے۔ اسٹوڈیو میں مسٹر بیگ نے میرا تعارف بے شمار لوگوں سے کرایا جن میں سے بعض خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ڈائرکٹروں میں مسٹر دیوکی بوس اور مسٹر نتین بوس سے ملا۔ جو ہندوستان کے مشہور ڈائرکٹر سمجھے جاتے ہیں۔ اول الذکر نے "یہودی کی لڑکی" اور پھر عہد حاضر کا بہترین فلم "ودیاپتی" تیار کیا ہے۔ اور موخر الذکر "چنڈی داس"، "پریزیڈنٹ" وغیرہ جیسے مقبول عام فلم تیار کرنے میں طرہ امتیاز حاصل کر چکے ہیں۔ مسٹر نتین بوس اس وقت اپنی ایک نئی فلم تیار کر رہے تھے "مادر وطن" (Mother Land) مجھ سے چند منٹ تک باتیں کیں اور پھر مجھ سے کہا کہ اسٹیج کے اندر چل کر شوٹنگ (فلم بندی) دیکھوں۔ مسٹر دیوکی بوس بہت سنجیدہ اور خاموش آدمی ہیں۔ مسٹر ہرفلو رائے تیسرے ڈائرکٹر ہیں جنھوں نے "بیچارن" وغیرہ بنائے۔ عموماً ان کے فلموں کو زیادہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ اس وقت وہ بھی ایک فلم "ابھاگن" کی شوٹنگ میں منہمک ہیں۔

اداکاروں میں مسٹر سہگل بی، اے سے ملاقات ہوئی جو اس وقت شوٹنگ میں مشغول تھے۔ انہوں نے "مادر وطن" میں ہیرو کا کام انجام دیا ہے۔ ان سے تھوڑی دیر گفتگو ہوئی۔ ان کا تعارف کرانا بے معنی سی بات ہے کیونکہ ان کے گانوں کا جادو ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل چکا ہے۔ اسٹیج کے اندر گیا جہاں شوٹنگ ہو رہی تھی۔ یہاں پر مسٹر سدرشن "مادر وطن" کے مکالمہ نویس (پنجاب کے ایک فسانہ نگار) مس روما، مس کملیش کماری (پریزیڈنٹ نامی فلم کی پریزیڈنٹ) مس لیلا دیسائی، مس چندرا دیوی "بیچارن" کی ہیروئن، مس ملینہ "گرو دیپتی" کی ہیروئن بھی موجود تھیں۔ ان سب سے

تعارف ہوا - اور گفتگو ہوئی - ان لوگوں کے خیالات فلمی زندگی کے متعلق کیا ہیں - یہ سب آپ میری تصنیف فلمی دنیا میں ملاحظہ فرمائینگے - اکثر نے وعدہ کیا کہ وہ میری اس کتاب کے لئے اپنے فلمی مضامین روانہ کریں گی مسٹر سہیگل نے بھی مضمون لکھنے کا وعدہ کیا ہے۔

یہاں پر مسٹر اصغر حسین شور لکھنوی سے بھی ملاقات ہوئی جو نیو تھیٹرز کے بہت اچھے مکالمہ نویس ہیں اور علامہ رضا علی وحشت کے شاگرد ہیں - صاحب موصوف کو فلمی مکالمہ لکھنے کا خاص ملکہ ہے اور آپ کے مکالمے عموماً پسند کئے جاتے ہیں - اداکار کی حیثیت سے بھی آپ دیوداس اور آنا تھ آشرم وغیرہ میں کام کرچکے ہیں - بڑے اخلاق اور ہمدردی کے آدمی ہیں - ان کی ہر ہر بات سے لکھنویت ٹپکتی ہے - آپکے ہی توسط سے مجھے علامہ ہندی سے ملنے کا موقع ملا تھا -

یہاں ہر زبان کے متعلق اگر میں کچھ لکھوں تو نامناسب نہ خیال کیا جائے گا - عام طور پر نیو تھیٹرز کے اداکار پنجاب اور یوپی کے ہیں - جو بخوبی اُردو لکھ پڑھ اور بول سکتے ہیں - بنگالی ایکٹر اور ایکٹریسیں بھی اگر زیادہ نہیں تو تھوڑی بہت اردو ضرور بول اور سمجھ سکتی ہیں - اور یہی وجہ ہے کہ وہ ہندوستانی زبان کی فلموں میں اپنا مکالمہ بڑی خوبی سے ادا کر سکتی ہیں -

البتہ ایسی ہندوستانی یا ہندی کوئی نہیں بولتا اور سمجھتا جو کہ قدیم زمانہ کی آریاؤں کی زبان (سنسکرت) کہی جاسکتی ہے اور جسکے نمونے عموماً ہندوستانی فلموں اور بالخصوص "دیا پتی" یا "چندی داس" یا "پربھات" کی فلموں میں پائے جاتے ہیں -

ایک بات اور قابل ذکر ہے کہ جب میں اسٹیج میں بیٹھا ہوا شوٹنگ دیکھ رہا تھا - تو بنگالی زبان کی فلم بندی کے بعد، اردو زبان کی فلمبندی شروع کی گئی - پنڈت سدرشن مکالمہ نویس اور نتین بوس ڈائرکٹر تھے - چنانچہ ایک جگہ "دُشمن" کے ہیرو (مسٹر سہیگل) کی زبان سے پنڈت سدرشن نے کہلوایا تھا "تو کوئی بھی کیا کر سکتا ہے" مجھے "بھی" کا غلط استعمال فوراً محسوس ہوا - اور میں نے بیگ سے کہا کہ یہ "بھی" کا استعمال غلط ہے اس جملہ کو یوں ہونا چاہیئے کہ "تو کوئی کر بھی کیا سکتا ہے"؟ چنانچہ یہ تصحیح سہیگل تک پہنچائی گئی اور پھر پنڈت جی نے بھی مناسب ہی خیال کیا اور اس طرح ایک غلط عمل کی اصلاح ہوگئی -

اس واقعہ سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ڈائرکٹر کو "اردو" زبان سے کوئی دلچسپی اور واقفیت نہیں ہوتی وہ بنگالی زبان کے ڈھنگ پر چلتے ہیں۔ اردو کے مکالمے تمامتر منشیوں اور مکالمہ نویسوں پر منحصر ہوتے ہیں۔ خواہ وہ غلط سکھائیں یا صحیح۔ اسلئے فلموں کے غلط زبان کے استعمال کا الزام تمامتر مکالمہ نویسوں پر عائد ہوتا ہے۔ مالکان کمپنی یا ڈائرکٹروں کو اس سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں۔

اسٹیج سے نکل کر ہم لوگ میوزک روم (کمرۂ موسیقی) میں گئے۔ مسٹر آر۔ سی۔ بوول، میوزک ڈائرکٹر (نغمہ آموز) سے تعارف ہوا۔ بہت اخلاق سے ملے۔ ایک اداکار کو راگ سکھا رہے تھے۔ چند منٹ تک ملتوی کر کے مجھ سے باتیں کیں۔ ہندوستانی فلم کمپنیوں میں، یہ اپنے فن کے لحاظ سے ایک بہت قابل میوزک ڈائرکٹر (نغمہ آموز) سمجھے جاتے ہیں۔ اور نیو تھیٹرز کے تمام فلموں کے راگ آپ ہی کی جدّت طبع کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

اسٹوڈیو میں اور جن لوگوں سے ملاقات ہوئی ان میں مسٹر مجمدار، مسٹر بمل رائے، مسٹر وجے کمار، مسٹر پرتھوی راج (جن سے پہلے ملاقات ہو چکی تھی) مسٹر گھوش، مسٹر سانیال (پروپیگنڈا آفیسر) مسٹر یوسف موجی (کیمرہ مین) مسٹر ملک اسسٹنٹ ڈائرکٹر، وغیرہ ہیں (اکثر لوگوں کے نام یاد نہیں رہے)

مسٹر مسعود صابری کمپنی کے رسالہ "عکاس" کے جائنٹ ایڈیٹر ہیں۔ آدمی بڑے ہوشیار اور کام کرنے والے ہیں شعر و ادب سے اچھی مناسبت رکھتے ہیں۔ درد مند دل پایا ہے۔ بات بات پر رو دیتے ہیں۔ اپنی داستان مجھے سنائی۔ جو بطور خود ایک نہایت دردناک افسانہ معلوم ہوتی ہے۔

(۹)

بھولی بسری باتیں

عجائب خانہ کے کسی ایک حصہ میں گورنمنٹ آرٹ اسکول آف پنٹنگ اینڈ فائن آرٹس واقع ہے جس زمانہ میں، میں وہاں تھا، اس اسکول میں ایک نمائش ہو رہی تھی۔ چنانچہ میں بھی اس نمائش کو دیکھنے گیا۔ تصویروں میں اکثر و بیشتر اسی اسکول کے طلباء اور استادوں کی بنائی ہوئی تھیں۔ تصویروں میں سب سے زیادہ مجھے ایک تصویر پسند آئی جس میں ایک مزدور لڑکا اور ایک لڑکی ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے مزدوری کے پیسے آپس میں تقسیم کر رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ

وہ تصویر زندہ ہے۔ اور یہ دونوں ابھی باتیں کرنے لگیں گے۔ یہی فن مصوری کا کمال ہے کہ تصویر جاندار معلوم ہو۔ تصویروں کے علاوہ مٹی کے کھلونے اور مجسمے وغیرہ بھی تھے۔ جو سب وہیں کے طلبار بنائے تھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس اسکول میں طلبار کی تعداد تین سو ہے۔ جس میں صرف دس طالب علم مسلمان ہیں۔ اور اسی طرح پچاس استادوں میں صرف تین یا چار مسلمان ہیں۔ اس آرٹ کیطرف سے مسلمانوں کی اس بے توجہی پر مجھے افسوس ہوا۔ گو میں سمجھتا ہوں کہ اس تعداد کی کمی کے اور اسباب ہیں۔

میرے ایک نہایت شفیق اور محترم دوست نے مجھ سے بنگال کی کالج اور اسکول کی فضاؤں کا حال بیان کیا۔ جہاں کی تعلیم گاہیں عموماً مخلوط ہوتی ہیں (یعنے ان میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں تعلیم حاصل کرتی ہیں) اور خاص طور پر یہ کہا کہ میں بنگال کی تعلیم یافتہ لڑکیوں کے عام طور پر پھیلنے والے خیالات کا ضرور کسی مضمون میں ذکر کروں کہ وہاں کی تعلیمیافتہ لڑکیوں کا طبقہ شادی کی قید و بند کا سخت مخالف ہوگیا ہے۔ اور جس طرح دوسرے امور میں آزادی کا نعرہ بلند کیا جاتا ہے۔ اسی طرح زندگی کے اس سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ نازک مسئلہ کے خلاف بھی بعض سوسائٹیوں میں پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے۔

کلکتہ میں جہاں اور باتیں ہیں وہاں ایک وبا یہ بھی پھیلی ہوئی ہے کہ گھوڑ دوڑ کا ہر چھوٹا بڑا شائق ہے۔ ہر ہفتہ گھوڑ دوڑ ہوتی ہے جس میں مزدور سے لے کر بڑے بڑے لکھ پتی تک شریک ہوتے ہیں۔ ریس کی تباہ کاریاں مشہور رہیں اور کلکتہ کے باشندے بھی اس سے مبرا نہیں۔

مسٹر سید حسین سے جب میرا تعارف، ایک حیوانیات کے معلم کے نام سے ہوا تو انھوں نے ایک لطیفہ سنایا۔ کہنے لگے، جب میں علیگڈھ گیا تھا تو وہاں ایک جلسہ میں یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے وہاں کے پروفیسروں سے میرا تعارف کرایا۔ متعدد لوگوں سے تعارف ہونے کے بعد جب علم حیوانیات کے پروفیسر سے تعارف کا موقع آیا تو

وائس چانسلر پروفیسر صاحب کا نام بھول گئے۔ اور مجھ سے تعارف کراتے ہوئے کہا کہ آپ مسٹر زوالوجی (یعنے مسٹر حیوانیات) ہیں اس لطیفہ کو سن کر سب لوگ ہنس پڑے۔

"مٹیا برج" ایک تاریخی مقام ہے۔ اور ہندوستان کا ہر شخص جانتا ہے کہ یہ وہی مقام ہے جہاں آخری تاجدار اودھ، واجد علی شاہ کو نظر بند کیا گیا تھا۔ یہ مقام شہر سے کئی میل باہر واقع ہے۔ اور موٹر بس کے ذریعہ سے یہاں جا سکتے ہیں۔ چنانچہ میں نے بھی اس مکان کو دیکھا۔ جہاں واجد علی شاہ نے اپنی زندگی کے آخری لمحات گذارے تھے۔ یہ عمارت بالکل منہدم اور برباد ہو چکی ہے۔ اسکے ایک جانب ایک بڑا باغ ہے اور باغ کے نیچے دریائے ہگلی بہتا ہے۔ یہاں سے دریائے ہگلی کا نظارہ بڑا دلکش معلوم ہوتا ہے۔ عمارت کے اندر در و دیوار پر تصویریں بنی ہوئی ہیں۔

ابتک یہ عمارت واجد علی شاہ کے رشتہ داروں کے قبضہ میں تھی۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ اُسے کسی راجہ نے خرید لیا ہے اور اس کو گرا کر یہاں دوسری عمارت یا کارخانہ بنایا جائے گا۔

اس عمارت کے قریب ہی امام باڑہ بھی ہے۔ جہاں واجد علی شاہ کا مزار بھی ہے۔

ہندوستان کے مشہور موسیقی داں "پیارے صاحب" اسی مقام پر رہتے ہیں۔ ان سے بھی ملا بیچارے بخار میں مبتلا تھے۔ پھر بھی یہ سن کر باہر نکل آئے کہ ایک حیدرآبادی اُن سے ملنے کے لئے آیا ہے وہ حیدرآبادیوں کے بڑے مداح ہیں۔ بڑے خلوص اور اخلاق سے ملے۔ ایک سینما ہال بھی قائم کیا ہے۔ کہہ رہے تھے کہ وہ عنقریب بمبئی جانے والے ہیں۔ وہاں سے شاید حیدرآباد آئیں۔

بطور یادداشت کے میں نے بڑے بڑے سائنس دانوں، ادیبوں، شاعروں اور ان تمام لوگوں کے بھی آٹوگراف (قلمی تحریریں) حاصل کر لئے تھے جن سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ اور وہ سب میرے پاس محفوظ ہیں۔

نوٹ:- کلکتہ کے متعلق اگر کوئی صاحب مزید معلومات کے خواہاں ہوں تو میں اور زیادہ تفصیلات دے سکتا ہوں۔ فقط

محشر عابدی

دُوانّی

رات کے کوئی آٹھ بجے ہوں گے میں عابد روڈ پر بس کا انتظار کر رہا تھا۔ کڑاکے کی سردی تھی میں اپنے گرم اُونی کوٹ میں بھی ٹھٹھرا جا رہا تھا۔ اس وقت مجھے عابد روڈ کی پرشکوہ رومانوی فضا دعوت کیف دے رہی تھی نفیس اور قصر نما عمارتیں، دوکانیں جن میں لاکھوں روپیہ کا انبار تھا، کروروں کی دولت اور تمول یہ سب اپنے شکوہ کی نمایش کر رہے تھے ریڈیو کی سامع نواز موسیقی سے ساری فضا مترنم بنی ہوئی تھی، حسین سینما گھر، رسٹوران اور کیفوں سے قہقہوں کی لطیف صدائیں آرہی تھیں، خوبصورت اور دلکش موٹر کاروں کا سلسلہ بندھا ہوا تھا، برقی قمقموں کی جھلملاہٹ نے فضا کو قلزم انوار بنا رکھا تھا، راہروں کی شادمانی اور مسرت سے ساری فضا میں شعریت ہی شعریت تھی۔ میں اس رومان کی سحر کاریوں میں کھویا ہوا تھا کہ ایک نوعمر بھکاری جس کے چہرے پر حیا کھیل رہی تھی اور جو افلاس کا ہاتھ پکڑے اپنا نحیف دستِ طلب دراز کر رہا تھا اُس کی قمیص اُس کے گلے کا ہار بنی ہوئی تھی۔ وہ سردی سے کانپ رہا تھا اُس کے دانت سے دانت بج رہے تھے۔ بھری ہوئی آواز میں ہر ایک کو اپنی بپتا سنا رہا تھا کہ صبح سے ایک کھیل تک منہ میں نہیں گئی۔ اس کی منت پر راہرو اُسے نوکری کا حکم دیتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ اُس کی حالت سے متاثر ہو کر میں نے ایک دوانّی اس کی طرف پھینک دی۔ چونکہ وہ مجھ سے کچھ دور تھا۔ وہ سڑک پر جا گری۔ وہ اُسے لینے کے لئے جھپٹا ——— اور ایک تیز رفتار موٹر کے نیچے کچلا گیا ———

اب اس میں باقی کیا تھا ——— اس کا جسم برف کی طرح سرد تھا، اس کی آنکھیں ساری داستان سنا رہی تھیں ——— وہ موت کی آغوش میں گہری نیند سو رہا تھا ——— اور اس کے سرہانے دوانّی چمک رہی تھی۔

محمد محبوب حسین متعلم بی۔ اے (عثمانیہ)

اشکِ نظر

برقِ نظر کا واسطہ برقِ نظر گرائے جا
قلبِ طلب شعار کو راہِ وفا دکھائے جا

نغموں میں تیرے آگ ہے آگ یوں لگائے جا
مطربِ دردِ آشنا دیپک سروں میں گائے جا

موسمِ گُل ہی ساقیا دیکھ گھٹائیں چھا گئیں
بربطِ دل کو چھیڑ دے جام اُٹھا پلائے جا

حسرتِ دید مٹ گئی لذتِ درد کی قسم
مجھ پہ کبھی کرم نہ کر عشق کا غم بڑھائے جا

قلب و جگر کو تھام نے ضبطِ فغاں سے کام لے
منزلِ شوق سے نکل حسن کو آزمائے جا

حسرتِ ذوقِ آگہی تیرے لئے نہیں سہی
تجھ کو تری خبر نہیں تو یونہی مسکرائے جا

اے میری جانِ آرزو حسنِ طلب کا واسطہ
لذتِ دید بخش دے ذوقِ نظر بڑھائے جا

نظر

فلسفہ ابن خلدون

(بہ سلسلہ گزشتہ)

(۹)

سیاست ابن خلدون کی رائے میں اہل عرب کو سیاست سے ذرا بھی مناسبت نہیں۔

افریقیہ میں ایک زمانہ دراز سے جو بے انتظامی پھیلی ہوئی تھی اور اندلس کی عربی ریاستیں جس بے تدبیری سے اسلامی مقبوضات کو ہاتھ سے کھو رہی تھیں اس کی بنا پر ابن خلدون کو خود عربوں سے ایک طرح کی نفرت ہوگئی تھی اور اُن کو یقین آگیا تھا کہ فطری طور پر اس قوم میں تمدن کا مادّہ ہی نہیں ہے،

اس زمانہ میں عربوں کی جہالت و بدویت ابن خلدون کے عہد سے بڑھی ہوئی ہے، لیکن علمائے اقوام کی رائے میں شایستگی کا فطری مادہ ان میں اکثر قوموں سے زیادہ موجود ہے۔

ابن خلدون خود عرب تھے اور حکیمانہ مزاج کے بزرگ تھے، لیکن گردوپیش کی قومی تباہی نے اُن کو سخت فیصلہ پر مجبور کردیا، اہل یورپ آرین نسل سے ہیں، عرب سے اُن کو کوئی تعلق نہیں، عرب کا توحش بھی اس زمانہ میں بہ نسبت پہلے کے بہت بڑھا ہوا ہے، مگر تحقیق سے اُن پر ثابت ہوچکا ہے کہ یہ سوء مزاج عارضی ہے۔

عربیت کی اصل فطرت میں کوئی نقصان نہیں ہے۔

جوہر و عرض میں فرق

ذاتی و عارضی حالت میں امتیاز کرنے کا قاعدہ خود ابن خلدون کی ایجاد ہے مگر افسوس ہے کہ اس مسئلہ میں ان کو اس قاعدہ سے فائدہ اٹھانے کا خیال نہ رہا، جو کام اُن کے کرنے کا تھا یورپ نے اُس کی تکمیل کی،

تاہم عرب کے حسن سیاست کے آثار ایسے نہ تھے کہ چشم پوشی ہو سکتی،

ابن خلدون کو بھی اس کا اعتراف ہے۔

لیکن اُن کی رائے یہ ہے کہ "قوم عرب گو فطرۃً بدوی ہے مگر (اسلام) کے اثر نے اس کو متمدن بنا دیا"

ہر چند ابھی یہ اعتراض باقی ہے کہ مذہب سے وہی قوم اثر پذیر ہو سکتی ہے جس میں فطرۃً قابلیت کا مادہ موجود ہوگا۔

فرماتے ہیں۔

اسلام کی بدولت دنیا پر چھا گئے

لما سید لهم (ای العرب) الدین امر السیاسة بالشریعة و احکامها المراعیة لمصالح العمران ظاهراً و باطناً و تتابع فیها الخلفاء عظم حینئذ ملکهم و قوی سلطانهم

جب مذہب نے شریعت و احکام شریعت کی وجہ سے، جن میں عمرانی مصلحتوں کی رعایت ظاہراً و باطناً ہر طرح پر تھی، سیاست کی بنیاد قوم عرب میں مستحکم کر دی اور خلفائے اسلام اس کی پیروی کرتے تھے تو ان کی سلطنت بھی عظیم الشان طاقتور ہوگئی

نماز کا اثر ایرانیوں پر

کان رستم اذا رأی المسلمین یجتمعون للصلوٰة یقول "اکل عمر کبدی یعلم الکلاب الآداب"

رستم (ایران کا ساسانی سپہ سالار جس کو سعد بن ابی وقاص نے شکست دی) نے جب مسلمانوں کو نماز کے لئے جمع ہوتے دیکھا تو بول اُٹھا کہ "عمر (بن خطاب) میرا کلیجہ کھا گئے، کتوں کو آداب و شائستگی کی تعلیم دی ہے"

ضعف شریعت موجب ضعف حکومت

ثم انهم بعد ذلک انقطعت منهم عن الدولة اجیال نبذوا الدین فنسوا السیاسة و رجعوا الی قفرهم و جهلوا شأن عصبیتهم

اس کے بعد خلافت سے علیحدہ ہو کر ایسی نسلیں پیدا ہوئیں جنھوں نے دین اسلام کو پس پشت ڈال دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ سیاست کو بھی (جو اسی دین کا ثمرہ تھی) بھول گئے، بدویت پھر عود کر آئی عصبیت فراموش ہوگئی،

فتوحشوا کما کانو۱ [۵] جیسے وحشی پہلے تھے پھر ہوگئے۔

(۱۰)

نمونہ سیاست عرب مسلمان مدبّروں میں حجاج بن یوسف سب سے زیادہ بدنام ہے، وہ اس قدر سفاک اور خون ریز سمجھا گیا کہ مؤرخین اُس کو وحشی درندہ اور مردم خوار جانور کہنے لگے، جس قدر اُس کی رسوائی ہوئی دنیائے اسلام میں بہت کم لوگوں کی ہوئی ہوگی، با ایں ہمہ سیاست میں اس کی بیدار مغزی کا یہ عالم تھا کہ محمد بن قاسم کو جب سندھ فتح کرنے کے لئے بھیجا تو یہ انتظام کیا کہ روزانہ فوجی کارروائیوں کی اطلاع تیسرے دن اُس کو ہوا کرے۔

تین دن میں سندھ سے عراق میں ڈاک کا پہونچنا کوئی معمولی بات نہ تھی لیکن اُس کی خوش نظمی سے یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔

فاتحانہ تدبّر حجاج عراق میں ہے، لیکن اسلام ہے کہ اپنی طاقت آزمائی کے آثار ایک طرف تاتار وچین میں، دوسری جانب مغرب اقصی واندلس میں، اور تیسری سمت ہندوستان میں نمایاں کر رہا ہے، سب کو مستقر حکومت (عراق) سے حجاج کی مسلسل ہدایتیں پہونچتی رہتی تھیں، ہر ایک سپہ سالار اُسی کی راہ نمائی میں فاتحانہ پیش قدمی کرتا تھا۔

قُتیبہ بن مسلم توران وتاتار کو فتح کرکے خاص چین پر چڑھائی کرتا ہے۔

موسی بن نصیر نے برّاعظم افریقیہ کو اسلام کا حلقہ بگوش بنا لیا ہے اور اب اندلس پر حملہ آور ہے کہ یورپ کی تثلیث بھی اللہ کی توحید پر ایمان لائے۔

محمد بن قاسم ہندوستان کو دیوتاؤں کی غلامی سے نجات دلانے کے درپے ہے۔

اور یہ سب ہر ایک کوچ ومقام میں، ہر ایک اقدام میں اسی نقشہ پر کاربند ہیں جو عراق سے آتا رہتا ہے۔

چین واندلس تو ہم سے بہت دور واقع ہیں، خاص ہندوستان کی داستان سُنئے۔

موقع جنگ کا نقشہ زمانہ کے تمسخر نے آج سندھ کے جس شہر کو ٹھٹھہ مشہور کر رکھا ہے ایرانی تمدن اسی کو تتّہ، کہتا تھا۔ یہ وہی مقام ہے جہاں سندھیوں کا قدیم ترین شہر "دیبل" آباد تھا، بودھ مت کی حکومت تھی شہر بھر میں مندر ہی مندر تھے جن میں بودھ کے مجسّمے ویسی ہی نظر فریبیوں کے ساتھ نمودار تھے جیسے ایلورا میں نمایاں ہیں۔

---

[۵] ابن خلدون، ج ۱، ص ۱۲۸

اسی لئے پوری آبادی کو دیبل (دیول) کہتے ہیں۔

ایک موقع پر جب کہ شہر دیبل کو افواج اسلام نے ہر طرف سے گھیر رکھا تھا، محاصرہ زوروں پر تھا، لیکن مقابلہ میں بھی کوئی کمزوری نہ تھی، مدافعہ کا پورا ساماں فراہم تھا، مسلمانوں کی تمام کوششیں سندھیوں کی بہادرانہ مدافعت سے بیکار جاتی تھیں، اس موقع پر حجاج نے نقشۂ جنگ خود مرتب کرکے بھیجا اور اسی نقشہ کے مطابق لشکر اسلام حملہ آور ہوا تو شہر فتح ہوگیا تکبیر نے ناقوس کو شکست دی، دیوتاؤں نے خدا کے لئے جگہ خالی کردی اور خود چل دیئے، تفصیل تو طویل ہے، اندازہ شناسی کے لئے ابن جابر بلاذری کا یہ اجمال بھی کچھ کم نہیں، فتح سندھ کے بیان میں لکھتے ہیں۔

سندھ اور عراق میں ڈاک کا انتظام

کانت کتب الحجاج ترد علی محمد، وکتب ترد علیہ، بصفۃ ما قبلہ واستطلاع رایہ فیما بہ فی کل ثلاثۃ ایام۔

محمد بن قاسم کے نام حجاج کے فرمان، اور حجاج کے حضور میں محمد بن قاسم کے عریضے پہونچتے رہتے، جنگ کی کیفیت اور جو حالات رو برو ہوتے محمد بن قاسم سب کچھ لکھتے اور آئندہ طرز عمل کے لئے حجاج کی رائے دریافت کرتے، انتظام ایسا تھا کہ ہر تیسرے دن یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں ڈاک پہونچ جایا کرتی تھی۔

عراق فتح سندھ کی تدبیر بتاتا ہے

فورد علی محمد من الحجاج کتاب ان: انصب العروس، واقصر منها قائمة، ولتکن مما یلی المشرق، ثم ادع صاحبها فمره ان یقصد برمیها الدقل الذی وصفت لی۔

فرمی الدقل فکسر .... ففتحت عنوة

حجاج کا ایک فرمان اس مضمون کا آیا کہ:

منجنیق کا ایک پایہ نکلوا کر مشرق رویہ اس کو نصب کرا دو اور منجنیق انداز کو حکم دو کہ مندر کے منارے کو، جس کی کیفیت تم لکھ چکے ہو، نشانہ بنائے۔

اس ہدایت کے مطابق منجنیق سے جب منارے پر سنگباری شروع ہوئی تو وہ ٹوٹ گیا ...... اور شہر بزور شمشیر فتح ہوگیا

آج بھی کیا کوئی لشکر اس سے زیادہ حربی لیاقت کا ثبوت پیش کرسکتا ہے؟

مقصد یہ نہیں کہ حجاج کی توصیف ہو۔

مدعا یہ ہے کہ قوم عرب جس کا ایک بدترین فرد حجاج مانا گیا ہے۔ ایسی قابلیت اور اس شان کی قوم تھی۔

اس پر بھی اگر ابن خلدون کی یہی رائے ہے کہ قوم عرب میں یہ مادہ نہ تھا، اس نظم و نسق و تدبر و تقدم کا منشائے حقیقی اسلام تھا تو یہی سہی، اس کے اعتراف میں بھی کوئی تامل نہیں، تاریخ کو تسلیم ہے کہ قوم نہایت وحشی اور جاہل قوم تھی، اسلام نے، اور صرف اسلام نے اُس کو اعلےٰ درجہ کا متمدن بنا دیا اور اس کے کارناموں میں ایسی شان پیدا کر دی جس پر خود ابن خلدون بھی جا بجا اپنی تاریخ میں اظہار حیرت کرتے ہیں ؎

کیمیائیست عجب بندگی پیرِ مغاں
خاکِ اوگشتم وچندیں درجانم دادند

(۱۱)

عمارت، صنعت اور کارخانے فن تعمیر سے عرب کو قدرتی مناسبت تھی قبل اسلام وہ اس فن میں شہرۂ آفاق رہ چکے تھے اور بعد اسلام بھی یہ شعبہ انھیں کے زیر سایۂ عاطفت رہا، زراعت کی سیرابی اور فلاحت کی شادابی کے لئے یمن کے قدیم ترین شہر (مارب) میں انھوں نے جو بند باندھا تھا عرب میں اُس کے استحکام داستواری کے عجیب و غریب افسانے مشہور تھے، ابن خلدون نے بھی اُس کا تذکرہ کیا ہے :

سد مارب ان الذی بناہ سبا بن یشجب وساق الیہ سبعین وادیا، وعاقہ الموت عن اتمامہ، فاتمہ ملوک حمیر من بعدہ[۱]

مارب کا بند بادشاہ سبا بن یشجب نے تعمیر کرایا تھا، ستر نہروں کا پانی اس بند میں گرتا تھا اور سب جمع رہتا تھا، تعمیر کا کام تمام نہ ہونے پایا تھا کہ موت نے اُس کا کام تمام کر دیا، اس کے بعد سلاطین حمیر نے اُس کی تکمیل کی۔

جس قوم نے اپنے ملک کی آبیاری میں ستر نہروں سے امداد لی ہو اور سد مارب جیسا تاریخی بند باندھا ہو، تعمیر اور تخت سے علم عمران اُس کو بیگانہ کیونکر کہہ سکتا ہے ؟

اسلام میں عربوں کے زیر اثر اس فن نے جیسی کچھ ترقی کی اُس کی تفصیل درکار ہو تو اسپین جاؤ، الزہرا کے کھنڈروں کی زیارت کرو، قرطبہ کی مسجد جامع کو سلام کرو جسے توحید سے لے کے تثلیث نے گرجا بنا لیا ہے، اشبیلیہ جا کر دیکھو کہ اس خاک میں آثار عرب کے کس قدر جواہر رلے ہیں، غرناطہ کی شکستہ مسجدوں سے پوچھو کہ دل شکستہ آل مدنان کا تمدن کس شکوہ و شان کا

---

[۱] ابن خلدون، صفحہ ۲۸۹،

حال تھا، ایوانِ حمرا سے دریافت کرو کہ تمدنِ عرب نے کس عظمت کی زندگی بسر کی تھی، زبانِ قال ہزار خاموش سہی زبانِ حال ضرور جواب دے گی، وہی جواب ابنِ خلدون کو سُنا دو۔

اقول لرکبٍ قافلین رأیتھم قفا ذاتِ اوشال ومولاک قاربُ

(وہ قافلہ کہ سفر سے واپس آرہا ہے میرے سامنے ہے، میں اُس کو دیکھ رہا ہوں، اگرچہ ابھی اوٹ کے پیچھے ہی لیکن میں اُس سے خطاب کر رہا ہوں)

قِفا خبّرانی عن حمی الحیّ انّنی لآثارہ من حیدرآباد طالبُ

(ذرا ٹھہرنا، مجھے میری قوم کے حریمِ عظمت کی خبر دینا، حیدرآباد ہی سے میں اس کے مشاہدۂ آثار کا طلبگار ہوں)

فعاجوا فاثنوا بالذی انت اھلہ ولو سکتوا اثنت علیک الحقائبُ

یہ سن کے وہ پلٹ آئے اور ایسی ثنا و صفت کی جو شایانِ شان تھی، لیکن اگر وہ خاموش رہتے جب بھی مضایقہ نہ تھا کہ اس صورت میں جتنے آثارِ عظمت ہیں سب کے سب یکزبان ہو کے تعریف کرنے لگے؟

ابھی اس میں مزید تبصرہ کی گنجائش ہے جسے آیندہ کے حوالے کرتے ہیں۔

عمادی

آنکھ مچولی

آؤ کھیلیں آنکھ مچولی
آنکھ مچولی پریم کی ہولی
ساون آیا پیکی بولی
وہ دیکھو کویل بولی
آؤ کھیلیں آنکھ مچولی

چھپ کے نظر سے دل میں سماؤ
دل میں سماؤ روح پہ چھاؤ
ہر اک سانس میں آ جاؤ
آنکھ مچولی کھیلیں آؤ
آؤ کھیلیں آنکھ مچولی

پہلے چاہو جتنا ستا لو
حوصلے سارے دل کے مٹا لو
پھر کچھ ایسا ڈھنگ نکالو
میں تمھیں پاؤں تم مجھے پالو
آؤ کھیلیں آنکھ مچولی

سارے جہاں کی آنکھ بچا کر	رکھوں تم کو دل میں چھپا کر
خود کو کھو دوں تم کو پا کر	پریم سے اپنی آنکھ مچا کر

آؤ کھیلیں آنکھ مچولی

کھیل ہے یہ مت شرماؤ تم	میں ہوں چور نہ گھبراؤ تم
چور کو آتا جب پاؤ تم	ڈر کے دل میں چھپ جاؤ تم

آؤ کھیلیں آنکھ مچولی

چور بنے تم حیران ہوں میں	کیا کروں اب اور کیا نہ کروں میں
تم سے بھلا کس طرح بچوں میں	کس کے دل میں جا کے چھپوں میں

آؤ کھیلیں آنکھ مچولی

پریم اندھا دھند دوڑ کر آیا	بھاگو بھاگو چور ادھر آیا
وہ تو دل میں اُتر آیا	ہم کو تم کو سب کو ہرایا

آؤ کھیلیں آنکھ مچولی

اس نگری کی میت یہی ہے	میت یہی ہے پیت یہی ہے
ہارنا من کا گیت یہی ہے	تمکینؔ پریت کی ریت یہی ہے

آؤ کھیلیں آنکھ مچولی

تمکین

ہوگا۔ نو آباد علاقوں میں مزدوروں کی اس شدت کے ساتھ جو طلب رہتی ہے اس کا بدیہی سبب یہی ہے کہ وہاں وسایل قدرت کی توفرادانی ہے لیکن انسانی عنصر کی قلت ہوتی ہے۔ ان ممالک کی کیفیت اس کے برعکس ہے جن کے ہاں انسانی عنصر تو بافراط موجود ہے لیکن وسائل قدرت کم ہیں۔ جب یہ بات ثابت ہوچکی کہ قومی مرفہ الحالی کے لئے وسائل قدرت اور اسی کے ساتھ ان سے استفادہ اتم ضروری ہیں تو اب ہم اسی نقطۂ نظر سے حیدرآباد کے معاشی ذرائع کا مطالعہ کریں گے اور دیکھیں گے کہ ان سے کس حد تک استفادہ کیا جارہا ہے اور اگر کیا جارہا ہے تو آئندہ اس سے زیادہ استفادہ کیا جاسکتا ہے یا نہیں۔

معاشی ذرائع ریاست حیدرآباد کے معاشی ذرائع کو سہولت کی خاطر دو ابواب میں ترتیب دیا جاسکتا ہے۔ زرعی وسائل اور صنعتی وسائل۔ زرعی وسائل میں اولاً خود زرعی پیداوار شامل ہے اور ثانیاً جنگلات۔ اسی طرح صنعتی وسائل میں ایک تو وسایل معدنی داخل ہیں اور دوسرے ذرائع قوت محرکہ۔

زرعی وسایل ریاست حیدرآباد کو بعض مخصوص ارضی خصوصیات کی بدولت دو جداگانہ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

تلنگانہ :- وہ علاقہ جہاں سرخ یا سرخ ریتیلی مٹی پائی جاتی ہے

مرہٹواڑی :- وہ علاقہ جہاں سیاہ، بھوری یا سیاہ ریتیلی مٹی پائی جاتی ہے

ان مخصوص ارضی کیفیات کا اثر یہ ہے کہ ان علاقوں کی پیداوار بھی جداگانہ ہوگئی ہے۔ تلنگانہ کی سرخ مٹی جو نمی کو زیادہ دیر تک محفوظ رکھتی ہے چاول کے لئے مخصوص ہے اور مرہٹواڑہ کی سیاہ مٹی (ریگڑ) گیہوں اور کپاس کے لئے مختص ہوگئی ہے۔

اس حد پر پہنچنے کے بعد زرعی وسائل کے متعلق مزید تفصیلات میں جانے سے قبل مناسب ہے کہ ملک کے مجموعی رقبے، رقبۂ زیر کاشت اور رقبۂ اُفتادہ کو بیان کردیا جائے۔ ریاست حیدرآباد کا مجموعی رقبہ (۵۵،۸۰،۹۰۵،۱۲۰) [1] ایکڑ، رقبۂ زیر کاشت (۲،۰۶۸،۳۱،۰۵،۴۴) [1] ایکڑ ہے۔ مابقی کے منجملہ (۹،۰۱۴،۰۰۰) [2] ایکڑ اراضی جنگلات پر مشتمل ہے اور باقیماندہ ایک کروڑ ستر لاکھ ایکڑ اراضی افتادہ ہے۔

ریاست حیدرآباد کے اہم اجناس زرعی میں کپاس، گیہوں، جوار، چاول، روغنی تخم اور مونگ پھلی شامل ہیں۔ ان میں سے جوار اور انڈی کا رقبہ کاشت کے لحاظ سے سارے ہندوستان میں ریاست حیدرآباد کا درجہ اول، مونگ کے لحاظ سے دوم اور کپاس کے لحاظ سے سوم ہے۔

یوں تو ریاست حیدرآباد میں نبیلہ، گدگ اور جیادنت قسم کی کپاس بھی کاشت کی جاتی ہے لیکن جب کپاس کے لئے

---

[1] و [1] از زرعی رپورٹ ۱۳۴۱ف

[2] رپورٹ سالانہ بیمن شیر جنگلات حکومت سرکار عالی

ریاست حیدرآباد سارے ہندوستان میں ممتاز ہے وہ گورانی کپاس ہے جس کے متعلق پہلے شدہ بات ہے کہ دیگر ہندوستانی کپاسوں سے اس کا ریشہ بڑا، مضبوط اور ملائم ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے "انڈین سنٹرل کاٹن کمیٹی" نے اپنا ایک خاص مشیر نباتات یہاں مقرر کر رکھا ہے اور اس قسم کپاس کی ترقی کے لئے پانچ سال تک سالانہ پچیس ہزار روپیہ امداد دینے کا وعدہ بھی کیا ہے۔ ریاست حیدرآباد میں کپاس کی سالانہ مقدار پیداوار (۵۵۶۸۰۹۴) گٹھے ہوتی ہے کُل ہندوستان میں جس قدر رقبہ کپاس کے زیر کاشت ہے اس کا (۱۴ر۸۸) فیصدی جزو ریاست حیدرآباد میں ہے۔

گیہوں زیادہ تر مرہٹواڑی کے علاقہ میں پیدا ہوتا ہے۔ جہاں اس کی کاشت کے لئے آبپاشی کا کوئی اہتمام نہیں کیا جاتا۔ اسی لئے حیدرآباد کے گیہوں ہندوستانی بازار میں کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ جو تخم کسان استعمال کرتے ہیں وہ حد درجہ کمزور اور ناقص مخلوط قسم کے ہوتے ہیں جن سے نہ تو مقدار پیداوار ہی زیادہ ہوتی ہے اور نہ قسم پیداوار ہی اعلیٰ۔ محکمہ زراعت کی تحقیقاتی کوششوں اور تبلیغی مظاہروں کی بدولت اب پوسہ نمبر ۴ - پونہ نمبر ۳۸ قسم کے گیہوں کی کامیابی کے ساتھ کوشش ہونے لگی ہے۔ علاوہ مرہٹواڑی کے تلنگانہ میں بھی آبپاشی کے ساتھ گیہوں کی کاشت کی کوشش کی جارہی ہے جہاں (۲۵) من فی ایکڑ پیداوار کا تخمینہ کیا گیا ہے۔

گیہوں کا زیر کاشت رقبہ (۱۳ر۰۰ر۶۷۹)[1] ایکڑ اور مقدار پیداوار (۱ر۶۸ر۳۲۸) ٹن سالانہ ہے[2]۔

چاول ریاست حیدرآباد کے جملہ باشندگان کی عموماً اور اہل تلنگانہ کی خصوصاً مرغوب غذا ہے لیکن اس کے باوجود تلنگانہ کا صرف (۳) فیصد حصہ اس کے زیر کاشت ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہر سال بمقدار کثیر چاول درآمد کئے جاتے ہیں جو مدراس، اور صوبجات متوسط سے آتے ہیں۔

جوار کے تحت کل ہندوستان میں سب سے زیادہ رقبہ ریاست حیدرآباد ہی میں ہے یہاں جوار کے تحت (۹۰) لاکھ ایکڑ اراضی زیر کاشت ہے۔ ملک کے غریب طبقوں کی یہی عام غذا ہے۔

ریاست حیدرآباد کے متعلق بمبئی کے ایک مشہور تاجر نے کہا تھا کہ "حیدرآباد کی سونے کی کانیں اس کے روغنی تخموں کے کھیتوں میں ہیں"۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ جس قدر ارنڈی حیدرآباد میں اُگتی ہے ہندوستان میں کیا دنیا بھر میں کہیں نہیں پیدا ہوتی اس کے بعد مونگ پھلی کا نمبر ہے پھر تل، السی اور کرڑ کا۔ ریاست حیدرآباد کی برآمد کا ۴۰ فیصدی حصہ روغنی تخم پر مشتمل ہوتا ہے جس میں صرف ارنڈی کی قیمت ایک کروڑ روپیہ ہوتی ہے۔

اسی طرح تمباکو بھی ایک مفید تجارتی جنس ہے جس کے لئے مخصوص موافق حالات یہاں موجود ہیں۔ اس بارے میں

---

[1] و [2] زرعی رپورٹ سنہ ۱۳۴۴ف

سی سری واستوا صاحب اور ونیکٹ رامن صاحب جیسے ماہران زراعت کے مشورے حاصل کیئے جاچکے ہیں اور محکمۂ زراعت کی کوششوں سے مزارعین میں کوئمبتور ۲۱۳ کی مانگ پیدا ہوچکی ہے۔ نظام ساگر کی تکمیل کے بعد سے نیشکر کی کاشت کے امکانات اور بھی زیادہ ہوچکے ہیں۔ بعض ایسے حضرات کی رائے میں جنھوں نے نیشکر کی کاشت کا تجربہ خود کیا ہے یہاں نیشکر کے خاص موافق حالات موجود ہیں۔ مثلاً میسور میں نیشکر پختہ ہونے کے لئے (۱۲ تا ۱۴) مہینے درکار ہوتے ہیں اور یہاں اسکے پختہ ہونے کے لئے (۱۰) ماہ کافی ہیں۔ حیدرآباد کے ایک وکیل صاحب مسٹر لکشمن راؤ نے اس بات کی توثیق کی ہے جنھوں نے بذاتہ اسکو آزمایا ہے۔ نیشکر کیلئے تری آب وہوا، خشک موسم اور موافق برسات چاہیئے اور خط استوا سے قریب ہونے کی وجہ سے ریاست حیدرآباد کو یہ سب باتیں حاصل ہیں جو شمالی علاقوں کو حاصل نہیں۔ شمالی ہند میں نیشکر کی فصلیں کہر کی وجہ سے خراب ہوجاتی ہیں یہاں اس کا امکان نہیں۔

جنگلاتی وسائل | علاوہ ان خالص زرعی اجناس کے ریاست حیدرآباد کے جنگلات سے بھی اہم وسائل مہیا ہوسکتے ہیں۔ ہمہ قسم کا تعمیری چوبینہ خصوصاً پاکھال کے جنگلوں کا ساگوان، عادل آباد کے جنگل میں دیاسلائی کی لکڑی۔ بانس اور کاغذ سازی کے مفید مطلب گھاس جسے "سبابر" کہتے ہیں۔ مہوہ جس سے علاوہ دیسی شراب بننے کے پٹرول سازی کے بھی امکانات ہیں۔ تاڑی کے درخت جن سے محکمۂ آبکاری کو کثیر آمدنی ہوتی ہے قسم قسم کے رنگ بنانے کی جڑی بوٹیاں یہ تمام چیزیں ممالک محروسہ کے جنگلات میں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ یہ جنگلات بہ نسبت مرہٹواڑی کے تلنگانہ میں زیادہ ہیں۔ مسٹر ایل۔ ٹی۔ مین مشیر جنگلات حکومت سرکارعالی کی رائے میں کسی زرعی ملک کی اغراض کے لئے کم از کم ۱۵ فیصدی رقبہ جنگلات کا ضروری ہے۔ حالانکہ ریاست حیدرآباد میں (۱۲) فیصد سے بھی کچھ کم ہے۔ مزید برآں ان جنگلات کی ضلع ضلع میں تقسیم غیر مساوی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ سالانہ (۲ لاکھ ۶۹ ہزار) روپیہ کا چوبینہ اور (۴ لاکھ ۱۵؍) روپیہ کا فرنیچر ملک میں درآمد کیا جاتا ہے۔

معدنی وسائل | ریاست حیدرآباد اپنے کان کنی کے مشاغل و کاروبار کی وجہ سے بہت قدیم زمانہ ہی سے مشہور ہے چنانچہ وادی کرشنا میں الماس کے ذخائر موجود تھے مشہور فرانسیسی سیاح اور جوہری "ٹاورنیر" نے ۱۶۵۰ء میں مقام کولور (۶۰) ہزار مزدوروں کو کام کرتے دیکھا ہے۔ چنانچہ دکن مائننگ کمپنی نے سات ہزار پونڈ کی رقم خطیر سے چار ہزار ریزہ ہائے الماس نکالے تھے جن کی مجموعی قیمت صرف سات سو وصول ہونے کی وجہ سے کمپنی نے اپنا کام بند کردیا۔ بہت ممکن ہے کہ

ماہران طبقات الارض کی نظروں سے بہت سے ذخائر رہ گئے ہوں۔ چنانچہ اسی کا ایڈیبل مصنف تاریخ قلمرو آصفیہ نے بھی راے ظاہر کی ہے۔

سونا رائچور دوآبہ میں پہلے پہل جیولوجیکل سروے آف انڈیا کے ڈاکٹر کنگ نے ۱۸۸۲ء میں دریافت کیا تھا۔ ۱۸۸۲ء میں حیدرآباد دکن کمپنی نے اس کام کا بیڑا اٹھایا مگر ۱۹۲۰ء میں کام بند کر دیا۔ اسکے بعد سے ہمارے محکمہ تحقیقات طبقات الارض نے کوشش کی ہے اور اب یہ دریافت کرلیا ہے کہ رائچور دوآب میں سونے کے کافی ذخائر موجود ہیں چنانچہ اس سال حکومت سرکارعالی کے موازنہ میں آٹھ لاکھ روپیہ اس مقصد کے لئے مختص کئے گئے ہیں۔

سنگرینی کے معادن زغال بھی ڈاکٹر کنگ ہی نے ۱۸۷۲ء میں دریافت کیا تھا اور ۱۸۸۶ء سے کام آغاز ہوا۔ ڈاکٹر کنگ کا اندازہ ہے کہ سالانہ چار لاکھ ٹن کے حساب سے سنگرینی کے معادن ایک سو برس سال کو کافی ہونگے۔

ان کے علاوہ تانبا اور چینی مٹی چترپال میں، ابرک کھمم میں اور گرافائٹ حسن آباد اور پیرتی میں ملتے ہیں۔ خام لوہا بیلغرپ، نرل اور ورنگل کے قریب پایا جاتا ہے۔ ماہرین علم طبقات الارض کی رائے ہیں سنگرینی کے قریب پتھر کے ذخائر بھی موجود ہیں جس کی وجہ سے صنعت آہن و فولاد کو خاصی ترقی ہوسکتی ہے۔

قوت محرکہ | ابتک ہندوستان کے برقی نقشے میں ریاست حیدرآباد نے جگہ نہیں پائی۔ حالانکہ یہاں کرشنا اور گوداوری جیسے دریا موجود ہیں جن سے جل بجلی بمقدار کثیر پیدا ہوسکتی ہے۔ چنانچہ مسٹر یم جی کشن راؤ کے خیال میں اگر ریاست کے جملہ ذرائع کو استعمال کیا جائے تو (۸۰) ہزار قوت اسپ قوت محرکہ پیدا ہوسکتی ہے۔ حال میں نواب احسن یار جنگ بہادر چیف انجینیر و معتمد تعمیرات عامہ حکومت سرکار عالی نے اپنی لائلی تقریر کے دوران میں فرمایا کہ جملہ ذرائع سے تمتع کیا جائے تو (۲) لاکھ کیلو واٹ جل بجلی بہ آسانی پیدا ہوسکتی ہے۔

انسانی عنصر | اب تک ہم نے ریاست حیدرآباد کے ذرائع معاشی پر غور کیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان سے استفادہ کیلئے جو انسانی عنصر یا بہ الفاظ دیگر مزدور یہاں موجود ہیں۔ ان کی کیا حالت ہے۔ آبادی کے لحاظ سے تو مزدور اس قدر وافر تعداد میں موجود ہیں کہ ان وسائل قدرت سے افادہ اتم حاصل کیا جاسکتا ہے لیکن ان کی صلاحیت کے اعتبار سے ان میں یہ اہلیت نہیں چنانچہ سب سے پہلے ہماری نظروں میں یہ بات کھٹکتی ہے کہ یہاں کی آبادی کی عظیم اکثریت یعنی (۴۸۳۶۹۰۳۱۴)[50] افراد زراعت پیشہ ہیں۔ (۶۸۳۶۸۲۹) کارخانے کے مزدور ہیں[51]۔ اور (۷۹۷۶۶۰۱) گھریلو دستکار۔ ظاہر ہے کہ ۲ لاکھ ۶۸ ہزار ایکر اراضی پر اگر

---

۵۰ مردم شماری ۱۹۳۱ء

۵۱ مردم شماری ۱۹۳۱ء

۵۲ مردم شماری ۱۹۳۱ء

۸۳ لاکھ افراد کا بار پڑجائے تو دیگر پیشوں اور زراعت میں توازن نہیں رہ سکتا۔ اسی بار کی وجہ سے زمینات پر تقسیم و انتشار اراضی کا عمل درآمد شروع ہوا۔ پیداوار فی ایکر کم ہونے لگی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ کاشتکار مفلس و قلاش ہونے لگے۔

چنانچہ حیدرآبادی کسانوں کی اکثریت کے متعلق "ہندوستانی اقتصادیات" کے مصنف مسٹر کیبوا اینگار کا یہ مقولہ صادق آتا ہے کہ وہ بھوک کو رفع نہیں کرتے بلکہ بہلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حیدرآبادی کسان غریب مفلس اور جاہل ہے۔ اور اسکے اس افلاس و جہالت نے اس کو قرضے کے بار گراں کے تلے ایسا دبایا ہے کہ عمر بھر اس کو ہلکا کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے لیکن وہ بار بجائے ہلکا ہونے کے اور بڑھتا جاتا ہے۔

کارخانہ کے مزدوروں کی حالت بھی ان کے کسان بھائیوں سے کچھ زیادہ اچھی نہیں ہے۔ پہلے تو یہ خود ہنگامی مزدور ہوتے ہیں جو روزگار کی تلاش کیلئے شہروں میں آجاتے ہیں اور دوسرے اگر مستقل مزدور ہوں بھی تو کارخانوں کے انتظامات نہایت ابتر ہوتے ہیں۔ صفائی اور حفظان صحت کا بہت کم خیال رکھا جاتا ہے بعض صورتوں میں جسمانی اذیت بلکہ موت کا بھی معاوضہ مزدوروں کو نہیں ملتا۔ کارخانہ دار علانیہ قوانین کارخانجات کی خلاف ورزی کرتے ہیں لیکن حکومت کی طرف سے ان قانون شکن مالکان کارخانہ کو بہت کم مواقع پر قرار واقعی سزا ملتی ہے۔ چنانچہ اس واقعہ کی تصدیق خود مسٹر گرین چیف انجینیر آف فیکٹریز ملک سرکار عالی نے بھی کی ہے۔ مزدوروں کے امکنہ کا کوئی انتظام نہیں ہوتا۔ بچوں کو تو خیر کم ملازم رکھا جاتا ہے مگر عورتوں کی خاصی تعداد مزدور رہتی ہے۔ چنانچہ (۹۶۴۱) عورتیں رجسٹرڈ کارخانوں میں مزدوری کرتی ہیں۔ یہ تمام مزدور بالعموم بے مہارت ہوتے ہیں۔ ان کی کارکردگی بھی بالعموم پست و ادنیٰ ہوتی ہے تعلیم ان میں بہت کم رائج ہے۔ ان کی اجرت کا معیار بھی بہت پست ہے۔ ۶ ر روزانہ سے لے کر (۳، ۴) روزانہ تک مزدوری ملتی ہے اور چونکہ سکرانٹ کی لت پڑی رہتی ہے۔ اسی لئے یہ مزدوری بھی اسی کی نذر ہو جاتی ہے اور اس طرح مزدوروں کے معیار زندگی کا ان کی کارکردگی پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔

معاشی ذرائع سے استفادہ

بہ زمانہ ماضی کسی زمانہ میں ریاست حیدرآباد اپنی صنعتوں کیلئے نہ صرف ہندوستان بلکہ یورپ کے اکثر ممالک میں بھی مشہور تھی۔ چنانچہ ناندیڑ اور امرچنتہ کی ڈھاکہ کی سی ململ گلکنڈہ، محبوب نگر اور رائچور کی ریشمی ساڑیاں دور دور تک مقبول تھیں

اورنگ آباد اور پٹن کے کمخواب بنارس کے کپڑے کو مات کرتے تھے - پٹن اورنگ آباد اور آرمور زرتاری کے کام کے مرکز تھے - حیدرآباد ، ہنمکنڈہ ، لنگم پٹیہ اور پیپرتی میں مشہور اسلحہ بنتے تھے - مانی کنڈہ اور کویلکنڈہ کی چوڑیاں بہت شہرت رکھتی تھیں - کوٹلہ اور کاغذی پورہ کاغذسازی کے لئے مشہور تھے - ورنگل کے قالین حال حال تک انگلستان کی اسلنگٹن کی نمائش میں تمغے حاصل کرتے تھے لیکن مغربی مشین ساختہ کا ایسا سیلاب آیا کہ حیدرآباد کی صنعتیں یا تو بہ گئیں یا اگرچند میں کچھ دم باقی ہے تو وہ سسک رہی ہیں - اب بھی سنگاریڈی اور نارائن پیٹھ کی ساڑیاں - کریم نگر کے نقرئی برتن - بیدر کی بیدری صنعت - اورنگ آباد کے ہمرو ، اور ورنگل کے قالین باقی میں آثار حیات باقی ہیں -

اب رہی زراعت تو قدیم زمانہ میں نہ ریاست کی آبادی اس قدر کثیر تھی کہ زمین پر اس قدر بار پڑتا - اور نہ اجناس تجارت کی اسقدر بڑے پیمانہ پر کاشت ہوتی تھی - اس زمانہ میں زمینیں کافی زرخیز تھیں جس کی وجہ سے ان کی زرخیزی میں انحطاط نہ پیدا ہوتا تھا - اور نہ کھاد کی ضرورت پیش آتی تھی لیکن دورجدید میں آبادی کے اضافہ کے ساتھ ساتھ زمینات پر کاشت عمیق کا بار پڑا لیکن مزارعین اپنی قدیم عادت کے مطابق کھاد سے بے فکر رہے - نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف اضافہ آبادی کی وجہ سے انتشار اراضی و تقسیم اراضی کے امراض پیدا ہوئے تو دوسری طرف فی ہن مقدار پیداوار میں تخفیف ہوئی -

به زمانہ حال | آجکل حیدرآباد کے صنعتی ذرائع کا استعمال کثیر پیمانہ پر نہیں - آہن و فولادسازی کا کوئی کارخانہ یہاں موجود نہیں - حالانکہ ہم سالانہ (۴۲) لاکھ روپیہ کا سامان آہنی درآمد کرتے ہیں - ابھی حال میں ایک لمیٹڈ کمپنی اس غرض کے لئے قائم ہوئی ہے - پارچہ بافی کے پانچ بڑے کارخانے ہیں - جو بحیثیت مجموعی ملک کی پیداوار کپاس کا صرف (۲۰) فیصدی حصہ استعمال کرسکتے ہیں - ان کے علاوہ کپاس دبوائی ، دھان کی صفائی اور روغن کشی کے جملہ (۵۱۷) کارخانے ملک میں قائم ہیں - جن میں سے (۳۴۴) ہنگامی اور (۱۷۳) دائمی ہیں - انہیں (۳۴) میں ایک سمنٹ کا کارخانہ - دو سگریٹ کے کارخانے - دو یا تین ٹین کی فیاکٹریاں (۲) دیاسلائی کے کارخانے شامل ہیں - بہرحال موجودہ صورت حال کسی طرح اطمینان بخش نہیں کہی جاسکتی حیرت ہے کہ اسقدر وسیع وسائل قدرت کی موجودگی کے باوجود ملک کی صنعتی حالت اس قدر پست ہے -

معاشی ذرائع سے قومی ارتقا میں آیندہ کیوں کر کام لیا جائے

ملک کے معاشی وسائل اس قدر وسیع اور کثیر ہیں کہ حیدرآباد اگر دوسروں کے بازاروں پر قبضہ نہیں کرسکتا تو کم از کم اپنی احتیاجات کی تکمیل تو بہ آسانی کرسکتا ہے۔ ملک میں شکر اور گڑ کا صرفہ فی کس علی الترتیب (۳۲) اور (۱۶) پونڈ ہے اور ہندوستان میں (۶) اور (۲۰) پونڈ ہے۔ ظاہر ہے کہ معیار زندگی کی بلندی کے ساتھ ساتھ ہی شکر کی طلب میں بھی اضافہ ہوجائے گا۔ تقریباً ۱½ کروڑ روپیہ سالانہ کی شکر اور گڑ حیدرآباد درآمد کرتا ہے۔ دراں حالیکہ اسکے ہاں خود عمدہ نیشکر اگانے کی ہر قسم کی سہولتیں حاصل ہیں۔ چنانچہ ایک لمیٹیڈ کمپنی نے اس کا آغاز کردیا ہے کمپنی کے قیام سے ملک کے بہت کچھ توقعات وابستہ ہیں۔ حکومت نے بھی کمپنی کی مالی امداد میں دریغ نہیں کیا ہے

اسی طرح پارچہ بافی کی صنعت کی توسیع کی جاسکتی ہے۔ موجودہ صورت میں کپاس برآمدی کی قیمت چار کروڑ چھبیس لاکھ تین ہزار ایک سو روپیہ ہے۔ اور درآمدی قیمت تین کروڑ چھیانوے لاکھ تریپن ہزار ایک سو روپیہ۔ ضرورت ہے کہ ملکی کارخانوں کی کارکردگی بڑھائی جائے اور ملک کا مال ملک ہی میں استعمال کیا جائے۔

ریاست حیدرآباد میں کاغذ کی سالانہ درآمد سات لاکھ روپیہ کی ہے۔ ہم نے جنگلات کے بیان میں بتایا تھا کہ آصف آباد کے جنگلوں میں بھابر گھاس اس مطلب کے لئے مفید ہے۔ اسکے علاوہ بانس بھی اس غرض کیلئے کام آسکتے ہیں۔ سیتھربال کا مقام بہ لحاظ فراوانی آب و قربت ریلوے۔ فراہمی پیداوار خام کے کارخانۂ کاغذ سازی کے لئے بہت موزون ہے۔ اگر ملک میں کارخانہ کاغذ سازی کی بنا رڈالی گئی تو وقت کی ایک اہم ضرورت پوری ہوجائے گی چنانچہ بعض حلقوں میں یہ خبر گشت لگا رہی ہے کہ کسی خانگی کمپنی نے اس مقصد کیلئے حکومت سرکار عالی سے قیام کارخانہ کی درخواست بھی کی ہے۔

کسقدر حیرت کا مقام ہے کہ ریاست حیدرآباد میں اس قدر چمڑا ہوتا ہے کہ سالانہ (۳۰، ۳۵) لاکھ روپیہ کا درآمد کردیا جاتا ہے۔ اور اسکے عوض زیکوسلواکیا جیسا مقام جو کسی طرح ہمارے صوبہ اورنگ آباد سے بڑا نہیں ہے حیدرآباد کو آٹھ لاکھ روپیہ سالانہ کے بوٹ اور شوز روانہ کرتا ہے۔ یہیں سے دباغت کے لئے چھال جاتی ہے۔ اگر ملک میں وسیع پیمانہ پر صنعت چرم سازی و دباغت کو عام کیا جائے تو نہایت درجہ مفید ہوگا۔ اس خصوص میں

ہمارے ہمسایہ صوبہ مدراس اور ریاست میسور نے جو کوششیں کی ہیں وہ ہمارے لئے مثال ہیں۔

ہم سالانہ (۶۰) لاکھ روپیہ کی چاندی اور سونے کے تار درآمد کرتے ہیں کسی زمانہ میں یہ صنعت خود ہمارے ہی ہاں فروغ پر تھی۔ لیکن مشین سے بنے ہوئے صیقل شدہ تاروں نے ان کا بازار سرد کردیا۔ اگر ہمارے ہاں بھی اس مردہ صنعت کو جدید اصول پر زندہ کیا جائے تو نہ صرف ملک کی طلب ہی پوری ہوجائے گی۔ بلکہ وہ غریب صناع بھی برسر روزگار لگ جائیں گے جو آج مفلوک الحال ہیں۔

ہمارے ہاں اسوقت تین ورک شاپ ہیں۔ اوّلاً ریلوے ورک شاپ، دوم دارالضرب اور سوم انجینرنگ کالج ہمارا محکمہ ریلوے ہی سالانہ (۵۰) لاکھ کا ریلوے اثاثہ خریدتا ہے۔ اگر تینوں ورکشاپوں کو یکجا کرکے ایک مرکزی کارخانہ قائم کیا جائے تو ملک میں صنعت آہن و فولاد کی ترقی کی نئی راہیں کھل جائینگی۔

لیکن یہ سب کچھ اسی وقت ہوسکتا ہے جبکہ خود ملک میں حرفتی تعلیم کا معقول انتظام ہو۔ محکمہ کروڑگیری محصول اندازی کے وقت نہ صرف اپنی آمدنی پر نظر رکھے بلکہ ملکی مصنوعات کی امداد بھی اسکے پیش نظر ہو۔ حکومت کے موجودہ صنعتی ٹرسٹ سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جائے۔ محکمہ صنعت و حرفت نے جس طرح سے مہوہ سے پٹرول بنانے کی مشنری خریدی اور اب تک بیکار ڈال رکھی ہے ویسا طرز عمل نہ ہو اور نہ قائم کردہ کارخانے سرکاری سوپ فیکٹری کی طرح تباہ ہوجائے۔ اور نہ موجودہ کارخانہ گلاس سازی کے نوع کے کارخانوں کو امداد دیجائے جو اپنی کارکردگی کے لحاظ سے اور امداد کے سزاوار ہی نہ ہوں۔

غرض وسائل قدرت سے استفادہ میں توازن کا پیدا کرنا ہی سارے امراض کا علاج ہے۔ اگر ہم نے صنعت کی جانب توجہ کی تو ہمارے بہت سارے زرعی مسائل خود بخود حل ہوجائینگے۔ کیونکہ سنہ ۱۸۸۰ء کے قحط کمیشن کے الفاظ میں ہندوستان کے افلاس کا سبب محض یہی واقعہ ہے کہ زراعت ہی ہندوستان کا واحد پیشہ ہے۔

اگر ہم نے ریاست حیدرآباد سے اس مرض کو دور کردیا تو ہم اپنے معاشی ذرائع کو قومی ارتقا کیلئے بہتر سے بہتر طور پر استعمال کرنے کے لائق ہوجائینگے۔ فقط

محبوب علی بی اے عثمانیہ

"کسان"

ایک دہقاں شدت سردی کے مارے کانپتا
ہر قدم پر تھرتھراتا، کپکپاتا، ہانپتا

شومئ قسمت سے گھبراتا ہوا با چشم تر
کھیت کی جانب چلا ہے ہل اٹھائے دوش پر

تن پہ ہے بوسیدہ اک میلا کچیلا سا لباس
یاس کا عالم ہے دل پر اور ہے چہرہ اداس

تر پسینے سے جبیں ہے سانس ہے پھولا ہوا
فکر اپنے کھیت کی ہے خود کو ہے بھولا ہوا

پاؤں بے پاپوش پر ہے گرد پلکوں پر غبار
آسمانوں کی طرف اٹھتی ہے چشم سوگوار

آرہا ہے قلب افسردہ میں ہر دم یہ خیال
قہر بن کر ہو نہ نازل ساہوکاروں کا جلال

بھوکے بچوں کی اداسی یاد آتی ہے کبھی
فصل کی اپنی تباہی یاد آتی ہے کبھی

بیکسی غلطاں ہے اس کی چشم حسرتناک میں
یاس کے طوفاں میں اس کے سینۂ صد چاک میں

مختصر یہ مطمئن دم بھر بھی اس کا دل نہیں
حیف اس کو زندگانی کے مزے حاصل نہیں

اے غریب! فاقہ کش اے زندگی کے رازداں — یاس و حسرت کا مرقع ہے کہ تیری داستاں
اک جہاں پلتا ہے تیری محنت جانکاہ پر — ہے تری کاوش کا احسان ہر گدا و شاہ پر
ضوفگن ہے دہر میں تیرا چراغِ زندگی — تیرے دم سے پھولتا پھلتا ہے باغِ زندگی
آہ لیکن اے جفاکش تندخو آزاد مرد — تیرے آنسو تیری لاچاری تیرے چہرے کی گرد
کیوں یہ سب ان بندگانِ زر کو تڑپاتے نہیں — سینۂ دولت میں کیوں یہ آگ بھڑکاتے نہیں
چوستے ہیں خون تیرا سنگدل سرمایہ دار — ان کی آنکھوں میں کھٹکتی ہے ترے گھر کی بہار
حرفِ شکوہ پھر بھی تیرے لب پہ آسکتا نہیں — شانِ خودداری کو تو دل سے بھلا سکتا نہیں
شاید ہو منظور قدرت کو بھی تیرا امتحاں — کام آئیں گی تیری صبر آزما خاموشیاں

اک نہ اک دن قصرِ استبداد ڈھایا جائے گا
تیری محنت کا صلہ تجھ کو دلایا جائے گا

فصیح

طوافِ قمر

(ایک سائنٹفک طبعزاد افسانہ)

میں اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا کہ ملازم ایک تار لایا۔

یہ میرے ایک ایسے دوست کی طرف سے آیا تھا جو سات سال سے لاپتہ تھا۔ وہ کوئی معمولی شخص نہیں بلکہ فرانس کا ایک ہر دل عزیز سائنسداں تھا جس کے کارنامے دنیا کو حیرت میں ڈال رہے تھے یکایک لاپتہ ہوگیا۔ مختلف افواہیں سننے میں آئیں۔ کبھی خبر ملتی کہ وہ روس چلا گیا اور کبھی اطلاع ملتی کہ حکومت فرانس کا ممد ہونے کی وجہ سے انگریز جاسوسوں نے اسے مار ڈالا۔ غرض اس کی ہستی پردۂ راز میں تھی۔ ایک عرصہ کے بعد جب مجھے اس کی جانب سے پیغام وصول ہوا تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ میں فرط مسرت میں اٹھا کہ اپنے دوست ژراک زیران کو جو ایک لکھ پتی تاجر تھا اس مسرت افزا خبر کی اطلاع دوں۔ فون اٹھانا چاہتا ہی تھا کہ اس کی گھنٹی بجی اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ ژاک زیران پہلے ہی سے ٹیلیفون پر کھڑا تھا اور مجھ سے قبل اس نے اپنا سلسلہ سماعی میرے آلہ سماعت سے ملا لیا تھا۔ مجھ سے قبل اسی نے کہنا شروع کیا۔

"لارل! مبارک ہو۔ پروفیسر روسیو زندہ ہیں۔"

"یہی خبر تمہیں سنانے کے لئے میں بھی تو فون پر آیا تھا۔" میں نے حیرت سے کہا۔

"تمھیں کب اطلاع ملی؟" اس نے دریافت کیا۔

"ابھی ابھی میرے پاس اس کا تار آیا ہے۔ اس نے اپنا پتہ تبلاتے ہوئے مجھے آنے کو لکھا ہے"

"بعینہ وہی مضمون میرے پاس کے تار کا بھی ہے۔ اور ساتھ ہی فیرنگستان کے پاس بھی اسی مضمون کا تار آیا ہے۔ اس نے مجھے ابھی ابھی اطلاع کی۔"

"خیر زاک۔ میں نے کہا خدا کا شکر ہے روسیو سے پھر ملاقات ہو رہی ہے۔ اچھا یہ تبلائیے کہ وہاں کب چلیں گے؟"

"ابھی" اس نے کہا "فیرر کو بلوا لیا ہوں" ہم لوگ فیرنگستان کو بے تکلفی سے فیرر پکارا کرتے تھے (جس کے معنی دوست کے ہیں) وہ پیرس کے محکمہ برقی کا ذمہ دار افسر تھا۔ ہم تینوں پروفیسر روسیو کے گہرے دوست تھے۔

تھوڑی دیر انتظار کے بعد زاک اور فیرر ایک چھوٹی سی موٹر میں آ پہنچے۔ میں بھی اسی میں سوار ہو گیا اور ہم لوگ روانہ ہوئے۔ گھنٹہ بھر میں ہم وہاں پہنچ گئے۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد ہمیں پروفیسر کا مکان مل گیا۔ یہ ایک مختصر سا سہ منزلہ مکان تھا جس سے ملحقہ کوئی عمارت نہ تھی۔ مکان کے اطراف کافی زمین کو گھیرے ہوئے ایک چھوٹی سی دیوار کا احاطہ تھا۔ اطراف میں کہیں کوئی اچھی بلند عمارت نہ تھی پروفیسر کی ایسے غیر آباد مقام پر سکونت پذیری حیرت انگیز تھی۔

ہم پھاٹک میں داخل ہوئے۔ موٹر کے ہارن کی آواز پر ہی ایک ضعیف ملازم باہر آیا۔ اور ہمیں دیکھتے ہی لوٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد خود پروفیسر باہر آیا۔ اگر وہ تیز تیز آنکھیں جھپکاتا اور مسکراتا ہماری طرف نہ بڑھتا تو ہم کبھی اسے نہ پہچان سکتے۔ کیونکہ سات سال قبل جبکہ ہم نے اُسے دیکھا تھا وہ ایک خوبرو تو انا آدمی تھا جس کا چہرہ ہمیشہ صاف رہا کرتا تھا مگر اب اس میں بہت بڑا فرق ہو چکا تھا۔ سنہرے بال سفید ہو رہے تھے چہرے پر ڈاڑھی مونچھیں اُگی ہوئی تھیں۔ توانائی مفقود، کمر خمیدہ، ہڈیاں اُبھری ہوئی ہاتھوں پر جھریاں اور داغ دھبے نمودار تھے۔

ہم سب سے یکے بعد دیگرے پروفیسر بغل گیر ہوا۔

"آپ سب لوگ ویسے ہی ہیں جیسے سات سال قبل تھے" پروفیسر نے کہا، کیونکہ میرے بوڑھے ملازم میلری نے آپ کو ایک نظر میں پہچان لیا۔ مگر میں شاید بہت بدل چکا ہوں"

"یقینی پروفیسر" میں نے جواب دیا "ہم تو آپ کو پہچان ہی نہ سکتے اگر آپ خود ہماری طرف پرانی دوستانہ نظریں لئے ہوئے نہ بڑھتے۔ مگر مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کی صحت اطمینان بخش نہ ہوگی۔

"ممکن ہے ایسا ہی ہو"، پروفیسر نے جواب دیا، "اگر میں نے اپنی صحت کو گنوا کر اپنا تجربہ کامیاب ثابت کیا تو یہ میرے لئے باعث فخر و موجب مسرت ہوگا"۔ یہ کہہ کر پروفیسر نے ہمیں اندر چلنے کا اشارہ کیا اور ہم اس کے پیچھے مکان میں داخل ہوئے۔

جس کمرے میں ہم بٹھائے گئے تھے وہ نہ تو پوری طرح کسی سائنسداں کا کمرہ معلوم ہوتا تھا نہ کسی ماہر فلکیات کا۔ متعدد الماریاں رکھی ہوئی تھیں جن میں کہیں بوتلیں اور کہیں ایسے گھڑی نما آلات تھے جن سے ہم بالکل ناواقف تھے۔ کہیں بڑی بڑی مقناطیسی سلاخیں۔ کہیں چھوٹی بڑی متعدد دوربینیں اور ایک طرف دیوار پر ایک بہت بڑا نقشہ آویزاں تھا جس میں تمام معلومہ سیاروں کے خطوط حرکت دکھلائے گئے تھے۔ ان کے علاوہ برقیاتی تجربات سے متعلق بہت سا سامان بھی تھا۔

"ہاں تو پروفیسر" فیر نے کہا، "کہئے کہ آپ اس طویل مدت میں کیا کرتے رہے؟"

"یہی بتلانے کے لئے تو میں نے آپ لوگوں کو تکلیف دی ہے"، پروفیسر نے ہنستے ہوئے جواب دیا، "مجھے ہنسی ان خبروں اور افواہوں پر آتی ہے جو میرے متعلق مشہور ہوئی تھیں"۔ اتنا کہہ کر پروفیسر نے گھنٹی بجائی اور ایک بوڑھا ملازم کمرے میں داخل ہوا۔ اس کو چائے لانے کے لئے کہا گیا اور وہ چلا گیا۔

"میں اخبارات میں اپنی روپوشی کے متعلق مختلف توجیہات پڑھتا رہا ہوں" پروفیسر نے پھر کہنا شروع کیا، "اور ان مضحکہ خیز خبروں پر ہنستا بھی رہا۔ بھلا بتلایئے تو کہ مجھے کیا پڑی کہ میں روس جاتا یا انگریز جاسوسوں کا میں نے کیا بگاڑا تھا جو وہ مجھے مار ڈالتے اصل واقعات یوں ہیں کہ میں نے چند اہم تجربات شروع کئے تھے اور میرے تجربات ابھی ابتدائی منزل پر ہی تھے کہ مجھے حکومت نے جنگ کے لئے حفاظتی اسلحہ بنانے کا حکم دیا۔ میرے ذاتی تجربات ادھورے ہی پڑے رہے۔ جب جنگ سے نجات ملی تو میں پھر اپنے تجربات کی طرف متوجہ ہوا اور روپیہ مجھے اتنا ملا تھا کہ میں اطمینان سے زندگی گذار سکتا مگر میرے تجربوں کے لئے وہ ناکافی تھا۔ حلقہ احباب کی وسعت پھر میرے تجربات میں حائل ہوئی۔ مجبوراً مجھے سوسائٹی کو خیرباد کہہ دینا پڑا۔ میں نے خفیہ طور پر اس غیر آباد مقام پر ایک مکان خریدا اور مشہور یہ کیا کہ میں چند روز کے لئے باہر جا رہا ہوں۔ تمام ملازمین کو رخصت کر کے میں چپکے سے اس مکان میں منتقل ہوگیا۔ صرف میرا پرانا وفادار ملازم ہیلری میرا رازدار تھا جسے آپ ابھی دیکھ چکے ہیں۔ اس کے بعد میں اب تک تجربات میں مشغول رہا ہوں۔ معافی کا خواستگار ہوں کہ اس عرصے میں آپ لوگوں سے بھی علیحدہ رہا۔ کیونکہ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر کسی کو میری جائے قیام کا پتہ معلوم ہوا تو میں کوئی تجربہ نہ کر سکوں گا۔ میں شرمندہ ہوں کہ اپنی ضرورت اور غرض پر آپ لوگوں کو تکلیف دی"۔

"ہاں ہاں" ٹراک نے کہا، "ہم ہر طرح تیار ہیں"۔

بلکہ ہمیں فخر ہوگا اگر ہم کسی طرح آپ کے کام آسکیں" فیروز نے جملہ پورا کیا۔

"مگر آپ کا تجربہ کیا ہے؟" میں نے بے صبری سے دریافت کیا۔

"گو مجھے فلکیات سے زیادہ تعلق نہیں پھر بھی میں ایسی دوربین کی کمی محسوس کر رہا تھا جس کے ذریعہ ہم تاروں اور سیاروں کا اچھی طرح مطالعہ کر سکیں۔ ہمارے پاس جو فلکی دوربینیں ہیں ان سے ہم زیادہ سے زیادہ اتنا دیکھ سکتے ہیں کہ اندازاً یہ کہہ دیں کہ یہ پہاڑ ہوگا اور یہ میدان۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ میں نے کوشش کی اور آخرکار ایک عرصہ کی کاوش کے بعد ایک ایسی دوربین تیار کرلی ہے جو دنیا کی تمام دوربینوں سے مختلف ہے میں ابھی اسے آپ لوگوں کو تبلاؤں گا۔ پہلے ہم چائے تو پی لیں" میلری چائے کی کشتی لئے ہوئے کمرے میں داخل ہو چکا تھا۔ اس نے کشتی پروفیسر کے سامنے ایک اسٹول پر رکھ دی اور پروفیسر نے ہمیں چائے کی ایک ایک پیالی پیش کی۔

"چلئے" پروفیسر نے چائے ختم کرکے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کو اپنی ناقابل انتقال دوربین تبلاؤں" ہم لوگ بھی چائے ختم کر چکے تھے اس لئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور پروفیسر کے پیچھے پیچھے روانہ ہوئے۔ کئی سیڑھیاں چڑھنے کے بعد ہم نے اپنے آپ کو مکان کی چھت پر پایا یہاں ایک دوسرے سے کافی فاصلہ پر دو کمرے بنے ہوئے تھے۔ جن میں سے ایک چوکور دوسرا مستطیلی تھا ہم مستطیلی کمرے کے دروازہ کے سامنے جا کھڑے ہوئے جو مقفل تھا

"بظاہر یہ ایک معمولی کمرہ ہے مگر دیکھئے اس کے اندر کیا پوشیدہ ہے" یہ کہتے ہوئے پروفیسر نے قفل کھولا اور ہم ایک سیاہ پردہ اُٹھاتے ہوئے ایک تاریک کمرے میں داخل ہوئے۔ پروفیسر نے بجلی کا قمقمہ روشن کیا تو ہمیں مختلف چیزیں نظر آئیں۔ ہمارے سامنے ایک بڑا میز تھا۔ جس پر ایک قندیل مناظر (magic lantern) رکھی ہوئی تھی جس سے ملحقہ ایک دھاتی بڑی سی نلی جس کا قطر تقریباً پندرہ سنٹی میٹر ہوگا چھت تک پہنچی ہوئی تھی۔ جیسے کسی گرنی کی چمنی۔ اس کے بازو متعدد فولادی نالیاں بھی تھیں اور کئی تار بھی جن کا تعلق چھت سے ہی تھا۔ میرے دونوں بازو اونچی اونچی تپائیاں تھیں۔ جن پر عجیب قسم کے آلات نصب تھے۔ دونوں پر دو گھڑی نما پیمانے لگے ہوئے تھے۔ قندیل مناظر کے عقب میں ایک تختہ تھا جس پر عجیب و غریب ہندسے اور لکیریں بنی ہوئی تھیں اور دو سوئیاں بھی لگی ہوئی تھیں۔ اس پورے نظام کے مقابل ایک چمکدار اسکرین کھڑا تھا جو پورا کا پورا شیشہ کا معلوم ہوتا تھا۔ اور بھی متعدد آلات تھے جنھیں ہم نہ سمجھ سکے کہ کیا ہیں۔

"یہی میری عجوبہ روزگار دوربین ہے" پروفیسر نے قندیل مناظر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنا شروع کیا: "اس میں

جو خوبیاں ہیں وہ ذرا غور سے سنئے۔ ہمارے پاس جتنی دوربینیں اب تک ایجاد شدہ ہیں ان سے جب تم کسی سیارے کو دیکھتے ہیں تو ہمیں دوربین اس کی سمت میں نصب کر دینی پڑتی ہے تھوڑی دیر میں جب زمین گھوم جاتی ہے تو سیارہ ہماری دوربین کے سامنے سے ہٹ جاتا ہے اور ہم اسے دیکھ نہیں سکتے جب کہ ہم پھر دوربین کو نہ ہٹائیں میری دوربین میں یہ خامی نہیں۔ میں نے چھت کے اوپر اس کا دہانہ رکھا ہے۔ دہانے کے عدسہ کا الحاق ایک پہیے سے ہے جو ایک کمانی کے زیر اثر گھومتا ہے۔ اگر ہم چاہیں تو کمانی کے بدلے برق استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ کمانی عدسہ کو گھما سکتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ سیارہ کے دوربین کے سامنے سے ہٹ جانے کا سبب خود اس کی حرکت نہیں ہوتی بلکہ زمین کی ذاتی حرکت ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ سیارہ ہم سے اتنے فاصلہ پر ہے کہ اگر وہ دس ہزار میل ہٹ جائے تو بھی ہماری دوربین کے دہانے پر ایک درجے سے زیادہ زاویہ نہیں بنتا۔ مگر خود ہماری زمین چوبیس گھنٹوں میں (۳۶۰) درجے گھوم جاتی ہے۔ اس لئے زمین کی حرکت سے ہی ہم سیارہ کو دیر تک نہیں دیکھ سکتے۔ میری دوربین کا دہانہ بارہ گھنٹوں میں (۱۸۰) درجوں کی رفتار سے زاویئی حرکت کرتا ہے۔ اسی طرح وہ زمین کی حرکت کی مخالف سمت میں حرکت کر کے زمین کی گردش کی تعدیل کر دیتا ہے۔ ہم یہاں اندر بیٹھے ہوئے ان کھٹکوں کے ذریعہ دہانہ کے عدسہ کو جس سمت میں چاہیں مرتب کر لیتے ہیں اور اس کے بعد کمانی چلا دیتے ہیں۔ جس سے وہ سیارہ جسے ہم نے مرتب کیا ہے ہماری دوربینی سمت سے ہٹ نہیں سکتا۔

اب اس میں سے گزر کر آنے والی شعاعیں عدسہ کی گردش کے ساتھ ساتھ اپنی سمت بھی بدلتی جاتی ہیں۔ اس لیے دہانے کے عدسہ کے نیچے ایک آئینہ ہے جو عدسہ کی حرکت کے ساتھ ساتھ خود بھی حرکت کرتا ہے اور ایسے زاویہ پر آ جاتا ہے کہ ہر صورت انعکاس کے بعد شعاعیں ایک ہی طرف جائیں اور اس طرح وہ راہ راست پر آ جاتی ہیں دوسرا عیب ہماری دوربینوں میں یہ ہے کہ اس میں جو عدسے استعمال ہوتے ہیں وہ پوری شعاعوں کو گذرنے نہیں دیتے اور نور کی ایک کافی مقدار منعکس کر دیتے ہیں اس طرح ہم سیارہ کا عکس پوری حدت کے ساتھ نہیں دیکھ سکتے۔ اس عیب کو دور کرنے کے لئے میں نے عدسوں کے علاوہ مقعر آئینے بھی استعمال کئے ہیں۔ جو ایسے زاویوں پر لگائے گئے ہیں کہ انعکاس سے ہم بالکل عدسوں کا کام لے سکتے ہیں۔ ان میں نور ضائع نہیں جاتا آئینے خاص طور پر بنوائے گئے ہیں جو نور کو جذب نہیں کرتے اور صحیح زاویوں کو واپس کر دیتے ہیں۔

تیسری خامی جو ہماری دوربینوں میں نظر آئی وہ یہ ہے کہ ایک دوربین سے وقت واحد میں صرف ایک ہی آدمی دیکھ سکتا ہے۔ یا اگر زیادہ نزاکت پیدا کی جائے اور چشمہ کا عدسہ بجائے ایک کے ایک سے زیادہ کر دیا جائے اس طرح کہ ایک سے زیادہ آنکھیں لگائی جا سکیں تو بھی دو تین سے زیادہ آدمی وقت واحد میں نہیں دیکھ سکتے۔ اس خامی کو دور کرنے کے لئے میں نے

جو نئی بات نکالی ہے۔ میں سمجھتا ہوں قابل داد ہے۔ غور سے دیکھئے اور سمجھئے کہ یہ کیسے ہوا ہے۔ اس دوربین میں متعدد آئینوں کے سامنے سے ہوتے ہوئے جب عکس یعنی سیارے کا خیال (Image) اس میز کے پاس پہنچتا ہے تو ہم ایک آئینہ کے ذریعہ اس کو منعکس کرکے اس قندیل مناظر کے اندر لے لیتے ہیں۔ اور اس کے ذریعہ اس خیال کا خیال سامنے کے اسکرین پر ڈالتے ہیں۔ اسکرین میں نے کافی صرفے سے بنوایا ہے یہ پورے کا پورا شیشے کا ہے جسے گراؤنڈ گلاس (Ground Glass) کہہ سکتے ہیں۔ اس کی موٹائی بہت کم ہے اور یہ اتنا نازک ہے کہ ذرا سے زوردار دھکے میں ٹوٹ جائے۔ ناظرین اس اسکرین کے عقب میں کرسیاں ڈالے بیٹھے رہ سکتے ہیں اور بآسانی تمام سیاروں کی تصویر دیکھ سکتے ہیں۔ اس طرح وقت واحد میں ہزاروں آدمی اس کو دیکھ سکتے ہیں۔

چوتھی خامی جو اور دوربینوں میں ہے وہ یہ ہے کہ اس میں عکس ایک محدود وسعت کا حاصل ہوتا ہو یعنی دوربین کی قابلیت جتنی ہوتی ہے اتنا ہی بڑا خیال ملتا ہے۔ اگر ہم اس خیال (Image) کو اور بڑھانا چاہیں تو نہیں بڑھا سکتے۔ لیکن میری دوربین میں یہ عیب نہیں ہے۔ فرض کیجئے کہ ہم اسکرین پر ایک پورے سیارے کو دیکھ رہے ہیں۔ اس سیارے پر ہمیں ایک دھبہ نظر آرہا ہے۔ ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ یہ کیا ہے۔ اس لئے قندیل مناظر کے سامنے جو چند عدسے لگے ہوئے ہیں ان میں ایک اور عدسے کا اضافہ کر دیتے ہیں اور فوکس ٹھیک کر لیتے ہیں۔ اس طرح بجائے اس سیارے کے سیارے پر کا وہ محدود حصہ پورے اسکرین پر آجاتا ہے۔ اگر اس پر بھی کوئی حصہ اہم نظر آئے تو ہم ایک اور عدسہ کا اضافہ کرکے صرف اس حصہ کو پورے اسکرین پر لا سکتے ہیں عدسوں کی زیادتی کے لئے قندیل مناظر کے سامنے انتظام رکھا گیا ہے۔ اس عمل سے عکس دھندلا ہوتا جاتا ہے لیکن جس حد تک کہ وہ ہم کو نظر آسکے ہم اس خیال کو بڑھاتے جاسکتے ہیں اور اس کمرہ تاریک میں تو ہم خیال (Image) کو کافی پھیلا سکتے ہیں۔

تمام خوبیوں کے علاوہ بعض نزاکتیں بھی ہیں مثلاً یہ کہ گراؤنڈ گلاس اسکرین پر جو عکس پڑ رہا ہو اس پر کا کوئی خاص حصہ اگر ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کرے تو ہم صرف اس حصہ کو اسکرین کے عقب سے بذریعہ خوردبین جانچ سکتے ہیں یا یہ کہ تاروں سے آنے والی زرد روشنی کو ہم سفید بنا سکتے ہیں۔ اس طرح کہ عاکس آئینوں میں وہ رنگ بھر دیں جن کے زرد رنگ کے ساتھ مل جانے پر ہمیں سفید نور حاصل ہو ایک اور تدبیر جو اس دوربین کے علاوہ میرے دماغ میں آئی وہ یہ ہے کہ ہم کسی سیارے کی تصویر لیں اور اس کو بڑا (Enlarge) کریں پھر اس کو بڑھائیں اور اسی طرح بڑھاتے جائیں تو ہمیں ایک صاف اور واضح تصویر حاصل ہوسکتی ہے۔ لیکن میرے ذاتی تجربہ میں سوائے سورج کے اور کسی دوسرے تارے کا صاف فوٹو نہیں اتر سکا لیکن کوشش کرنے پر اتر سکتا ہے۔

ایک اور کوشش میں کرنا چاہتا ہوں مگر ابھی نہیں بلکہ پھر کبھی۔ وہ یہ کہ اس عکس کو برقی لہروں میں تبدیل کیا جائے۔ میرا خیال ہے کہ ہم نور سے برقی موجوں کو متاثر کرسکتے ہیں اور پھر برقی موجوں سے حسب مرضی نور حاصل کرسکتے ہیں لیکن یہ بعد کی باتیں ہیں دیکھ لی نا آپ لوگوں نے میری عجیب و غریب دوربین، اب چلئے باہر چلیں۔ پھر میں آپ کو سناؤں کہ میں کیا کرنے والا ہوں"

یہ کہہ کر پروفیسر پلٹا۔ روشنی گل کی اور کمرے کے باہر نکل گیا۔ ہم لوگ بھی باہر آگئے اس نے کمرے کو مقفل کیا اور دوسرے کمرے کی طرف چلا ہم لوگ بھی اس کے پیچھے چلے بالکل ایسے جیسے چڑیا گھر میں بچے اپنی نرس کے پیچھے ایک عجیب جانور کے پنجرے سے دوسرے عجیب جانور کے پنجرے کی طرف جاتے ہیں۔

"اب دوسری چیز دیکھئے" پروفیسر نے پھر کہنا شروع کیا" گو کہ یہ ابھی ناکمل ہے لیکن اس سے بھی زیادہ عجیب ہے"

پروفیسر نے دوسرے کمرے کا دروازہ کھولا اور ہم اندر داخل ہوئے۔ یہاں ایک دھاتی ہوائی رکھی ہوئی تھی جو حجم میں کمرے کے تقریبًا برابر تھی۔ اس میں چاروں طرف دریچے بنے ہوئے تھے جس میں شیشے لگے ہوئے تھے اس کی چھت گنبد نما تھی۔

پروفیسر نے ایک جگہ ایک پیچ گھمایا ہوائی میں ایک دروازہ کھلا ہوا نمودار ہوا۔ ہم چاروں یکے بعد دیگرے اندر گھس گئے۔

"یہ میری ایجاد کردہ ہوائی ہے۔ پروفیسر نے کہنا شروع کیا۔" یہ جب چلائی جاتی ہے تو اس کی قوت کے مقابلہ میں انجن کی قوت ہیچ رہ جاتی ہے۔ اس میں میں نے ایک معمولی نظام سے کام لیا ہے۔ اوپر آپ دیکھئے۔ آپ کو مختلف سلاخیں نظر آرہی ہوں گی۔ یہ کھوکھلے فولادی چھلے ہیں۔ ان کے درمیان جو لانبا شئے دکھائی دے رہی ہے وہ ایک زبردست مقناطیس ہے اور یہ بازو میں ایک آلہ ہے جو ابھی ناکمل ہے۔ اس کے ذریعے میں برقی رو بغیر کسی تار کے حاصل کرسکتا ہوں۔ یہ فرش ایک پتلی فولادی چادر ہے۔ جو اوپر نیچے بہ آسانی حرکت کرسکتی ہے لیکن ثانوی فرش کے نیچے ایک کمانی (Spring) ہے جو اصلی فرش کو روکے رکھتی ہے۔ اصلی فرش کے اطراف چھوٹے چھوٹے سوراخ بنے ہوئے ہیں ان میں سے برقی شرارے اور برقی موجیں بہت تیزی اور قوت کے ساتھ خارج ہوتی ہیں۔ جس طرح سے پانی میں مچھلی اپنے پروں کی حرکت سے آگے بڑھ سکتی ہے اسی طرح یہ ہوائی پوری طرح سے ہوا بند ہے۔ اگر اس کا دروازہ بند کرلیا جائے تو نہ اس میں ہوا داخل ہوسکتی ہے اور نہ خارج۔"

یہ کہتا ہوا پروفیسر ہوائی کے باہر نکل آیا۔ ہم بھی اس کے پیچھے پیچھے نکلے دروازہ بند کرکے پروفیسر سیڑھیوں کی طرف چلا۔

"اس ہوائی میں خاص عمل یہ ہے کہ میں ایک کثیر مقدار برق کی اس آلہ میں حاصل کرتا ہوں۔ اس میں سے کچھ مقدار نچلے سوراخوں کی طرف چلی جاتی ہے جہاں لہریں موجیں اور شرارے پیدا ہوتے ہیں اور ان کے عمل سے ہوائی حرکت

کرتی ہے اور باقی مقدار برق کی اوپر والے کھوکھلے فولادی چھلوں میں جاتی ہے جہاں وہ چکر لگاتی ہے۔ وہاں اس سے ایک مقناطیسی حلقہ پیدا ہوتا ہے جو اس قدر طاقتور ہوتا ہے کہ تقریباً ایک ٹن لوہے کو اپنی طرف کھینچ لے۔ حالانکہ میری پوری ہوائی کا وزن صرف چوتھائی ٹن ہے۔ اس قدر طاقتور برقی مقناطیس حاصل کرنا معمولی کام نہ تھا مجھے اس کے لئے بہت وقت صرف کرنا پڑا بڑی محنت اور مصیبت کے بعد یہ حلقہ تیار ہوا۔ جب برق اس حلقہ میں جاتی ہے تو مقناطیسی حلقہ پیدا ہوتا ہے جو متحرک فرش کو ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی طرف کھینچتا ہے اور وہ کھنچکر تقریباً ثانوی فرش کے قریب پہنچ جاتا ہے اور اس عمل سے ہوائی کی دیواروں پر ایک دھکا پڑتا ہے۔ مگر جونہی کہ اصلی فرش ثانوی فرش کے قریب پہنچتا ہے۔ برقی سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے اور مقناطیست ختم ہو جاتی ہے۔ ثانوی فرش کی کمانی اصلی فرش کو اپنی جگہ پر واپس کر دیتی ہے۔ جونہی کہ وہ اپنی جگہ واپس جاتا ہے برقی دور پھر قائم ہوتا ہے اور وہ پھر کھنچ آتا ہے یہ عمل مسلسل ہوتا ہے اور دھکوں سے ہوائی حرکت میں آتی رہتی ہے۔ اور ذرا سے عرصہ ان دھکوں کی رفتار اتنی بڑھ جاتی ہے کہ ہم دو دھکوں کے درمیانی وقفہ کو صفر گردان سکتے ہیں اس طرح ہوائی کی رفتار بندوق کی گولی کی رفتار سے بھی زیادہ کر دی جا سکتی ہے۔ اگر ہوائی کو کسی سمت موڑنا ہو تو ہم اس سمت کے سوراخوں کی رو بند کر دیتے ہیں جس سے برقی تمرّے اور موجیں کم ہو جاتی ہیں اور ہوائی گھوم جاتی ہے۔ جتنے زاویے پر ہم موڑنا چاہیں اسی انداز سے سوراخ بند کرنے ہوں گے اس طرح ہم زمین کی کشش کے خلاف جس رفتار سے چاہیں جا سکتے ہیں۔“

اس عرصے میں ہم نیچے پہنچ چکے تھے اور پروفیسر کے خاص کمرے میں بیٹھ گئے تھے۔

”لیکن پروفیسر“ میں نے استفسار کیا۔ ”ان تمام چیزوں سے آپ کام کیا لیں گے؟“

”یہ تو آپ خود سمجھ سکتے ہیں“ پروفیسر نے ہنستے ہوئے کہا ”میں کسی وجہ سے زمین سے پرے جانا چاہتا ہوں۔ اس کی وجہ تو میرا ایک نظریہ ہے جسے میں ثابت کرنا چاہتا ہوں۔ میں اس کو نہیں مانتا کہ ہوا صرف زمین سے دو سو میل کے فاصلہ تک ہی ہے میں کہتا ہوں کہ گیس ایک ایسی شے ہے جسے جتنی جگہ ملے آتنا پھیل جاتی ہے اس لئے وہ کسی طرح بھی صرف زمین کے اطراف تک محدود نہیں رہ سکتی بلکہ تمام فضا میں موجود ہے اور ہر کرہ کے پاس موجود ہے۔ فرق صرف کثافت کا ہے۔ یعنی جگہ جگہ کثافتیں یا بہ الفاظ دیگر دباؤ مختلف ہے۔ اس کی مثال میں یوں دے سکتا ہوں کہ جیسے ایک بڑے ٹب میں پانی بھرا ہوا ہے اور اس میں آٹے کے مختلف حجموں کے گولے تاگوں سے لٹکا دیئے گئے ہیں اور اس میں ہزاروں بھوکی چھوٹی چھوٹی مچھلیاں چھوڑ دی گئی ہیں۔ ہم دیکھیں گے کہ بڑے گولوں کے اطراف بہت زیادہ مچھلیاں ہوں گی۔ بہ نسبت چھوٹے گولوں کے۔ اور ان کے درمیان پانی

میں بہت کم ہوں گی جو ادھر ادھر پھر رہی ہوں گی۔ یہی حال گیس کا ہے جسے ہم کرہ ہوائی کہتے ہیں۔ بڑے سیاروں کے پاس زیادہ کثیف ہوا ہوگی بہ نسبت چھوٹے سیاروں کے اور جیسے جیسے ہم کسی سیارے سے پرے ہوتے جائیں گے ویسے ویسے ہوا کی کثافت کم ہوتی جائے گی اور پھر جیسے ہم کسی اور سیارے کے قریب ہوتے جائیں گے کثافت بڑھتی جائے گی۔ علاوہ اس کے جس طرح کروں کی کشش قوت ان کے حجموں پر منحصر ہے اسی طرح کروں پر ہوائی دباؤ ان کی کششی قوتوں پر منحصر ہے۔ اس لحاظ سے اگر ہم بطور مثال چاند اور زمین کو لے لیں تو ہمیں معلوم ہے کہ زمین چاند سے تقریباً پچاس گنی بڑی ہے۔ اس لحاظ سے چاند کی اصلی یعنی اوسط سطح پر ہوا کا دباؤ زمین کی اوسط سطح پر ہوا کے دباؤ کا پچاسواں حصہ ہوگا اور اس طرح ہم اگر چاند سے زمین کی طرف چلیں تو ۲۰ ہزار میل تک دباؤ گھٹتا رہے گا۔ اور ستائیس ہزارویں میل پر کم ترین دباؤ ہوگا۔ اتنا کم کہ ہم اسے محسوس ہی نہ کرسکیں گے۔ پھر وہاں سے زمین تک مسلسل بڑھتا رہے گا کیونکہ بہ لحاظ نسبت کشش فصل ۲۷ ہزار میل پر زمین اور چاند کی کششوں کا خط تعدیل واقع ہے۔ یہی حال تمام سیاروں کے مابینی فضا کا ہے۔ کوئی جگہ گیس سے خالی نہیں ہے ہاں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ممکن ہے ہر جگہ وہی گیس نہ ہوں جو ہمارے پاس ہیں کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ زمین سے کسی قدر اوپر اٹھتے ہی نیٹروجن اور آکسیجن کی جگہ ہیلیم اور ہیڈروجن ملتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ چاند اور سورج کی کشش سے سمندر کا پانی اوپر اٹھنے لگتا ہے پھر کیا معنی کہ گیس کسی ایک کرہ تک محدود رہ سکے۔ اس کا ثبوت میں یوں دوں گا کہ جب چاند کی طرف چلوں تو زمین سے چند خالی بوتلیں لے جاؤں۔ ایسی کہ جن میں سے ہوا کامل طور پر نکال لی گئی ہو۔ ان بوتلوں کو میں چاند پر کھولوں گا اور پھر بند کروں گا۔ پھر زمین پر واپس آنے کے بعد اس بوتل کا منہ پانی میں ڈبو کر کھولنے پر پانی اندر چڑھ جائے گا۔ اگر بوتل میں تھوڑی سی بھی گیس موجود ہو تو پانی میں ایک چھوٹا سا بلبلہ باقی رہ جائیگا اس بات کا بھی امکان ہے کہ وہ پانی میں حل پذیر ہو اس لئے ایسی کئی بوتلیں لی جائیں گی اور مختلف مائعات میں کھولی جائیں گی جن میں سے ایک پارہ میں بھی۔ اس طرح ہم اپنے شک کی جانچ کرسکتے ہیں۔

اس نظریہ کے علاوہ میرے اور بھی نظریے ہیں جن کی تصدیق میں اسی مہم میں کرنا چاہتا ہوں۔ جن میں سے اکثر ایسے ہیں کہ پروفیسر نے نظریں نیچی کیں۔ مسکرایا اور پھر کہا۔ ان کو سناتے ہی دنیا مجھے پاگل قرار دے۔ اس لئے میں ان کا تذکرہ نہیں کرسکتا۔ مثال کے طور پر میں ایک بات یہ کہہ سکتا ہوں کہ میرے خیال میں زندگی ہر سیارے پر موجود ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر جگہ انسان ہی موجود ہو۔ ہاں البتہ یہ کہ کبھی نہ کبھی انسانی شکل سے شباہت رکھنے والے جاندار بھی پیدا ہو جائیں گے۔ میرا ایک پاگل پن کا خیال یہ بھی ہے کہ ہم اگر کوئی ایسا سیارہ معلوم کرلیں جہاں فضا کی تپش اور ہوا کا دباؤ تقریباً زمین پر کے حالات کے مساوی ہو اور

سب سے بڑی چیز یہ کہ وہاں آکسیجن بھی موجود ہوا اور اس پر بھی وہاں انسان نہ ہو تو ہم اگر ایک جوڑا انسان کا وہاں چھوڑ آئیں تو وہ وہاں نسل انسانی پھیلا سکتے ہیں۔ اور مزید یہ کہ اگر میری ہوائی کامیاب ثابت ہو تو ہم اس جوڑے کو زمین سے سب ضروری سامان آہستہ آہستہ پہونچا دے سکتے ہیں بلکہ مزید انسان بھی۔ اور ایسے ہی چند مضحکہ خیز خیالات ہیں جن کی قیمت صرف میرے دل و دماغ کو معلوم ہے اور ان کی تصدیق کے لئے میں سب سے پہلے چاند تک ہی جانا چاہتا ہوں۔ وہاں سے واپس آنے پر پھر دوسرے عزائم کروں گا۔ میرے اندازے کے بموجب میری ہوائی دس منٹ کے اندر اتنی رفتار اختیار کر سکتی ہے کہ پوری زمین کا چکر دو تین گھنٹوں میں لگا لے۔

اب میرے تجربات تقریباً مکمل ہو گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ ایک مہینہ کے اندر میں چاند کی طرف روانہ ہو جاؤں مجھے صرف اپنی ہوائی میں بلا تار تحصیل برق کا انتظام مکمل کرنا ہے اور ٹیلیفون لگانا تاکہ میں کہیں بھی رہوں آپ لوگوں سے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھ سکوں۔ گو کہ مجھے جنگ کے بعد کافی روپیہ بطور معاوضہ ملا تھا مگر وہ سب کا سب ختم ہو چکا ہے اور میں اپنی دور بین کی ضمانت پر کچھ روپیہ قرض لینا چاہتا ہوں مجھے امید ہے کہ میرے دوست موسیو زراک مجھے ضرور اس معاملہ میں مدد دیں گے۔"

"ضرور ضرور" زراک نے کہا "آپ یہ کیا فرما رہے ہیں۔ جس وقت آپ کو جس قدر روپیہ کی ضرورت ہو میرے پاس سے منگوا لیجئے۔"

"بہت شکریہ" پروفیسر نے کہا "اب میں موسیو فیبر سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کتنی طاقت والی برق دے سکیں گے۔"

"جتنی آپ کو ضرورت ہو" فیبر نے جواب دیا

"مثلاً پچاس ہزار وولٹ" پروفیسر نے بہ طریق استفسار کہا۔

"اگر ضرورت ہو تو اس سے زیادہ" فیبر نے شان کے ساتھ کہا

"بس کافی ہے" پروفیسر نے کہا "اس سے زیادہ کی تو مجھے کسی حال ضرورت نہ پڑیگی۔ اچھا یہ تو بتلائیے کہ بجلی گھر یہاں سے کتنی دور ہے"

"صدر بجلی گھر تو تقریباً تیس میل دور ہے لیکن شہری بجلی گھر شاید دو ڈھائی میل کے فاصلہ پر ہوگا" فیبر نے جواب دیا۔

"اچھا" پروفیسر روبیو نے سر ہلاتے ہوئے کہا "وہاں سے یہاں تک ایک زائد تار کتنے عرصہ میں لایا جا سکتا ہے؟"

"دس بارہ روز میں" فیبر نے جواب دیا۔

"کیا آج ہی کام شروع کر دیا جا سکتا ہے؟" پروفیسر نے دریافت کیا۔

"آج تو نہ ہو سکے گا۔ لیکن ایک ہفتہ کے اندر ضرور" فیبر نے جواب دیا۔

"کچھ نہیں صرف دو تین ہزار" فیرر نے جواب دیا۔

"دو۔ تین۔ ہزار" میں نے حیرت سے دریافت کیا۔

"ہاں لارل!" ثراک نے کہا "کوئی بات نہیں ہے میں ابھی چک لکھے دیتا ہوں"

"مجھے یقین ہے" پروفیسر نے کہنا شروع کیا "میں ایک مہینہ کے اندر اس خطرناک سفر کے لئے تیار ہو جاؤں گا۔ آکسیجن کی تیاری کے لئے پاٹیشیم کلوریٹ اور مینگنیز ڈائی اکسائیڈ کافی مقدار میں ساتھ رکھ لوں گا۔ غذا کے لئے شکنجہ میں دبائی ہوئی ڈبل روٹیاں رکھ لوں گا اور پانی بھی۔ اور کسی چیز کی مجھے ضرورت نہیں اگر ضرورت پڑے گی تو دیکھا جائے گا"

اسی طرح بہت دیر تک گفتگو ہوتی رہی اور مختلف ضروری باتوں پر بحث کی گئی۔ اور آخر ہم بیحد خوش اور بیحد حیرت زدہ واپس ہوئے۔ پروفیسر نے ہم سے وعدہ لیا تھا کہ ہم اس کی موجودگی کو مشتہر نہ کریں گے کیونکہ ایسا کرنے سے اس کے چاہنے والے پھر اس کے گھر پر ہلہ بول دیتے اور اس کا تجربہ تکمیل نہ پا سکتا۔

روز ہم پروفیسر کے پاس جاتے اور اس کا طریقہ کار دیکھتے۔ بعض وقت اس کی دوربین سے سیارے دیکھا کرتے واقعی اس کی دوربین سے ہمیں عجیب عجیب باتیں دکھائی دیتی تھیں۔ پروفیسر اپنی ہوائی کو مکمل کرنے میں مشغول تھا۔ چند روز میں پروفیسر کے مکان تک ایک موٹا تار ڈال دیا گیا جو بہت بڑی برقی رو کو برداشت کر سکے۔ اور تین چار ہفتہ میں پروفیسر بالکل تیار ہو گیا اور آخر کار وہ دن آ گیا کہ پروفیسر نے اپنے بالائی کمرے کا چھت علیحدہ کیا جس میں ہوائی بند تھی۔ پروفیسر نے بتلایا کہ ہوائی کے اوپر ایک فولادی نوکدار سلاخ کا اضافہ کیا گیا۔ اس مقصد کے لئے کہ ہوائی کو واپس اسی مکان کی چھت پر لایا جا سکے۔

دوسرے دن جب ہم اس کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ ہوائی میدان میں لائی جا چکی ہے۔

"آپ لوگوں کو یہ سن کر تعجب ہوگا" پروفیسر نے کہا "کہ میں نے کل اس ہوائی کو آزمایا اور ہر طرح اطمینان بخش پایا۔ آج میں اس پر اتنا بھروسہ کر سکتا ہوں کہ کسی بعید سے بعید ستارے کی طرف بھی پرواز کر جاؤں"

اس کے بعد پروفیسر ہمیں اپنے دوربین والے کمرے میں لے گیا جہاں چند مزید آلات موجود تھے ایک آلہ کے سامنے اس نے مجھے بٹھایا اور کہا۔

"یہ ٹیلیفون ہے۔ اس کے ذریعہ ہم آپس میں گفتگو کریں گے۔ اسے سنبھالو۔ اس کے بعد اس نے مجھے ٹیلیفون سے واقف کروایا۔ پھر فیرر اور ثراک کو برقی آلہ سے۔ اب پروفیسر ہر طرح تیار تھا۔ صرف چاند کے نکلنے کا انتظار تھا۔ بالآخر رات ہوئی اور چاند نکلا۔

پروفیسر ہوائی کی طرف چلا۔ ہوائی کے پاس پہنچ کر پروفیسر ہم سے بغلگیر ہوا اور مزید ہدایات دے کر سوار ہوگیا۔ فیرر نے اوپر جاکر برقی رو جاری کردی۔ اور واپس آیا۔ ہاتھ ہلا کر پروفیسر نے دروازہ بند کرلیا اور ایک زبردست آواز کے ساتھ ہوائی اوپر کو اٹھی اور نظروں سے غائب ہوگئی۔ ہم کمرے میں واپس آئے اور اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ فیرر نے دوربین کو چاند کے لئے فوکس کیا۔ اسکرین کے وسط میں ایک نقطہ پروفیسر روبیو کی ہوائی کا مقام بتلا رہا تھا۔ ہم نے ٹیلیفون کو ٹھیک کیا اور گفتگو شروع کی۔

فون پر پروفیسر اپنے سفر کے حالات سناتا جارہا تھا۔ اس کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ "میں اس وقت سورج کو اچھی طرح دیکھ سکتا ہوں۔ میری ہوائی سورج کی روشنی سے روشن ہے"، پروفیسر کہہ رہا تھا، "مجھے امید ہے کہ میں سولہ گھنٹوں میں چاند تک پہنچ جاؤں گا۔ رفتار بہت اطمینان بخش ہے"۔ اسی طرح ہم گفتگو کرتے رہے۔ آخر کار پروفیسر نے کہا۔

"آپ لوگ تھوڑا آرام لے لیجئے میں تو اس وقت فضائی نظارہ میں مشغول ہوں۔ مجھے زمین بالکل سیاہ دھبہ دکھائی دے رہی ہے اور چاند دھندلا سفید۔"

ہم لوگوں نے باری باری سونے کی ٹھانی کیونکہ برقی آلہ کے پاس ایک آدمی کا موجود رہنا ضروری تھا۔ مبادا کہیں کوئی خرابی نہ پیدا ہوجائے ....

صبح ہوگئی۔ اور ہم نے جلدی جلدی ناشتہ سے فراغت حاصل کرلی۔ ہماری گفتگو کا پھر سلسلہ شروع ہوا۔ پروفیسر سنا رہا تھا کہ اب چاند اتنا اور زمین اتنی دکھائی دے رہے ہیں فضا کی یہ حالت ہے وغیرہ وغیرہ۔

کئی گھنٹوں بعد پروفیسر نے کہا۔

"اب میں زمین اور چاند کی کششوں کے خط تعدیل پر آنے والا ہوں بہتر یہ ہے کہ برقی رو بڑھادی جائے تاکہ میں خط تعدیل میں سے بہ آسانی گذر سکوں۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ کششی نظام کی تبدیلی کہیں میری رفتار و سمت میں کوئی تبدیلی نہ پیدا کردے۔ دیکھو میں خط تعدیل کے پاس پہنچ گیا ہوں"۔

فیرر نے اک دم پیچ گھما دیا اور نمائندے کا کانٹا پچاس ہزار پر پہنچ گیا۔ ایک ہلکی سی آواز ہوئی اور ساتھ ہی کانٹا صفر پر واپس ہوگیا۔ برقی رو ختم ہوگئی۔

ہم سب بے تحاشا چلانے لگے۔ کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا ہوا اور کیا جائے۔

"میرے خیال میں شہر کے بجلی گھر کا فیوز جل گیا"، فیرر نے پشیمانی اور ہراسانی سے کہا، "اتنی بڑی رو وہ برداشت نہ کرسکا"۔

"پھر کیا کیا جائے فیرر؟" میں نے دریافت کیا

"میں ابھی جاکر اسے درست کرتا ہوں،" یہ کہہ کر فوراً فیرر روانہ ہوا۔

چار گھنٹے ہم نے بڑے کرب و بے چینی سے گذارے تب کہیں برقی رو پھر آئی۔

فون کئی دفعہ پکارنے کے بعد پروفیسر کی آواز سنائی دی۔ وہ غصہ میں بھرا ہوا معلوم ہوتا تھا اس نے ہمیں بتلایا کہ جونہی وہ خط تعدیل پر پہنچا برقی رو بند ہوگئی اور ہوائی نے بجائے چاند کی سمت جانے کے چاند کے اطراف گھومنا شروع کردیا اور وہ نہایت سرعت کے ساتھ گھوم رہی ہے۔

ہم نے اس اتفاقی حادثہ کی وجوہ تبلائیں۔

"اب ہمیں کیا کرنا چاہیے پروفیسر؟" ہم نے دریافت کیا۔

"رو تو اب آرہی ہے" پروفیسر نے جواب دیا "مگر میری ہوائی اس سرعت کے ساتھ طواف تم کررہی ہے کہ پوری قوت صرف کرنے سے بھی اس کی سمت میں کوئی تغیر نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ میں جب تبدیلی سمت کے لئے سوراخوں میں سے برقی تیر ارسے چھوڑتا ہوں تو اس کے ساتھ ہی ہوائی کی رفتار میں بہت اضافہ ہوجاتا ہے اور ہوائی کانپ کر رہ جاتی ہے۔ ایک آخری کوشش یہ کی جاسکتی ہے کہ فیرر برقی رو کو جتنا بڑھا سکتا ہے بڑھا دے۔ میں پورا زور لگا کر دیکھتا ہوں اگر میری ہوائی خط تعدیل سے ذرا بھی ہٹ جائے تو آزاد ہوسکتی ہے۔

"لارل" فیرر نے مجھ سے کہا "میرے خیال میں میں ابھی جا کر ان بائلرز (Boilers) کو چلادوں جو محفوظ رکھے ہوئے ہیں تو رو میں کافی اضافہ ہوجائے گا"

"فوراً جاؤ" میں نے کہا اور وہ چلا گیا۔

آناً فاناً میں یہ خبر پیرس میں پھیل گئی کہ پروفیسر روسیو جسے فرانس نے مردہ تصور کرلیا تھا زندہ تھا اور اس نے اپنے تجربہ کے سلسلے میں چاند کی طرف پرواز کی جہاں اتفاقی حادثہ سے وہ بجائے چاند پر پہنچنے کے طواف تم کر رہا ہے۔ شام سے پہلے فیرر واپس آیا لیکن یہاں لاکھوں آدمیوں کا مجمع ہوگیا تھا۔ بہت سے ذمہ دار اشخاص، عہدہ دار آموجود ہوئے تھے اور ایک دو سائنس داں بھی۔

فیرر نے پانچ بائلرز (Boilers) مزید چلادیئے تھے۔ اور اب وہ نوّے ہزار وولٹ کے قریب قریب قوت والی

برقی رو حاصل کر سکتا تھا۔

ہم لوگ فوراً برقی آلہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ فیرر نے دستہ گھمانا شروع کیا۔ کانٹا بڑھتا گیا۔ بڑھتا گیا لیکن پروفیسر کی ہوائی نہ چلتی وہ مزید رو مانگ رہا تھا جس وقت کانٹا اسی ہزار پر سے گذر رہا تھا۔ پورے مکان کے برقی قمقمے روشن ہو گئے۔ لیکن پروفیسر کے لئے رو ابھی ناکافی تھی۔

"اور تھوڑی سی، اور تھوڑی سی۔ بس اب نکلی جاتی ہے" ٹیلیفون میں آواز مرتعش تھی فیرر نے اکدم پیچ اپنی پوری قوت کے ساتھ گھما دیا اور کانٹا ایک لاکھ پر پہنچ گیا..........

ایک دھماکے کی آواز ہوئی۔ اور برقی آلہ پورا اچھل پڑا قبل اس کے کہ ہم کچھ کر سکتے ہر چیز جلنے لگی۔ فیرر کا منہ جھلس گیا تھا ہم لوگ اپنی جانیں بچانے کو نیچے دوڑے لیکن ہمارے نیچے پہنچنے سے پہلے ایک زبردست دھماکہ ہوا جیسے کئی توپیں ایک ساتھ چھوڑی گئیں

ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ میں دواخانے میں ایک پلنگ پر پڑا ہوں زخموں سے چور چور ہوں۔ کئی گھنٹوں بعد جب مجھ میں کسی قدر قوت آئی تو میں نے حال دریافت کیا۔ معلوم ہوا میں تین روز سے بیہوش پڑا ہوں۔ دھماکے سے مکان کے پرخچے اُڑ گئے اور آگ لگ گئی تماشائیوں نے فوراً ہمیں نکالا۔ آتش فرو انجن آ گئے لیکن آگ نہ بجھی۔ فیرر بیچارہ وہیں مر گیا۔ ٹراک بھی جاں کنی کے عالم میں دواخانے میں پڑا تھا۔

کئی روز بعد میں صحتیاب ہوا۔ بیچارہ ٹراک بھی رخصت ہو چکا تھا پروفیسر دیسو کی ہوائی کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ابھی طواف قمر میں مشغول ہے۔ دوسرے سائنسدان مجھ سے پروفیسر کے ایجاد کردہ آلات کے بارے میں دریافت کرتے ہیں مجھے جتنا معلوم ہے بتلا دیتا ہوں لیکن لاحاصل۔ فقط۔

نوٹ:۔ ان اشارات پر کوئی قدم اٹھائے تو کس قدر مناسب ہے۔

ظہیر الدین رونق متعلم بی۔ ایس سی

ایک یادگار رات

کل رات عجب دھوم مچاتی ہوئی آئی — تدبیر کو تقدیر بناتی ہوئی آئی
جاگی مرے غم خانے کی سوئی ہوئی قسمت — ظلمات میں روشن ہوئی اک شمع محبت
کونین کی ہر شے میں تبسم کی جھلک تھی — ہر ذرۂ خاکی پہ قیامت کی دمک تھی
اک ماہ شب چار دہم تھا مرے گھر میں — اک حسنِ مجسم کی تجلی تھی نظر میں
پتلی سی کمر، بوٹا سا قد، پھول سے رخسار — آنکھوں میں حیا، ہونٹ تبسم سے گرانبار
مشتاق نگاہوں سے وہ گھبرائے ہوئے تھے — نیچی تھی نظر، ناز سے شرمائے ہوئے تھے
موجِ نگہِ ناز میں رقصاں تھے شرارے — اک حشر تھا، یا کاکل برہم کے اشارے

رنگ لب رخسار میں رقصاں تھی جوانی ۔ لب بند تھے کہتے رہے آنکھوں کی زبانی
تھا چہرۂ گلرنگ پہ جذبات کا طوفاں ۔ ہر ایک نظر اُٹھتی تھی مینخانہ بداماں
ہر سانس تھی اک لرزش صہبائے محبت ۔ مینخانۂ خیام کی نظروں میں حکایت
مستی میں کبھی ساغر زر چوم رہے تھے ۔ گاتے ہوئے حافظ کی غزل جھوم رہے تھے
ہونٹوں پہ تبسم کی جو اک لہر سی آئی ۔ شرمانے لگے برق تکلف سے گرائی
مڑ کر کبھی میری طرف انداز سے دیکھا ۔ مضطر ہوا دل پہلو میں اس ناز سے دیکھا
پلکوں پہ کبھی پھیر کے انگشت حنائی ۔ لی سانس جمائی کی طرح نیند جو آئی
شرمائے ہوئے ہنستے ہوئے سر کو جھکائے ۔ کچھ ناز سے انگڑائی لی ہاتھوں کو اُٹھائے
شانوں پہ گرا سر سے ڈھلکتا ہوا آنچل ۔ احساس میں طوفان تھا جذبات میں ہلچل
وہ کیف نظر، ذوق طرب لطف مدارات ۔ اک خواب تھا آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹی رات

اُمید کا اے کاش سہارا نظر آئے
ایسی کوئی اک رات دوبارا نظر آئے

رشید

سماج کی بے

گرمی کی چھٹیاں ختم ہوئیں۔ کالج کھلا، ہر طرف چہل پہل اور دھوم تھی۔ ہر ایک خوش و خرم دکھائی دے رہا تھا۔ ایک دوسرے کو کامیابی کی مبارکبادیں دی جا رہی تھیں۔ ناکامیوں پر افسوس اور نتائج کا تجزیہ کیا جا رہا تھا۔ ایک طرف وظیفوں کا تذکرہ اور دوسری طرف مستقبل کے متعلق مشورے ہو رہے تھے۔

گیارہ بجے لڑکیاں اور لڑکے لکچر ہال میں جمع ہوئے۔ پندرہ منٹ بعد وائس چانسلر، پرنسپل صاحب کے ساتھ لکچر ہال میں داخل ہوئے۔ ہر طرف سناٹا ہو گیا حاضرین تعظیماً کھڑے ہو گئے۔ اہل غرض اور خوشامدیوں نے اپنے کالر اور ٹوپیاں درست کیں اور انتظار کرنے لگے کہ وہ دیکھیں اور یہ سرنیاز خم کریں۔

ظہیر اور نجمہ ایک کونہ میں بیٹھے سارا تماشا دیکھ رہے تھے۔ ان کی اس گستاخی کو ہر ایک نے دیکھا اور محسوس کیا۔ انگلیاں اٹھیں، چہ میگوئیاں ہوئیں اور اگر فوراً تقریر شروع نہ ہو جاتی تو ایک آدھ آوازہ بھی کس دیا جاتا۔ وائس چانسلر نے میقات کی افتتاحی تقریر شروع کرتے ہوئے کہا ”میں آج تم لوگوں سے ....

ظہیر نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا ”اگر جناب ہم کو ”آپ“ سے مخاطب کریں تو مناسب ہے“ اس جملہ معترضہ پر بہتوں کے پسینے چھوٹ گئے، مقرر نے اعتراض کی کوئی پروا نہ کی البتہ ظہیر اور نجمہ کو نگاہ بھر کے دیکھ لیا۔

"ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ آج کا دن تم میں سے بیشتر کے لئے نئی زندگی کا باب وا کر رہا ہے جو ابھی ہائی اسکول پاس کر کے آئے ہیں ان کو کالج کا پہلا زینہ ملا ہے اور جو تعلیم ختم کر چکے ہیں وہ عملی دنیا میں پہلا قدم رکھ رہے ہیں چونکہ خوش قسمتی سے دونوں اس وقت یہاں موجود ہیں اس لئے میں صرف ایک ہی نصیحت کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم بام ترقی پر چڑھنا چاہتے ہو زندگی کے منازل سہولت کے ساتھ طے کرنا چاہتے ہو اور اگر چاہتے کہ تمہارا مستقبل ماضی سے زیادہ شاندار رہے تو ضبط و تنظیم سے کام لو۔ یہی ایک خصوصیت قوم اور ملک کی ترقی کی بڑی حد تک ضامن ہو سکتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ صدق دل سے عمل کیا جائے اس کے بعد انھوں نے تنظیم کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور بتلایا کہ تنظیم نے ایام سابقہ میں کس طرح گتھیوں کو سلجھایا اور کس طرح حالیہ گتھیوں کو خواہ وہ معاشی ہوں یا معاشرتی سیاسی ہو یا تعلیمی سلجھایا جا سکتا ہے۔

تقریر کے بعد ہال خالی ہو گیا۔ سب اپنے اپنے کاموں میں جٹ گئے مگر ظہیر اور نجمہ نے چمن کا رخ کیا۔ وہاں پہنچکر تقریر پر تبصرہ شروع کیا۔

ظہیر۔ "نجمہ تم سمجھتی ہو کہ اس تقریر میں کچھ صداقت تھی اور انھوں نے جو کچھ کہا دل سے کہا"؟

نجمہ۔ "خیال تو میرا یہی ہے۔ ان کے دل میں کوئی اور بات ہو تو اس کی خبر اللہ ہی کو ہوگی"

ظہیر۔ "بھولی لڑکی یہ آج کل جو تنظیم کا پروپگنڈا ہو رہا ہے اس کا مطلب سمجھتی ہو؟ میں سمجھتا ہوں کہ جس تنظیم کی ہم کو ضرورت ہے وہ اس قسم کی تنظیم سے بہت مختلف ہے۔ سب سے پہلے ہم کو تنظیم معاشرت اور تنظیم سوسائٹی کی ضرورت ہے۔

نجمہ۔ ہوگی۔ "میں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا"۔ ظہیر کے چہرہ کا رنگ تبدیل ہونے لگا مگر نجمہ نے اس کو قطعاً محسوس نہیں کیا۔

ظہیر۔ جہاں دل و دماغ کی تنظیم کا فقدان ہو وہاں اس وظیفہ سے کچھ کام نہیں چل سکتا"

نجمہ۔ "ظہیر نکالو ان فضول تذکروں کو ہمیں ان سے کیا۔ کچھ اور باتیں کرو"

ظہیر۔ پیاری نجمہ دل میں ایک آگ سی لگی ہوئی ہے۔ اگر تمہارا ساتھ اور مستقبل پیش نہ ہوتا تو اس ناپاک نظام اور سماج کے بندھنوں کو توڑ دیتا پھر اپنے ناپاک وجود کو جسے میں خود پاک سمجھتا ہوں ہمیشہ کے لئے اس سے علیحدہ کر لیتا۔ جس سماج میں غریبوں کا کوئی والی نہیں، جس دنیا میں ناچاروں کا کوئی پرسان حال نہیں جس نظام میں مفلسوں کا کوئی نگران نہیں اور جس مذہب میں بیکسوں کا کوئی نگہبان نہیں اس سے ....

نجمہ نے بات کاٹ کر کہا۔ "اپنی طبیعت خراب نہ کرو۔ نہ تم مصلح معاشرت ہو نہ تمہاری اصلاح سے دنیا سدھر سکتی ہے

ظہیر۔ مجھے اس کی پروا نہیں کہ دنیا کی اصلاح ہوتی ہے یا نہیں“

نجمہ۔ تو پھر کیوں اپنی جان کھپاتے ہو۔ تم کو میری جان کی قسم خدا کے لئے اس سماج اور اصلاح کا خیال دل سے نکالو“

ظہیر نے ایک خاص انداز میں نجمہ سے پوچھا کہ کیا اس قسم کی گفتگو اس کو ناگوار گذر رہی ہے۔ اس پر نجمہ نے انکار کیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ظہیر کو ان پریشان کن خیالات میں گھرا ہوا دیکھے۔ مگر اس کے متلاطم جذبات کو انسانی طاقت روکنے سے قاصر تھی۔ اس نے کہا،

”سنو اب میں اس پریم کی بستی میں نہیں رہ سکتا جس کا میں خواب دیکھ رہا تھا۔ میں نے محبت کی جو عمارت کھڑی کی تھی اس کی بنیادیں ہلائی جا رہی ہیں۔ میں نے جو یہ سوچا تھا کہ اس دنیا کو ٹھوکر مار کر کہیں دور نکل جاؤں اس کا خاتمہ ہو گیا اس لئے کہ اسی دنیا نے مجھ کو اب قید کر کے ٹھوکریں مارنے کا انتظام کیا ہے اور اب شاید مجھے ٹھوکریں کھانی ہی پڑیں گی۔“

نجمہ۔ ”آخر تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟“

ظہیر۔ ”میرا مطلب یہ ہے کہ آج ہی پروفیسر چکرورتی نے مجھ سے کہا کہ تمہارے والد کو یہ معلوم ہوا ہے مجھے تم سے محبت ہے وہ نہیں چاہتے کہ تم مجھ سے ملو۔ انھوں نے کہلا بھیجا ہے کہ ایک اعلیٰ طبقہ کی لڑکی ادنیٰ طبقہ کے لڑکے سے دوستی نہیں کر سکتی“۔

نجمہ۔ بالکل جھوٹ ہے۔ ابا کو نہ تو ہماری دوستی کا علم ہے اور نہ وہ کبھی اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ گفتگو کر سکتے ہیں“۔ اس پر ظہیر نے ثبوت میں کہا کہ ”پرنسپل کو راز میں لکھ دیا گیا ہے کہ اگر میں ترک دوستی کا حتمی وعدہ نہ کروں تو مجھے کالج سے نکال دیا جائے“

نجمہ ظہیر کا قصور معلوم کرنا چاہتی تھی۔

”قصور یہی کہ میں ادنیٰ طبقہ کا ہوں۔ دولت مند نہیں، معزز نہیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ صاحب اقتدار نہیں۔ آپ کے وائس چانسلر صاحب کہتے ہیں کہ ”ہر زمانہ میں اور ہر ملک میں طبقات کا فرق رہا ہے۔ خدا نے پنج انگشت یکساں نہ کرد۔ اگر یہی امتیاز پیدا کرنے کے لئے انگلیوں کو چھوٹی بڑی بنایا گیا ہے تو میں ان انگلیوں کو کاٹ کر برابر کر دوں گا“

نجمہ۔ ”تم جذبات سے مغلوب ہو کر کیا کہہ رہے ہو؟“

ظہیر۔ ”اس وقت تو صرف کہہ رہا ہوں۔ آئندہ کچھ کرنے کا ارادہ ہے“

ظہیر کا کالج تو چھوٹ ہی گیا تھا نجمہ نے بھی تعلیم کو خیرباد کہہ دیا۔ ظہیر پر خفیہ نگرانی اور نجمہ پر گھر کی پابندی تھی ——— آپس میں خط و کتابت ہوتی تھی نوکر اس کے ایجنٹ چڑھے۔ ٹیلیفون پر بات چیت ہوتی تھی محکمہ ٹیلیفون کو ہدایتیں مل گئیں مضامین

اور افسانوں کے ذریعہ راز و نیاز ہوتا تھا جرائد و رسائل کو متنبہ کر دیا گیا، دوست احباب اور عزیز و اقارب کے ذریعہ حال دل بیان ہوتا تھا ان کی آمد و رفت بند کر دی گئی۔ وہی ظہیر اور نجمہ جو چمن، باغ، ہوٹل، کتاب گھر اور خالی جماعت میں بیٹھے گھنٹوں راز و نیاز کی باتیں کرتے تھے آج کئی سال سے ایک دوسرے کے دیدار کے لئے تڑپ رہے ہیں۔ نجمہ پر پہلے سے زیادہ سختی اس وجہ سے بھی ہونے لگی کہ مخالف اخباروں اور جرائد نے اس واقعہ سے فائدہ اٹھا کر اس کے والد کا مذاق اڑانا شروع کیا۔ کارٹون بنائے گئے، طنزیہ نظمیں اور مضامین لکھے گئے اور ایسے افسانے شائع کئے گئے جن کو پڑھتے ہی سارا دھیان نجمہ اور اس کی رُوداد کی طرف جاتا تھا۔ وزیر اعظم کے لئے یہ کبھی قابل برداشت نہیں ہو سکتا تھا کہ اس کے مرتبہ اور عہدہ کو ٹبہ لگے امرا، اور دولت مندوں میں ناک کٹے اور رئیسوں میں تالی پٹے۔ اگر نجمہ کے والد محبت پدری سے مجبور نہ ہو جاتے تو اس کلنک کے ٹیکہ کو دور کرنے کے لئے نجمہ کو بہت عرصہ پہلے ٹھکانے لگا دیتے۔

ظہیر اپنی زندگی سے تنگ آگیا تھا مگر مرنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ وہ نجمہ کی زندگی تھا اور ساتھ ہی سماج سے بدلہ لینا چاہتا تھا ایک روز وہ اپنے قدیم اور دلی دوست رشید کے پاس پہنچا اور کہنے لگا۔ "میں آج تم کو ایک خوش خبری سنانے آیا ہوں میں نے ایک ایسا آلہ تیار کیا ہے جس سے ریڈیو سیٹ کا کام بھی لیا جا سکتا ہے اور اس کو آلہ ترسیل پیام کے طور پر بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ صرف کھٹکوں کا فرق ہے۔ پہلا کھٹکا گھماؤ تو تم دوسروں کے پیام سن سکتے ہو اور دوسرا گھماؤ تو اپنا پیام بھیج سکتے ہو۔ رشید نے جب اس کا فائدہ دریافت کیا تو اُس نے بتایا کہ اگر نجمہ بھی اسی قسم کا آلہ بنالے تو دونوں میں بات چیت ہو سکتی ہے۔ اس اسکیم پر بڑی دیر تک بحث و تمحیص ہوئی۔ مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے اس مسئلہ کی چھان بین کی گئی اور پھر ظہیر کے اصرار پر رشید نے نجمہ کو اس راز سے واقف کرانے کا وعدہ کیا۔

نجمہ نے جو خود گذشتہ ایک سال سے سائنس کے تجربوں میں تفریحاً مصروف تھی اسی قسم کا ایک آلہ چوری سے تیار کر لیا اب دونوں میں خفیہ راز و نیاز شروع ہو گیا۔ بظاہر یہ توقع تھی کہ ایک عرصہ کے بعد ان کو ایک دوسرے کی داستان سننے اور سنانے کا موقع ملا ہے اس لئے بہت حد تک تسکین ہو گئی گر جوں جوں دن گذرتے گئے ظہیر کے جنون میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس پر سماج اور اس کی اصلاح اور سب سے بڑھ کر انتقام کا بھوت سوار تھا۔ نجمہ کی کوشش یہ رہتی کہ کسی طرح اس کی دماغی کیفیات کو بدلے اور انقلابی جذبات کو ٹھنڈا کرے ہر کوشش ناکام ثابت ہوتی رہی۔

ایک روز ظہیر نے مقررہ وقت پر اپنا آلہ چالو کیا۔ اُدھر نجمہ بھی اپنے آلہ کے سامنے آبیٹھی۔ پچھلی رات کی دلچسپ اور

اچانک یک جائی پر گفتگو شروع ہوئی۔ بات چیت کے دوران میں جب مستقبل کا موضوع زیر بحث آیا اور نجمہ نے یہ محسوس کیا کہ کچھ دیر میں ظہیر اپنے قابو سے باہر ہو جائے گا تو اس نے ایک سریلی اور دھیمی چیخ لگائی۔ ظہیر نے پوچھا "کیا ہے؟" نجمہ نے نہایت دلکش آواز میں کہا، "اللہ" یہ اس کا تکیہ کلام تھا اور ہمیشہ فن کارانہ انداز میں کہتی تھی۔ "میرے دوپٹہ پر کمبل کا کیڑا چڑھ گیا ہے۔"

ظہیر۔ "تو اس سے ڈرتی کیوں ہو جھٹک دو۔"

نجمہ۔ "جھٹکا مگر وہ چمٹا ہوا ہے —— اللہ —— وہ اور اوپر چڑھ رہا ہے۔"

ظہیر۔ "مضطربانہ لہجہ میں" زور سے جھٹکو۔"

نجمہ۔ "آپ آکر جھٹک دیجئے نا۔"

ظہیر۔ "میں!! مایوسانہ انداز میں ہنستے ہوئے" اگر میں وہاں آؤں تو شاید کمبل کے کیڑے کی طرح خود بھی مسلا جاؤں۔" نجمہ نے پھر ایک چیخ ماری۔ ظہیر کی بیتابی بڑھنے لگی۔ سارا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ اس نے کہا "نوکر کو آواز دے لو۔"

"آیا —— آیا —— بوائے —— بوائے —— اللہ کوئی بھی نہیں ہے آپ ہی آجائیے۔"

"پیاری نجمہ اگر تم چاہتی ہو کہ تمہارے گھر والے مجھے کمبل کے کیڑے کی طرح جوتی سے رگڑ دیں تو تمہاری خاطر میں اس کے لئے بھی تیار ہوں۔" نجمہ نے کہا "پریشان نہ ہو کیڑا نکل گیا۔" ظہیر نے کہا۔ مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ آج کا دن میری اس پرانی اور فرسودہ زندگی کا آخری دن ہے اور میں کل سے نئی دنیا میں داخل ہو کر جدید زندگی شروع کرنے والا ہوں۔

نجمہ۔ "کیوں کیا تمہاری شادی ہونے والی ہے؟"

ظہیر۔ "میری شادی؟"

نجمہ۔ "ہاں تمہاری" وہ "تو کہہ رہی تھیں کہ ان کو تم سے بے حد محبت ہے۔"

ظہیر۔ "وہ کون؟"

نجمہ۔ اجی وہی جن کا نام "ح" سے شروع ہوتا ہے انھوں نے "حسن کار" میں ایک مضمون بھی تو لکھا ہے جس میں تمہاری زندگی کا ایک واقعہ بھی بیان کیا ہے۔"

ظہیر۔ خدا کے لئے اس کا نام لے کر مجھے دق نہ کیا کرو۔ تم دیکھ رہی ہو کہ میں زندگی کی آخری گھڑیاں گذار رہا ہوں۔"

نجمہ۔ "پیارے معاف کرنا میں تم کو دکھ پہنچانا نہیں بلکہ موضوع گفتگو بدل کر تمہارے دل سے قنوطیت بھرے خیالات کر

نکال دینا چاہتی تھی۔

ظہیر نے کہا، اگر یہ قنوطیت ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس زمانہ میں مجھ جیسے جتنے قنوطی زیادہ ہوں گے اتنے ہی جلد سماج کی اصلاح ہو گی۔ ہمارا دعویٰ سماج اور مذہب دونوں کے خلاف ہے۔ ہم بغاوت پر تلے ہوئے ہیں اور ان کو اتنا کمزور کردیں گے کہ اپنی مرضی کے مطابق جس سانچہ میں چاہیں ڈھال لیں" بخمہ نے فوراً کہا "تم غصہ میں مذہب کی بے حرمتی کر رہے ہو زبان سے کفر کے جملے نکل رہے ہیں"

ظہیر۔ "سچا مذہب اب مفقود ہے۔ آج جس مذہبیت کا ڈنکا پیٹا جا رہا ہے وہ لامذہبیت سے زیادہ نقصان رساں اور کھوکھلا ہے"

"اور تمہارا یہ مطالبہ بھی ناجائز ہے کہ مذہب اور سماج کو اپنی مرضی کے مطابق بنالو"

"ہاں میرا یہی مطالبہ ہے اور پورا ہو کے رہے گا" اس پر بخمہ نے کہا "دنیا کو کوئی مجبور نہیں کرسکتا کہ اس کے بتلائے ہوئے اصولوں پر عمل کیا جائے۔ کیا اس کا امکان نہیں کہ تمہارے ترتیب ہوئے نظام میں بھی خرابیاں نہ ہوں کیا نہیں ہوسکتا کہ جو نظام تم چاہتے ہو وہ دوسروں کے لئے قابل قبول نہ ہو"

ظہیر نے سوچ کر کہا "اگر یہ ہٹ دھرمی بھی ہے تو میں اڑا ہوں گا جس سماج نے مجھ کو برباد کیا ہے اس کو میں تباہ کروں گا "مذہب ——— ہوں"

بخمہ۔ "خدارا مذہب کا نام نہ لو۔ نہ معلوم خدا کو تمہاری کوئی بات بری لگے اور ....

ظہیر۔ "مجھے جب اپنی اچھی باتوں اور اچھے کاموں کا صلا نہیں ملا تو مجھے بری باتوں اور برے کاموں کی سزا کا بھی ڈر نہیں"

"خدا کا خوف کرو"

عادل حقیقی کی ہستی کو ڈراؤنی نہ سمجھو"

"خیر خوف ہو یا نہ ہو بھگتنی تو پڑے گی۔ یہ تقدیر کا معاملہ ہے ——— "تقدیر ——— نادان بچی تقدیر ایک کھلونا ہے جس کو ہاتھ میں لے کر دولت مند تماشہ دکھلا رہے ہیں۔ تقدیر پر جیسا اس کو ظاہر کیا جا رہا ہے اعتماد کرنے والا کافر سے بدتر ہے۔ تقدیر دراصل انسانی تدبیر کا نتیجہ ہے سمجھیں" بخمہ اس سے بہت متاثر ہوئی وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اس سے کچھ نہ کہا گیا صرف اتنا کہا "تم ایسے خیالات ظاہر کر رہے ہو جو مذہب ———"

ظہیر نے بات کاٹ کر کہا "مذہب کا نام نہ لو۔ میں نے کہہ دیا کہ مذہب کا وجود نہیں۔ آجکل سماج مذہب بنا ہوا ہے

جہاں جس کی ضرورت ہوئی اس کو چسپاں کر دیا"۔

نجمہ نے تسلی دینے کی خاطر کہا۔ "پیارے ظہیر تم مفلسی پر اتنے رنجیدہ کیوں ہو۔ خدا نے چاہا تو تم بھی ایک دن امیر ہو جاؤ گے"۔

"خدا نے چاہا تو نہیں بلکہ میں چاہوں گا تو ——— خدا کو اس کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ کسی کو دولت مند یا کسی کو نادار بناوے ——— میں دولت مند بننا نہیں چاہتا بلکہ تمام دولت مندوں کو مفلس دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہی میری آرزو ہے اور میں اس کو پورا کروں گا۔ دولت ہی دراصل افلاس کا سبب ہے۔ جس دنیا کا یہ نظام ہو کہ غریب امیر کی لڑکی سے نہیں مل سکتا میں اسی دنیا کو ٹھکرانے والا ہوں، اُس نظام کو درہم برہم کرنے والا ہوں۔ میں نے قسم کھائی ہے کہ آج سے دولت مندوں میں افلاس پھیلانا شروع کروں گا"۔ نجمہ نے پوچھا کہ پھر اُن کی دولت کیا ہو گی؟ ظہیر نے جواب میں کہا کہ اس کے تیار کردہ نظام میں کسی کو دولت کا احساس ہی نہ ہو گا۔ نجمہ یہ کہنے پر کہ یہ ایک تصوری نظام ہے ظہیر نے کہا۔

تصوری نہیں بلکہ سو فیصد عملی ہے ——— نجمہ معلوم ہے آج کس کے گھر پر دھاوا بولا جانے والا ہے۔

اس پر نجمہ بے حد پریشان ہو گئی۔ "خدا کے لئے ان جھگڑوں میں نہ پڑو۔ میں زندہ درگور ہو جاؤں گی"۔ نجمہ اور ظہیر دونوں کانپنے لگے۔ ان پر کسی غیر معمولی طاقت کا رعب پڑنے لگا۔

"ظہیر نے کہا۔ "اگر تم میرا ساتھ دینا چاہتی ہو تو تیار رہو میں بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ تم سے ملنے اور تم کو اپنا بنانے کے لئے آتا ہوں"۔

"میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گی"۔

"اب ہم حملے کے لئے نکلنے والے ہیں۔ ہماری فوج تیار ہے"۔

"کیسی فوج؟"

وہ فوج جو برباد کنندوں کو ان کے خون میں ڈبو کر مارے گی"۔ ادھر یہ جملہ ظہیر کی زبان سے نکلا تھا کہ دونوں آوں پر ایک، خاص قسم کی آواز سُنائی دی جس نے دونوں کو چوکنا کر دیا ——— دونوں نے پلٹ کر دیکھا۔

ظہیر کے کمرے میں شہر کے کوتوال طپنچہ لئے کھڑے تھے۔ ان کے پیچھے تقریباً تیس مسلح پولیس والے تھے۔ اس طرف نجمہ نے اپنے پیچھے اپنے والد کو دیکھا جن کے ساتھ رشید کھڑا ہوا تھا۔ نجمہ کے والد نے آ کے نجمہ کے سامنے سے ہٹا لیا اور

کہنے لگے "میں بہ حیثیت وزیر اعظم کوتوال صاحب کو مقتدر گردانتا ہوں کہ وہ ظہیر اور اس کے ساتھیوں کو بلا حکم نامہ گرفتاری پکڑ لیں"۔ انھوں نے پلٹ کر رشید کی طرف دیکھا اور کہا "رشید شکریہ۔ جائزہ لینے کے بعد کل شام میں مجھ سے ضرور ملنا۔ خدا حافظ"

نجمہ اور ظہیر دونوں خاموش تھے۔

مرزا ظفر الحسن بی۔ اے (عثمانیہ)

چشمہ

عجب پُر کیف ہے بہتے ہوئے پانی کا زیر و بم
اور اس پہ چاند کی کرنوں کا گرنا ناچنا پیہم
ترنم اس کا بیداری میں ایسا لطف دیتا ہے
کہ جیسے خواب میں خلخال پائے یار کی چھم چھم

ہوا کی چھیڑ سے پُرچین جو روئے آب ہوتا ہے
تو عکسِ ماہ پارے کی طرح بے تاب ہوتا ہے
بکھر جاتی ہے زلفِ موج یوں جیسے کوئی چنچل
ٹمیں چھمکائے کچی نیند سے بیدار ہوتا ہے

قمر کا عکس کتنا خوش نما معلوم ہوتا ہے
کبھی لہروں میں پیدا اور کبھی معدوم ہوتا ہے
تارے بھی کبھی ڈوبے، کبھی اُچھلے، کبھی ٹھہرے
زمیں پر آسماں پھیلا ہوا معلوم ہوتا ہے

شباب اشجار کا، کہسار کی تمکین و خود رائی   گلوں کی خود فروشی سرو کی بدمست انگڑائی
جھلک اُٹھتے ہیں یوں شفاف پانی میں یہ سب جلوے   اُتر آیا ہو جیسے آئینہ میں عکسِ رعنائی

کبھی ٹھہرے ہوئے پانی پہ تصویریں وہ گوناگوں   کبھی پھولوں کے عکسِ رنگ سے موجیں وہ بوقلموں
حبابوں کے وہ فرشِ آب پر اُلٹے ہوئے پیالے   کہ جیسے میکدے میں مفلسوں کے کاسۂ واژوں

ہوا یوں سرو کی پرچھائیں پانی میں ہلاتی ہے   تھپک کر جیسے دایہ طفلِ سرکش کو سلاتی ہے
وہی ہے کیف اس نظارے کا گویا تخیل میں   کسی طناز کی اک سرو قد تصویر آتی ہے

اچھل پڑتی ہے یوں مچھلی کوئی اپنی روانی میں   کہ جیسے رخنہ پڑ جائے تخیل کی روانی میں
چمکتی اور لہراتی ہوئی پھر تہ میں جاتی ہے   کرن مہتاب کی حل ہو گئی ہو جیسے پانی میں

تجھے چشمہ نہ کہنا چاہیے تو عکسِ قدرت ہے   جھکے کہسار پابوسی کو، ایسی تیری رفعت ہے
سپہر و ماہ و انجم رنگ سب کے حل ہوئے تجھ میں   تو آئینہ ہے قدرت کا تو عکاسِ حقیقت ہے

سلیس اور صاف تو اک داستاں ہے سازِ ہستی کی دکھاتا ہے تو تصویریں بلندی اور پستی کی
صفائی قلبِ صوفی کی تلون طبع عاشق کا روانی فکرِ شاعر کی، دوانی جوشِ مستی کی

مبارک ہے وہ پتہ جو تری گودی میں بہتا ہے مبارک ہے وہ پتھر جو تھپیڑے تیرے سہتا ہے
مبارک ہے وہ ساحل بھی کہ جو تیرے بھرے دل کا تجھی سے بھید سنتا ہے مگر خاموش رہتا ہے

مری ہستی کی بھی اے کاش ایسی ہی کہانی ہو یہی ہو نرم رفتاری، یہی جوش و روانی ہو
مرے سینہ پہ بھی ہوں منعکس انوار فطرت کے یہی دل کی صفائی اور طبیعت کی روانی ہو

تمنا یہ نہیں ہے کام کچھ نایاب ہو مجھ سے دعا یہ ہے شگفتہ خاطر احباب ہو مجھ سے
پھروں میں چشمہ ساں دنیا میں سرگشتہ و آوارہ کوئی سوکھی ہوئی کھیتی کبھی سیراب ہو مجھ سے

سید وہاج الدین احمد

کُلیّہ کی خبریں

انجمن اتحاد

انتخابات اس سال انجمن اتحاد کے انتخابات میں روایتی جوش وخروش نہ تھا جس کا مظاہرہ طلبا نے سابقہ سالوں میں کیا تھا۔ البتہ جوش وخروش کی جگہ متانت اور سنجیدگی نے لے لی تھی جو کہ جامعی طلبا کا طرۂ امتیاز ہونا چاہئے۔ انتخابات کے روز تمام طلبا نے خاموشی اور ذمہ دارانہ طور پر اپنی رایوں کا استعمال کیا اور سرگرم اراکین کی ایک موزوں وزارت کا انتخاب عمل میں آیا جو حسب ذیل افراد پر مشتمل ہے۔

صدر:- میر عباس علی خاں صاحب بی۔اے (عثمانیہ)

نائب صدر:- کے اچھوتا ریڈی " "

معتمد:- احمد خاں بی۔اے (ابتدائی)

کتب خانہ دار:- غیاث الدین خاں بی۔اے (")

اراکین مجلس انتظامی انجمن اتحاد

شعبہ فنون:- محمد محمود الزماں صاحب متعلم ایم۔اے (آخری)
محمد تراب علیخاں صاحب متعلم بی۔اے (ابتدائی)
محمد افضل صاحب متعلم بی۔اے (ابتدائی)

شعبہ سائنس:- عبدالحیٔ صاحب متعلم ایم ایس سی (آخری)
اللہ یار خاں صاحب متعلم " (ابتدائی)
پریم راج صاحب ماتھر " (آخری)

شعبہ دینیات:- سید عبدالرزاق قادری جعفری بی اے (ابتدائی)

شعبہ قانون :- ابو المکارم محمد نعیم الدین صاحب ال ال بی (ابتدائی)

شعبہ انجینیرنگ نرسیا صاحب بی ای

بی آر جوشی صاحب سب آرڈی نیٹ

جلسہ کرسی نشینی

ماہ شہریور کے اواخر میں انجمن اتحاد کا جلسہ کرسی نشینی منعقد ہوا۔ سابق معتمد ابو الخیر صاحب نے نئی کابینہ کو خوش آمدید کہا اور اس سے خوشگوار توقعات وابستہ رکھیں۔ اس کے بعد جناب نائب معین امیر جامعہ نے طلبا کو مخاطب فرمایا اور کابینہ کے اراکین کو پھول پہنائے۔

مباحثی جلسے

انجمن اتحاد کی دیگر مصروفیتوں کے علاوہ مباحثی جلسے بھی کافی تعداد میں منعقد کئے گئے اور سال کے دوران میں تقریباً ۲۰ سے زیادہ جلسہ ہوئے جس میں طلبانے بہت ہی دلچسپ اور سنجیدہ مباحث پر تقریریں کیں۔

برار کا وفد

۶ر آبان ۱۳۴۷ف کو برار سے ایک وفد جو چند علمی نوجوانوں پر مشتمل تھا حیدرآباد سے راہ و رسم بڑھانے اور خوشگوار تعلقات پیدا کرنے کے لئے آیا تھا۔ اراکین وفد کی انجمن اتحاد میں تقریریں ہوئیں۔ اسی کے بعد ایک اور جلسہ بتاریخ ۲۴ر آبان ۱۳۴۷ف میں کے مکرجی صاحب ایم۔ اے (ڈھاکہ) اور محمد بن عمر صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) کے درمیان (War is an **etrnal** necessity) کے عنوان پر دلچسپ اور معلومات آفریں مباحث ہوئے ایک خاص بات اس سال کے مباحثی جلسوں میں یہ بھی کہ طلبا کے علاوہ اساتذہ صاحبان نے بھی حصہ لیا جس کی وجہ سے انجمن کے مباحثوں میں دلچسپی پیدا ہوگئی۔ ان میں قابل ذکر ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم، ڈاکٹر انور اقبال قریشی، پروفیسر مسٹر ہارڈنگ، پروفیسر کرشنن اور وہاج الدین صاحب ہیں۔

شبیہ مبارک

انجمن اتحاد کی دوسری موثر اور شاہ پرستانہ تحریکوں میں ایک تحریک یہ بھی ہے کہ سلطان العلوم اعلیحضرت اقدس و اعلیٰ کی شبیہ مبارک سے انجمن اتحاد کے ہال کو زینت بخشی جائے اور ایک مرتبہ شاہ ذی جاہ بھی خود بنفس نفیس اپنے قدوم میمنت لزوم سے جامعہ کی شان کو دوبالا کریں لیکن چند ناگزیر وجوہات کے باعث اس تحریک کو عملی جامہ پہنایا نہ جاسکا۔ لیکن اب انجمن اتحاد کا خیال ہے کہ کلیہ فنون کی افتتاحی رسم کے سلسلہ میں اعلیحضرت قدر قدرت سے جامعہ میں رونق افروزی کے لئے مودبانہ طور پر استدعا کی جائے ہم اعلیحضرت خسرو دکن کی شبیہ مبارک انجمن اتحاد میں لگائے جانے اور حضور کی تشریف آوری کے دل سے آرزو مند ہیں۔

MR. MOHIUDDIN GHAZI,

He stood first in the All India Urdu eloqution competition held at Aligarh and won the trophy for the Osmania University.

سالار جنگ کپ مسٹر احمد خاں اور محی الدین غازی نے نظام کالج سالار جنگ اُردو تقریری مقابلہ میں جامعہ کی نمایندگی کی اور سالار جنگ کپ حاصل کیا۔

مباحثی جماعت کی علیگڑھ کو روانگی علیگڑھ یونیورسٹی نے بین الجامعاتی تقریری مقابلوں میں ہماری جامعہ کے نام بھی دعوت نامے روانہ کئے تھے۔ ان تقریری مقابلوں میں شرکت کے لئے محی الدین غازی صاحب، عمر مہاجر صاحب، محمد بن عمر صاحب اور درویش عالم صاحب نے علی الترتیب اردو اور انگریزی مقابلوں میں جامعہ کی نمایندگی کی۔ اس امر کے اظہار میں ہمیں بڑی ہی مسرت ہے کہ محی الدین غازی اور عمر مہاجر نے علیگڑھ یونیورسٹی کے کل ہند تقریری مقابلہ میں جو ۱۱ر دسمبر کو منعقد کیا تھا پہلا اور دوسرا انعام حاصل کیا اور اس طرح ٹرافی بھی حاصل کی اس شاندار کامیابی پر انجمن اتحاد طلبا جامعہ عثمانیہ اور خود مقررین کی خدمت میں ہم پُرخلوص ہدیۂ تشکر پیش کرتے ہیں۔ عمر اور درویش انگریزی مباحثہ میں امتیازی کامیابی حاصل نہیں کرسکے لیکن ان کی تقاریر نے بڑی حد تک ان غلط فہمیوں کا ازالہ کردیا ہوگا جو عثمانیہ کی انگریزی کے متعلق اب تک موجود ہیں۔

تعزیتی جلسے غازی مصطفےٰ کمال اتاترک کی وفات کا سانحہ عظیم بہت ہی روح فرسا اور جانکاہ ہے غازی موصوف کی خدمات جدید ترکی کی تعمیر میں ناقابل فراموش ہیں آپ کی وفات کے باعث اسلامی دنیا میں ایک ایسی جگہ خالی ہوگئی ہے جس کے پُر ہونے کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ اتاترک کا رنج والم ابھی ختم ہونے بھی نہ پایا تھا کہ مولانا شوکت علی کے انتقال پر ملال کی خبر نے اہل ہند کے جذبات اور احساسات پر ایک بجلی سی گرادی اور اس متلاطم دور میں سب لوگ اپنے آپ کو یکہ و تنہا محسوس کرنے لگے۔ ہر دو قابل قدر ہستیوں کے انتقال پر انجمن اتحاد نے تعزیتی جلسے منعقد کئے۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب نے اتاترک کی زندگی اور حکمت عملی پر شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالی اور طلبا کی طرف سے عمر مہاجر نے بہت ہی موثر اور متین تقریر کی اور ہر دو اصحاب کی وفات پر تعزیتی قرار دادیں منظور کی گئیں۔

جشن یوم جامعہ عثمانیہ انجمن اتحاد نے دوسری علمی، ادبی، مباحثی اور معاشرتی مصروفیتوں کے علاوہ جشن یوم جامعہ بھی یونیورسٹی کی شایان شان منایا ہر ایک تقریب نہایت باقاعدگی اور خوش سلیقگی سے انجام پائی جس میں نہ صرف صدر انجمن میر عباس علی خاں صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) و معتمد احمد خاں صاحب کی خدمات اور جد و جہد شامل ہے بلکہ جشن کی کامیابی میں پوری کابینہ کے اراکین کی دلچسپیوں اور سرگرمیوں کو بھی دخل ہے

اس طرح انجمن اتحاد نے وسیع پیمانہ پر جشن یوم جامعہ منایا اور مختلف تقریری اور تحریری مقابلوں میں ملحقہ کلیات کے طلبا کو بھی شرکت کی دعوت دی۔

اُردو تحریری اور تقریری مقابلہ

اُردو تقریری مقابلہ میں سٹی کالج کے سال دوم کے طالبعلم محمد عبدالحی صاحب ضیا اور سالم بن عمر صاحب اول و دوم آئے اس طرح سے سٹی کالج کے طلبا نے ٹرافی حاصل کی۔ یہ بات ملحوظ رہے کہ اس مقابلہ میں ہماری جامعہ کے طلبا نے شرکت نہیں کی۔ اردو تحریری مقابلہ میں جامعہ عثمانیہ کے دو طالب علم نجیب اللہ صدیقی متعلم سال چہارم اور رشید قریشی صاحب متعلم سال سوم اول و دوم آئے۔

انگریزی تقریری و تحریری مقابلہ

تقریری مقابلہ میں آئی۔ جی۔ ڈبلیو۔ بٹ اول آئے .... دوم رہے بین الکلیاتی تقریری مقابلہ میں ورنگل کالج سال اول کے طالب علم نور علی اول رہے سٹی کالج کے ایک طالب علم مسٹر محمود حسن دوم رہے۔ ٹرافی ورنگل کالج نے حاصل کیا۔

کل ہند مشاعرہ

جشن جامعہ کی تقریب میں کل ہند مشاعرہ ترتیب دیا گیا تھا۔ بہت دن پہلے سے انتظامات شروع ہو گئے تھے مشاعرہ کی کامیابی بہت کچھ معتمد مشاعرہ جناب محمد علی صاحب نیر کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔
اڈریس ہال پر خوشنما روشنی کی گئی تھی۔ ہال کے اندر بیٹھنے کا انتظام سلیقہ سے کیا گیا تھا۔ بہت سے بیرونی شعرا کے نام دعوتی رقعہ روانہ کئے گئے، مگر ان میں سے صرف دو حضرات ہی تشریف لائے۔ احسان بن دانش اور جلیل قدوائی ایم۔ اے۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد کی صدارت میں مشاعرہ منعقد ہونے والا تھا لیکن عین وقت پر ناسازی مزاج کے سبب مہاراجہ بہادر مشاعرہ میں صدارت نہ فرما سکے۔ حضرت امجد حیدرآبادی، نواب تراب یار جنگ بہادر کے علاوہ اور بہت سے مقامی شعرا نے اپنا کلام سنایا۔ حضرت امجد نے اپنے مخصوص والہانہ انداز میں رباعیات سنا کر عجیب کیفیت طاری کر دی۔ نواب تراب یار جنگ بہادر کی غزل بہت پسند کی گئی اس کے بعد حضرت احسان بن دانش نے اپنی ایک نظم دلہن کے عنوان سے سنائی۔ احسان بن دانش ایک پرگو شاعر اور بہت ہی موثر و اچھی نظمیں کہنے والوں میں سے ہیں آپ کے کلام میں اشترالیت کا رنگ جھلکتا ہے اور غریبوں کی بے مایہ زندگی سے آپ بہت متاثر نظر آتے ہیں۔ آپ کی نظم کے اختتام پر مکیش، مخدوم اور ساز نے بھی جو حیدرآبادی نوجوان شعرا میں ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں ہندوستان، حویلی اور ایک رات کے عنوان سے نظمیں سنا کر اہل محفل پر ایک سکوت و کیف طاری کر دیا اور بے فکر انسان بھی گھڑی بھر کے لئے وطن کی حالت غیر پر غور و فکر کرنے پر مجبور

ہو گئے آخر میں خلیفہ عبدالحکیم صاحب نے اپنی نظم جو فلسفیانہ انداز میں لکھی گئی تھی سنائی۔ اہل ذوق نے بہت دل کھول کر داد دی اس وجہ سے کہ خلیفہ صاحب نے ایسے خیالات کو نظم کیا جس کا صرف تصور ہی کیا جا سکتا تھا اظہار ناممکن۔ اس طرح سے ایک تصوری اور خیالی دنیا کے ساتھ تمام لوگ اپنے اپنے گھروں کو سدھارے۔

ڈنر ۲۴ اسفندار کو دوپہر میں انگریزی تقریری وتحریری مقابلہ ہوئے اور رات میں آٹھ بجے ڈنر بڑے پیمانہ پر ترتیب دیا گیا جس میں طلبائے حال و قدیم کے علاوہ عالی جناب نائب امیر معین جامعہ عثمانیہ اور اساتذہ بھی مدعو کیے گئے تھے۔ ڈنر کے اختتام پر جناب نائب معین امیر جامعہ عثمانیہ نے اعلیحضرت سلطان العلوم حضرت اقدس و اعلیٰ کا جام صحت تجویز فرمایا اور ڈاکٹر رضی الدین پروفیسر ریاضیات نے قدیم طلبہ کی تائید کرتے ہوئے طلبہ حال کا جام صحت تجویز کیا آخر میں ابوالمکارم فہم الدین صاحب متعلم ال ال بی نے نائب معین امیر جامعہ اور معزز مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

جلسہ موسیقی ڈنر کے بعد ہی اُدّ یس ہال میں جلسہ موسیقی شروع ہوا۔ اس میں جامعہ کے طالب علموں کے علاوہ ماہرین فن نے بھی حصہ لیا۔ ایک کمسن طالب علم منظور احمد نے جن کی آواز میں کافی درد اور موسیقیت تھی اپنے گانے سے حاضرین کو بہت متاثر اور محظوظ کیا۔ آخر میں مسٹر رؤف نے جو ہماری جامعہ کے قدیم طالب علم ہیں اور اپنے فن میں کافی مہارت رکھتے ہیں مختلف قسم کے گانوں سے محلس پر ایک کیفیت طاری کردی۔ اس قسم کے جلسوں میں ہم اکثر مسٹر رؤف کو زحمت دیا کرتے ہیں اور ہمیں خوشی ہے کہ وہ باوجود دیگر مصروفیات کے ہماری خواہش کو کبھی نامنظور نہیں فرماتے موسیقی کے مختلف انعامات کے علاوہ مسٹر رؤف اور منظور احمد کو کپس دیئے گئے۔ مسٹر غازی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

ڈرامہ ۲۴ اسفندار کو عصرانہ ہوا اس کے بعد جناب نائب معین امیر جامعہ نے جشن کے تمام انعامات تقسیم فرمائے اسی کے ختم پر رات میں ایک ڈرامہ "تریا چرتر" اسٹیج کیا گیا۔ یہ ڈرامہ غلام طیب صاحب بی۔ اے بی ٹی لکچرار اورنگ آباد کالج نے لکھا ہے۔ تنگی وقت اور باوجود کافی سامان و انتظامات نہ ہونے کے بہت ہی کامیابی کے ساتھ اسٹیج کیا گیا۔ سبھوں نے ڈرامہ کو بہت پسند کیا۔ ڈرامہ روزمرہ کی ٹھیٹ لکھنوی زبان میں لکھا گیا ہے جس کے لب ولہجہ کو کامیابی کے ساتھ ادا کرنے میں بڑی مہارت درکار ہے لیکن بڑی خوشی کی بات ہے کہ اداکاری اور زبان دانی کے لحاظ سے ڈرامہ میں کوئی خامی نہیں تھی خصوصاً رشید قریشی نے نورخاں ملازم اور نوراللہ صدیقی نے ذوالفقار علی خاں کا پارٹ بہت ہی سلیقہ اور کامیابی کے ساتھ ادا کیا اور حاضرین سے خراج تحسین حاصل کی۔ اس کے ساتھ ساتھ عبدالرشید خاں اور بشیر احمد انصاری کی اداکاری تکیلہ بانو اور جمیلہ کی اپنی

اپنی اپنی جگہ بہت ہی خوب تھی۔ ڈرامہ کی غیر متوقع کامیابی اور مقبولیت پر ہم منتظمین ڈرامہ کو مبارکباد دیتے ہیں۔ اس طرح جشن یوم جامعہ کی تمام تقاریب نہایت مستعدی اور خوش اسلوبی کے ساتھ انجام پائیں اور ہمیشہ سے زیادہ جشن یوم جامعہ کامیاب رہا۔ ایک اور بات قابل ذکر ہے کہ جناب نائب معین امیر جامعہ نے ہر تقریب میں شرکت فرمائی اور بڑی دلچسپی اور انہماک کے ساتھ طلبا کی سرگرمیوں اور مصروفیتوں کا مطالعہ کیا اور اس طرح سے اپنی شرکت سے طلبہ کی حوصلہ افزائی فرمائی۔

سیول سرویس

اس مرتبہ سیول سرویس کے نتائج بہتر رہے گو کامیاب امیدواروں کے تناسب کے لحاظ سے ہم اب بھی پیچھے ہیں، لیکن یہ امر اطمینان بخش ہے کہ ہماری جامعہ کے دو امیدوار میر عباس علیخاں و محامد علی عباسی صاحبان مقابلہ میں بہ لحاظ درجہ کامیابی اول و دوم رہے۔ ہم امید کرتے ہیں آنے والی جماعت یہ کسر بھی نکال دے گی۔ مسٹر عباس جامعہ کے اچھے طالب علم، اچھے اداکار اور شوقین کھلاڑی رہ چکے ہیں۔ اور مقرر کی حیثیت سے جامعہ اور جامعہ سے باہر کل ہند تقریری مقابلوں میں امتیاز حاصل کیا ہے۔ ہم عباس کو اس امتیازی کامیابی پر اور انجمن اتحاد کو اس کے صدر کے سیول سرویس کے مقابلے میں حیدری مڈل حاصل کرنے پر مبارکباد دیتے ہیں، امید کرتے ہیں کہ مسٹر عباس کی صلاحیتیں اس نئے ماحول میں بھی انھیں نمایاں کرتی رہیں گی۔

مسٹر محامد نے خاموش سنجیدہ اور متین طبیعت پائی ہے۔ اس سے پہلے مجلہ میں ان کی نظم شائع ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ شاعر بھی ہیں۔ ان کی امتیازی کامیابی پر بہتوں کو حیرت ہوئی۔ ہم محامد کو مبارکباد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ اسی طرح ہماری حیرت کا باعث ہوتے رہیں گے۔

تحصیلداری

تحصیلداری کے انتخابات میں تو ہماری جامعہ کے لڑکوں کی اکثریت منتخب ہوئی۔ مصطفےٰ علی اکبر گرامی۔ عبدالوحید رضوی ہنمنت راؤ مانوے کر، اللہ یار خاں، بھجنگ راؤ کلکرنی۔ ناظم الدین اور سید مجتبٰی تحصیلدار اور سکرٹری منتخب ہوئے۔ ان تمام کی خدمات میں مبارکباد پیش کی جاتی ہے۔

اقامت خانے

تینوں اقامت خانجات کی علمی جدوجہد اور مصروفیات سابقہ سالوں سے بہت بڑھی ہوئی رہیں بہت سے علمی، تقریری اور معاشرتی جلسے منعقد کئے گئے اور اقامتی زندگی میں علمی و ادبی تربیت کے ساتھ ساتھ معاشرتی اور تعلیمی قابلیت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ اقامت خانہ (الف) (ب) کے طلبا نے الگ الگ نظام ساگر ایک تفریحی سفر بارش کے خوشگوار موسم میں کیا جبکہ نظام ساگر کی ساری فضا سبز و نیلگوں باغات سے معمور تھی ہر دو اقامت خانجات کے

موبین پر وفیسر قادری وحید الرحمن صدر شعبہ طبیعیات کی سرکردگی میں ترتیب دیا گیا تھا، پروفیسر وحید الرحمن صاحب وقادری صاحب کی انتظامی اور عملی قابلیت سے نظام ساگر کے یہ تفریحی سفر بہت کامیاب رہے اور طلبانے اپنی بساط سے زیادہ لطف اٹھایا نظام ساگر ہی میں گسٹ ہاؤس میں اقامت خانہ ب کی طرف سے ایک فینسی ڈرس شو کا خاطر خواہ انتظام کیا گیا تھا جس کی ساری ذمہ داری ظہور الدین صاحب کے سر تھی۔ بڑی مسرت ہے کہ ظہور الدین صاحب اپنی پہلی ہی کوشش میں توقعات سے زیادہ کامیاب رہے۔ اور سفر کی دلچسپی میں کافی اضافہ کر دیا۔ اس حیثیت سے ظہور الدین صاحب قابل مبارکباد ہیں۔

اقامت خانہ ۲ الف کی طرف سے بھی ایک فینسی ڈرس شو اعلیٰ پیمانہ اور سلیقہ سے ترتیب دیا گیا تھا جس کو جناب نائب معین امیر جامعہ اور شفیق اساتذہ نے بہت ہی پسند فرمایا۔

میسور کا تفریحی سفر عارضی اقامت خانہ کی جانب سے سید ریاض الحسن صاحب ہاشمی کے زیر اہتمام میسور کا تفریحی سفر ہوا جس میں ہر سہ اقامت خانوں کے طلبا کے علاوہ غیر مقیم طلبا بھی شریک تھے۔ دسہرہ کے زمانہ میں میسور و بنگلور کی چہل پہل اور رنگینیوں کا کیا پوچھنا۔ پر شکوہ جلوس کا خاص اہتمام، برقی قوت کی افزونی، شہر کی خوبصورتی اور ریل پیل نئے آنے والوں کو محو حیرت کر دیتی ہے۔ سفر کافی دلچسپ اور آرام دہ رہا۔

ال ال ڈی کی ڈگری کچھ دنوں ہی کی بات ہے کہ حیدرآباد میں مہاراجہ بیکانیر کا ورود عمل میں آیا مہاراجہ موصوف کے تعلقات ریاست ابد مدت سے دوستانہ اور روادارانہ رہے ہیں مہاراجہ نہ صرف ہندوستان گیر بلکہ بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں جن کے کارنامے جنگ عظیم میں بہت ہی شاندار اور لائق ستایش رہے ہیں

جامعہ عثمانیہ کی طرف سے آپ کی خدمت میں ال ال ڈی کی اعزازی ڈگری پیش کی گئی اس سلسلہ میں ایک غیر معمولی جلسہ منعقد کیا گیا جس میں رفقا کے علاوہ حیدرآباد کے اعلیٰ عہدہ دار، روسا اور معززین مدعو کئے گئے۔ رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری نواز جنگ امیر جامعہ نے مہاراجہ بیکانیر کو ان کی بیش بہا خدمات کے صلہ میں ال ال ڈی کی اعزازی ڈگری عطا کی جس کو مہاراجہ موصوف نے بطیب خاطر قبول فرمایا۔

تمغہ طلائی ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی کا شمار جامعہ کے ان طلبا میں کیا جاتا ہے جو عثمانیہ کے علمی وقار کو بڑھانے کا باعث ہوئے صاحب موصوف کو ہندوستان کی سائنس ایکاڈمی نے چھ سال کی کامیاب ترین تحقیقات کے سلسلہ میں طلائی تمغہ پیش کیا ہم ڈاکٹر صاحب کو مبارکباد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب اس قسم کے مواقع پیدا کرتے رہیں گے۔

ذیلی بزمیں

بزم تاریخ

جدید کابینہ بزم تاریخ حسب ذیل عہدہ داروں پر مشتمل ہے۔

سید شاہد حسین صاحب زراتی متعلم ایم ۔ اے (آخری) — صدر
بھوپال راؤ صاحب متعلم بی ۔ اے — نائب صدر
سید کرار علی صاحب " " — معتمد
محمد بشیر الدین صاحب " " — خزانہ دار
ملک صفدر حسین صاحب مدیر خزینہ تاریخ متعلم بی ۔ اے

جدید کابینہ نے جائزہ لینے کے بعد ہی پروفیسر ابن حسن مرحوم کی یادگار کے سلسلہ میں ایک رولنگ کپ کے قیام کی اپیل کی جسے اساتذہ و طلبا شعبہ تاریخ نے پسند کیا تقریباً دو سو روپیہ کا چندہ فراہم ہو گیا ہے۔ چنانچہ اس سال سے "ابن حسن رولنگ کپ" رکھا گیا ہے تاکہ شعبہ تاریخ کے طلبا میں تاریخی مضامین لکھنے سے دلچسپی پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ پروفیسر مرحوم کی یاد بھی تازہ رہے۔ اس کے علاوہ بزم نے تقریباً ایک سو روپیہ تاریخی سفر برار کے لئے محفوظ رکھے ہیں جو اس موسم گرما میں کیا جائے گا۔

دوامی رکنیت کے سلسلہ میں سب سے پہلا عملی اقدام اسی جدید کابینہ نے کیا اور اب تک حسب ذیل حضرات اس کے دوامی رکن ہو چکے ہیں اور بزم کے علمی و عملی کاموں میں ان دوامی اراکین سے ہم ممکنہ تعاون کی توقع رکھتے ہیں۔

(۱) قاضی محمد حسین صاحب نائب معین امیر جامعہ نے دوامی رکن اور سرپرست بزم بننے کا وعدہ فرمایا ہے۔
(۲) پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی صدر شعبہ تاریخ و صدر ناظم بزم تاریخ نے دوامی رکنیت قبول فرمائی ہے۔
(۳) پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی پی ایچ ڈی صدر شعبہ فنون نے
(۴) جناب محمد اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر سابق صدر بزم تاریخ نے

(۵) جناب شاہد حسین صاحب رزاقی بی۔ اے عثمانیہ صدر بزم تاریخ دوامی رکن بن چکے ہیں۔
(۶) جناب محمد فاروق صاحب سیولینین سابق معتمد بزم تاریخ نے دوامی رکن بننے کا وعدہ فرمایا ہے
(۷) نواب علی یاور جنگ بہادر
(۸) نواب احمد علی خاں صاحب رکن بلدیہ
(۹) امیر عباس علی خاں صدر بزم اتحاد جامعہ عثمانیہ نے دوامی رکنیت قبول فرمانے کا وعدہ فرمایا ہے۔

آئندہ بزم تاریخ کی جانب سے بجائے خزینہ تاریخ کے سلسلہ تاریخ فروری سے شائع ہوگا یہ ایک قسم کے پمفلٹ ہونگے جن کی قیمت بھی بہت معمولی ہوگی یعنی ۴ر (ماہانہ یا سالانہ ؟) فروری ۱۹۴۶ء کے پہلے ہفتہ سے شائع ہونا شروع ہوگا۔ اس سلسلہ تاریخ میں اساتذہ و طلبا تاریخ کے ٹھوس اور تحقیقی مقالے ہوں گے۔ "ابن حسن رونگ کپ" کے سلسلہ میں مضامین کا اعلان حسب تصفیہ یکم اردی بہشت کو کیا جائے گا۔

بزم معاشیات بزم معاشیات اپنی کارگزاریوں کے اعتبار سے جامعہ کی ذیلی بزموں میں ایک خاص شہرت کی مالک ہے چنانچہ سال گذشتہ اس کے زیر اہتمام کل ۲۵ جلسے ہوئے جس میں معمولی جلسوں کی تعداد ۲۰ رہی۔ ان جلسوں میں حیدرآباد کے مختلف معاشی مسائل پر دلچسپ تحقیقی اور بلند پایہ مقالے پڑھے گئے ان کے علاوہ غیر معمولی جلسے ہوئے جن میں ہندوستان بھر کی ممتاز ہستیوں مثلاً پروفیسر ڈڈلی اسٹامپ، پروفیسر جے۔ اے۔ وین، کیاپٹن ٹپادل، مس الزبتھ ڈنکس اور مس مارتھا رڈٹ نے مختلف معاشی مسائل پر معلومات آفرین تقریریں کیں۔

بزم نے اپنے اراکین کے لئے تعلیمی تفریحوں کا انتظام کیا تھا جن میں قابل ذکر دکن بٹن فیکٹری، عوثیہ بٹن فیکٹری اور مرکز ترقیات دیہی بٹن چرہ ہیں۔

علاوہ ازیں بزم کی جانب سے تعطیلات سرما میں دو تحریری مقابلے منعقد کئے گئے تھے۔ ایک مقابلہ طلبائے سال اول و دوم کے لئے اور دوسرا طلبائے سال سوم و چہارم کے لئے اول الذکر مقابلے میں جناب سید معین الدین صاحب رضا قادری نے اور ثانی الذکر مقابلے میں احمد خاں صاحب نے پہلا انعام حاصل کیا۔

اس سال " میکنزی تحریری مقابلہ" میں سالہائے سابق کے برخلاف زیادہ مضامین وصول ہوئے اس مقابلہ میں احمد خاں صاحب میکنزی انعام کے مستحق قرار دیے گئے۔

اس سلسلہ میں بزم کی سب سے اہم اور ناقابل فراموش کارگزاری میکنزی آنجہانی کی دائمی یادگار قایم رکھنے کے لئے "میکنزی میموریل فنڈ" کا قیام ہے جس میں جناب ناصر علی صاحب بی۔ اے عثمانیہ سابق نائب صدر بزم کی انتھک اور پُر خلوص کوششوں سے تقریباً ۴۰۰ روپیہ جمع ہوچکے ہیں اور اس خصوص میں موجودہ کابینہ مصروف عمل ہے۔

بزم معاشیات اپنے مالیہ کے اعتبار سے تمام ذیلی بزموں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے اور اس وقت بزم کے ہاں ۳۹۷ روپیہ ۵ آنہ ۱۰ پائی بطور سلک موجود ہیں۔

بزم کے حالیہ انتخابات کا نتیجہ حسب ذیل ہے۔

نائب صدر :۔ جناب سید محمد تقی ہاشمی صاحب متعلم سال ششم

معتمد :۔ محمد افتخار حسین صدیقی متعلم سال چہارم

کتب خانہ دار :۔ مسٹر سی۔ وی۔ دوم راؤ متعلم سال سوم

نمایندے

سال پنجم و ششم :۔ سید محمد احمد صاحب سبزداری

سال چہارم :۔ مسٹر بالکشن راؤ

سال سوم :۔ سید افضل الدین خاں صاحب

سال دوم :۔ صاحبزادہ میر مسعود علی خاں صاحب

بزم قانون بزم قانون اپنی کارگزاریوں کے اعتبار سے فراموش نہیں کی جاسکتی۔ ممتاز علی صاحب وارثی بزم کی کامیابی میں بہت بڑی حد تک مدد و معاون رہے چنانچہ اس ذیلی بزم کی طرف سے کئی تقریری اور مباحثی جلسے منعقد کئے گئے اور کئی بلند پایہ مقالہ پڑھے گئے۔ اس بزم کی کارگزاری کی ندرت یہ ہے کہ اس سال بزم کے زیر اہتمام قانون کے طلبہ کو دو تین مرتبہ اہم اور سنگین مقدمات کی سماعت اور کارروائیوں کے عملی تجربوں کے لئے عدالت العالیہ لے جایا گیا اور طلبانے بڑی دلچسپی کے ساتھ عملی طور پر مقدموں کی تفصیلات اور کارروائیوں سے آگاہی حاصل کی۔ جناب قلیچ بیگ صاحب وکیل سرکار صوبہ میدک فرزند جناب نواب جیون یار جنگ بہادر اور ہمایوں مرزا صاحب بیرسٹر

واحمد اللہ صاحب سشن جج اورنگ کی وفات حسرت آیات پر بزم قانون میں تعزیتی جلسے منعقد کئے گئے اور قرار داد تعزیت ان کے ورثار کے پاس روانہ کی گئی۔

بزم کی غیر اطمینان بخش مالی حالت کے سبب قانون سے متعلق کوئی رسالہ چھاپ کر شائع نہ کیا جا سکا البتہ طلبا کے مفاد کی خاطر ایک قلمی رسالہ ترتیب دیا گیا ہے جس میں قانون کے طلبا کے بہت سے مفید اور دلچسپ مضامین شامل ہیں بزم قانون کے کتب خانہ کی تحریک بھی زیر غور ہے۔

کھیل

کرکٹ کلب

پروفیسر مرزا حسین علی خاں صاحب کی گہری دلچسپیاں کرکٹ کلب کے سلسلہ میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آپ کی خدمات کلب کو کامیاب بنانے میں بہت سازگار رہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بھارت چند اور ایبارا جیسے مشہور کرکٹ کھلاڑی جامعہ عثمانیہ نے پیدا کئے۔ بھارت چند جامعہ کے سابق طالب علم ہیں جنھوں نے انگلستان میں بھی اپنے کھیل کا بہت اچھا مظاہرہ کیا۔ اور اس کے صلہ میں آپ نے کیمبرج بلو۔ حاصل کیا۔ جو کہ اب تک صرف چار ہی ہندوستانی کھلاڑیوں کو مل سکا ہے۔ ایبارا صرف حیدرآباد ہی میں نہیں بلکہ ہندوستان میں بھی اپنے کھیل کے باعث روشناس ہیں چنانچہ آپ نے پنج قومی ٹورنمنٹ میں پارسیوں کی طرف سے کامیاب رہنمائی کی۔

اس سال ریاست اور جواد کی کپتانی اور معتمدی ٹیم کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی پورے سال میں ٹیم کے تقریباً ۲۳ مقابلے دوسری ٹیموں سے ہوئے جن میں سے آٹھ میں کامیابی حاصل ہوئی ۱۲ مقابلہ برابری پر اترے اور صرف تین میں ناکامی ہوئی۔ بین الکلیاتی ٹورنمنٹ میں اشرف نے اپنی ایک صدی بنائی اور آخری مقابلہ نظام کالج سے مسلسل تین دن تک بہت ہی دلچسپ اور قابل دید رہا۔ خصوصاً دوسری باری میں "حسین" نے اپنی شاندار صدی اور چھکوں سے پورے کھیل میں جان ڈالدی اور جواد کی گیند اندازی کے آگے مخالف ٹیم کی کچھ پیش نہ گئی۔ اسی طرح بیاٹ بازی اور گیند اندازی کا چمپین شپ کپ حسین اور جواد نے حاصل کیا۔ کرکٹ ٹیم کی اس قابل قدر کامیابی پر ہم مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

بین الجامعی کرکٹ ٹورنمنٹ کا پہلا مقابلہ بمبئی یونیورسٹی کی ٹیم سے کھیلا گیا اس میاچ میں بھی جواد نے بہت اچھا

مظاہرہ کیا۔ اور پورے کھیل میں نو وکٹس لیے۔ اس طرح جواد نے اپنی بہترین گیند اندازی کا سکہ مخالف ٹیم پر بٹھادیا اور ٹیم بُری طرح ہارنے سے بچ گئی۔ دوران سال میں عباس حسین اور رشید پال کا کھیل اچھا رہا۔ اور ذکا کی گیند اندازی بھی کامیاب ثابت ہوئی

فٹ بال و کرکٹ ٹیم شمالی ہند کے دورہ پر جانے والی تھی لیکن مختلف جامعات سے کھیلوں کے سلسلہ میں جو مراسلت ہوئی تھی اس کا تشفی بخش جواب نہ آنے اور مقابلوں کا تعین نہ ہونے کے باعث دورہ مجبوراً ملتوی کرنا پڑا۔

ٹینس کلب صدر کلب جناب ڈاکٹر عبدالحق صاحب بہت زیادہ دلچسپی لیتے ہیں اور کلب کی مصروفیات میں طلبا کا کسی نہ کسی طرح ہاتھ بٹاتے رہتے ہیں ٹینس کی معتمدی کے لئے مسٹر یعقوب متعلم ال ال بی آخری کا انتخاب ہوا معتمد کی سرگرمی کے باعث ٹینس کلب میں خاصی دلچسپی رہی اور چھ کورٹس تیار کئے گئے تاکہ کھلاڑیوں کی کثیر تعداد مستفید ہو۔ اس پر بھی ممبروں کو کھیل کا کافی موقع نہ ملنے کی ہمیشہ شکایت ہی رہی اس قسم کی دلچسپی آغاز سال ہی میں نہیں بلکہ امتحانات کے قریب تک رہی

مدراس لا کالج کی ٹیم کے ساتھ طاہر اور حفیظ حقانی نے سنگلس میں علیحدہ مقابلہ کیا۔ طاہر نے اپنے مخالف کو ۶-۴ پر شکست دی اور حفیظ اور ان کے مخالف برابر رہے۔ اور تنگیٔ وقت کے باعث مزید سٹس کھیلے نہ جاسکے۔ طاہر جامعہ کے اچھے کھلاڑی ہیں اور ان سے بہترین توقعات وابستہ ہیں۔ کل ہند اورنگ آباد ٹورنمنٹ میں حفیظ حقانی نے نیل کنڈن جیسے تجربہ کار کھلاڑی پر شاندار فتح حاصل کی۔ حفیظ حقانی بہت ہی کمسن کھلاڑی ہیں اور اپنے کھیل کا دل خوش کن مظاہرہ کرتے ہیں۔ عثمانیہ بین الکلیاتی ٹورنمنٹ ڈیوس کپ کے اصول پر کھیلا گیا جس میں میڈیکل کالج نے تین سنگلس میں کامیابی حاصل کی اور جامعہ عثمانیہ ایک سنگلس اور ایک ڈبلس میں کامیاب ہوئی اس طرح سے بحیثیت مجموعی میڈیکل کالج کی جیت رہی۔

فٹ بال کلب پروفیسر تریدی کے گھوش نے کلب کی مصروفیتوں میں کافی دلچسپی کا اظہار کیا اور فٹ بال کا معیار بڑھانے کی کامیاب کوشش کی۔ اشرف اور مصلح الدین نے کپتانی اور معتمدی کے فرائض مستعدی کے ساتھ انجام دیے۔ اشرف صرف فٹ بال ہی میں نہیں بلکہ دیگر کھیلوں میں بھی کافی دستگاہ رکھتے ہیں اور اپنے کھیل کا خوب مظاہرہ کرتے ہیں۔ مدراس یونیورسٹی کی ٹیم کے مقابلے میں ہماری فٹ بال ٹیم نے تین گول سے کامیابی حاصل کی۔ بین الکلیاتی ٹورنامنٹ میں بھی آخری مقابلہ میں کامیاب رہی اور اسی طرح کل ہند اورنگ آباد ٹورنمنٹ میں بھی ٹیم نے شاندار کامیابی حاصل کی اور اپنے کھیل کا بہترین مظاہرہ کیا۔ کپتان کی گہری دلچسپی اور سرگرمی کا نتیجہ ہے کہ فٹ بال ٹیم نے مختلف مقابلوں اور ٹورنامنٹوں میں شاندار کامیابی حاصل کی ان مقابلوں میں امجد خلیل، یعقوب شریف اور افتخار کا کھیل بہت کامیاب رہا۔ اور مقصود اور

کریم نے ٹیم کو بہت تقویت پہونچائی۔ خلیل اور امجد کو اپنے کھیل کے بہترین مظاہرہ کے صلہ میں کلرس عطا کئے گئے۔ مصلح الدین صاحب نے کھلاڑیوں کو ممکنہ سہولتیں بہم پہونچائی ہیں ٹیم کی کامیابیوں میں مصلح الدین کی کوششوں کو بڑا دخل ہے۔

ہاکی پروفیسر برکت اللہ صاحب نے بطور خاص ہاکی کی طرف اپنی توجہ مبذول فرمائی اور کھلاڑیوں کی بہت اچھی تربیت کی اس طرح سے ہاکی ٹیم نے بھی مقابلوں کی کامیابی کا بہت اچھا تناسب قایم رکھا۔ اور دیگر مقابلوں کے سوا اندھرا یونیورسٹی کے مقابلہ میں (۸) گول سے کامیابی حاصل کی۔ بین الکلیاتی ٹورنمنٹ میں میڈیکل کالج اور سٹی کالج کے مقابلہ میں کامیاب رہی لیکن سمی فائنل میں جاگیردار کالج سے ہار گئی عین موقع پر ہاکی کپتان نے کالج کو خیرباد کہہ دیا لیکن ضیاء الحق نے مستعدی اور کپتانی کے فرایض بہ احسن الوجوہ انجام دیے۔ مقابلوں میں امجد، ضیاء، شبیر نے اچھا مظاہرہ کیا اور تینوں کھلاڑیوں کو معیاری کھیل کے باعث کلرس عطا کئے گئے۔

اسپورٹس اسپورٹس کے کپتان مسٹر خلیل اللہ ہیں جنھوں نے اسپورٹس کا معیار بڑھانے میں کافی سرگرمی دکھائی۔ یوم جامعہ کے سلسلے میں اسپورٹس اعلیٰ پیمانہ پر ہوئے۔ مقابلوں میں حصہ لینے والوں کی تعداد کافی تھی۔ جناب نائب معین امیر جامعہ بہ نفس نفیس میدان میں گھومتے اور مقابلوں سے محظوظ ہوتے رہے۔ رسہ کشی کا مقابلہ اساتذہ اور طلبا میں بڑا دلچسپ رہا۔ اسپورٹس کا چمپین شپ کپ خلیل نے حاصل کیا جو مبارکباد کے قابل ہے۔

بین الکلیاتی اسپورٹس میں گولہ اندازی میں شمس الدین اور ضامن علی دوم و سوم رہے۔ ہرڈلس ریس میں خلیل دوم آئے رسہ کشی میں بھی ہماری ٹیم فائنل تک دوسرے کالجوں کو بہ آسانی جیتتی ہوئی آئی لیکن سٹی کالج کے مقابلہ میں ناکام رہی جو حقیقی معنوں میں ہار نہیں ہے بلکہ مادر جامعہ کی جانب سے فرزند جامعہ کے لئے ایک طرح کی حوصلہ افزائی ہے۔

کشتی رانی پروفیسر تری کے گھوش کی توجہ اور دلچسپیوں کے باعث ہمارے ہاں بھی بوٹنگ کلب کا افتتاح عمل میں آیا ہے جس میں طلبا کافی تعداد میں حصہ لے رہے ہیں۔ توقع ہے کہ کچھ دنوں میں طلبا بلند معیار پر کشتی رانی میں مہارت حاصل کرلیں گے۔ کشتی رانی کے کپتان ضیاء الحق صاحب منتخب ہوئے جو کافی دلچسپی کے ساتھ اپنے فرایض انجام دیتے ہیں۔

Bowling Averages.

NAME.	Runs allowed.	Wickets captured.	Average.
Jawwad Hosain Khan..	390	33	11·7
Shivapal Kishen ..	353	25	14·2
Zakaullah Qureshi ..	478	32	15·3
Ali Mohamed ..	332	19	16·5

MULLICK ARJUN M. PATEL.

in the team, is an all rounder. He scored a lot of runs and captured many good wickets during the season.

Sirajuddin Ahmad's work behind the stumps throughout the season was excellent. He is an excellent opening bat and can be considered as one of the best wicket keepers in the State. Abbas Hosain is a safe opening bat. He piled up many runs throughout the season. Kutbuddin proved himself to be the best fielder in the team and as a batsman he contributed runs. Zakaullah who is a fast opening bowler is another all rounder. Ali Mohamed as an opening bowler did his best. Ansari, a new comer, assisted in the Inter College tournament. Besides these, mentioned above, other members participated whom we wish a successful cricket career.

Riasath Ali Mirza, the captain, has played good innings this season. Under his leadership the players exhibited good team work and spirit for which he should be commended.

We congragtulate our ex-captain Mr. E. B. Aibara for having participated and distinguished himself in the Bombay Pentangular. It is hoped that with little effort on his part he can earn a name for himself in first class cricket.

Above all we thank Prof. Hosain Ali Khan, our esteemed President, who takes particular interest and encourages us in the game.

The averages of the season are as follow :—

Batting Averages.

NAME.	Innings.	Most in an innings.	Average.
Syed Mohd. Husain ..	16	112 & 103	30·6
Abbas Hosain ..	24	105	29·6
Zakaullah Qureshi ..	20	79	27·6
Riasath Ali Mirza ..	16	81	20·2
Ashraf Ali Khan ..	12	102	20·1
Shivapal Kishen ..	23	55	19·1
Sirajuddin Ahmad ..	18	91	19·0
Jawwad Hosain Khan ..	17	54	17·1

Osmania University Cricket Club

REPORT FOR 1938 to 39.

As usual we opened the season with the elections for the offices of captain and secretary, and Messrs. Riasath Ali Mirza and Jawwad Husain Khan were unanimously elected as Captain and Secretary respectively. Altogether we played 23 Matches out of which 8 were won 12 were drawn, and only 3 were lost.

We met the Nizam College in the finals of the Salar Jüng Inter College tourney and won the trophy. The match was interesting from start to finish, and was so well contested that it was difficult to say who would win, even to the last moment. With a lead of 71 runs in the first innings, we begna our second innings disastrously, the first 8 wickets falling for a paltry 71. At this stage S. Md. Mohammad Husain, who was mainly responsible for winning the match, was in and played a hectic innings, scoring a flawless 112 and remained unbeaten.

We met the Bombay University in the Southern Zone finals of the Rohinton Baria Inter University Tournament. Though we lost the match it was encouraging to have put up a stubborn fight against the strongest of all the teams participating in the tournament, as is shown by the fact that the Bombay University has won the trophy by beating the Punjab University in the final. Jawwad Husain who stood first in the bowling analysis in the Inter College finals was again successful, capturing 8 wickets for 57 runs, and thus finishing first in bowling analysis in the match. We congratulate him on his excellent performances and wish him every success in his cricket career.

Ashraf Ali Khan, who scored a century in the Inter College semi-finals, is a very careful batsman and does not allow himself to be easily victimised. On many occasions he saved the team from losing. S. M. Hosain, the hero of the Inter College finals, is an experienced batsman and topped the list in batting averages. R. Shivapal Kishen, the only left hander

These devices of Hastings may be as vehemently condemned from a moral point of view as possible yet we have to acknowledge that the prestige of the company could not be saved at that time by any other means.

These are the glorious achievements of Hastings which give him a place in the first rank of the English statesmen.

SYED BAQIR RIZA WASTI, B. A.

never forget this great and unique service of Warren Hastings. No unprejudiced and cool-minded person can deny the fact that Hastings steered successfully the ship of the company out of a very dangerous storm. Hastings completely succeeded in his policy and all his actions were based upon selfless service of the company and his nation. He sacrificed all his selfish interests for the cause of the company. At the risk of his honour and renown he served his country.

Under the Regulating Act, a council of four members was established to advise the Governor General, who was made their President. All issues were decided by the majority of votes of the Council Members. Hastings had to struggle against great opposition on account of this Council. He was a member of a poor family and therefore his extraordinary rise made him unpopular in the eyes of the nobility. As such, those gentlemen were selected as the Council Members who did not like Hastings. From the very beginning, they opposed Hastings in every matter and for a few years he was entirely powerless. Hastings tolerated all these insults only for the service of his nation. He continued his work steadily and patiently. An ordinary man in his place would have tendered his resignation, but the self-reliance and sincerity of Hastings prompted him to disregard all hinderances, and in the end he overcame all his enemies.

The success of the company in the Maharatta and the Madras Wars depended upon its financial resources and it was required that the company should spend as large sums as possible upon its military establishment. But as mentioned above the financial condition of the company was so depressing that if Hastings could not obtain money through various means it would have been impossible for the company to continue these expensive Wars. He certainly extorted money from Chaith Sing of Benares and from the Begums of Oudh by illegal methods but he did it only under great pressure of most adverse circumstances

rule of the Company, but that it was inevitable for Parliament to supervise the actions of the Company. As such the company's petition for a loan afforded an opportunity to Parliament to interfere in the Company's affairs. Lord North the then Prime Minister, agreed to grant the loan on the condition that the company should first of all accept the principle of Parliament's supervision over all its affairs. The company had to accept this condition and thus the Regulating Act was enforced by the Parliament in 1774.

This Regulating Act was very obscure and incomplete and the company had to face great difficulties for it. Though this Act made Warren Hastings, Governor General of all the company's possessions in India, yet the Governors of Bombay and Madras could deal with the native states directly in times of urgent need. It was quite automatic for the Governors of Bombay and Madras to envy the overpowering authority of Hastings and resent it. There was none in India to judge the differences of opinion arising between the Governor General and the Governors. As a result of this Hastings had to suffer from the weakness of the Act and he was inevitably involved in the first Marhatta War and the first Madras War through the aggressive and harmful policies of the Governors. These wars affected the company's budget gravely. Had Hastings not proved his fearless courage and unswerving steadfastness at that critical time, Nana Farnavees and Hyder Ali were such formidable enemies that they would have never rested till the complete destruction of the company. It were only the statesmanship, experience, inherent freedom from fear, firm resolution and sincere patriotism of Hastings which saved the company from these two most powerful enemies at such a critical moment when the company had become nearly bankrupt. It is a fact that the company not could have achieved any victory in these wars yet the policy of Hastings maintained the prestige and renown of the Company in India and enabled it to weaken its enemies gradually and suppress their power. Englishmen can

laid the foundation of the existing Administration of India. No doubt there were many defects in this work but it would be certainly an injustice to the company, if we expected a better administration from it at that time.

Having established Civil Administration Hastings turned his attention to the very difficult and most important task of improving the budget of the company. The dividends of the company had been continuously falling for the last few years and it was still regarded in England as a purely commercial enterprise. The only aim of its share-holders was to gain profit and they were not farsighted enough to sustain a loss for a few years in the hope of getting enormous gains in future. And as such the Board of Directors instructed Hastings to curtail the expenses of administration to the minimum. Even in this laborious and courageous work Hastings acted with great sagacity and wisdom and fulfilled the wishes of the Company. He reduced to half the pension of the Nawab of Bengal and entirely discontinued to pay the sum of 26 Lakhs of Rupees to Shah Alam, the King of Delhi on the grounds that he had left the residence of Allahabad and submitted himself to the protection of the Mahrattas. The Districts of Allahabad and Karra were also forfeited from the possession of Shah Alam and conferred upon Nawab Vazier of Oudh in return for a sum of 50 Lakhs of Rupees, and Hastings rendered military help to the same Nawab in his struggle with the Rohillas at a compensation of forty Lakhs of Rupees. Yet inspite of all these devices, the company underwent a loss and it submitted a pension to Parliament for a loan of ten million sterling.

It was a time when the employees of the Company were growing rich though the company's treasury was empty. There prevailed a general feeling of dislike against the newly rich servants of the company. Moreover the idea was also acquiring popularity in England that it was not advisable to leave such vast and wealthy provinces as Bengal and Behar under the autocratic

entrusted to him the great task of improving and reforming the whole administration.

It is an evident proof of Warren Hastings's natural talents and sterling worth that he started his career in a very low position and rose to the highest office. At a time of great chaos and disorder, when all employees of the company were indulged in bribery, in amassing as much wealth as possible by private business, and preferred their own individual welfare to that of the company, Warren Hastings was the only man who was free from all these faults to a large extent. The company, therefore, took a wise step in the selection of Hastings as Governor-General, who through his selfless services and untiring efforts succeeded in achieving the expectations of the Company.

Having taken over the charge of the Governorship of Bengal, Hastings first of all devoted his full attention to the civil administration. The thing which required his most attention was the establishment of full criminal and civil powers. He openly brought an end to the dual system and took all affairs into his own hands. Mohammad Raza Khan and Shitala Rai were the agents of the Nabob for maintaining peace and order. Hastings dismissed them both and appointed English collectors, giving them civil and criminal powers. The collector had a control over the Police also. One collector was appointed in each District. As there were no courts existing at that time, Hastings gave judicial powers to the Collectors. One Criminal High Court and one Civil High Court were established in Calcutta. Kazis, Muftis and Pandits were appointed in these Courts to do justice according to the Shara-i-Shareef and the shastras, but certian English and Indian laws were enforced in criminal cases. He established a Board of Revenue for fixing the revenue of Bengal, Behar and Orissa so that lands might be given to the local Zamindars on a contract system at the rates fixed by this Board. Formerly these Zamindars had criminal jurisdiction but Hastings took away these powers from them. Thus Hastings

policy proved to be an utter failure. Within three or four years, the fatal greed and unjust measures of the inexperienced employees of the East India Company did not only reduce the fertile and prosperous Provinces of Bengal and Behar to miserable condition but the company itself had to incur a great financial loss. Many English historians have mentioned the unbearable exploitation and plunder of these Englishmen but in the words of Keene. "Divine wrath was added to the oppression and extortion of man". Owing to the lack of rains in 1769, the crops failed. It is a common occurence in India to have no produce sometimes on account of insufficient rainfall and the government should not be blamed for it; but in former days the peasants were generally prosperous and they always had a sufficient stock of food-crops in store that the failure of one or two crops did not prove so disastrous. On the other hand, in the beginning of the rule of the company, due to the failure of only one rainy season, a dreadful famine broke out. Those parts of the country only suffered most, which had recently come under the sway of the company. One-third of the people of Bengal perished in this one famine, according to English accounts, the fertile land of Bengal could not recover from this heavy loss for many years. Notwithstanding this great calamity, the servants of the company extorted full amounts of revenue from land-holders upto the very last pie. They used intolerable force in this extortion and Hastings himself confesses the tyranny of their methods. This enhanced greatly the already existing chaos in the country. The root cause of this mal-administration was that a foreign company had full control over the finance while the poor nabab was held responsible for carrying out the administration. The Nabab was quite unfit to carry on the government and in addition to it, he had no money for the purpose. As such the company had no other option than to accept the responsibility for the administration together with the responsibility for finances. In 1772, the company appointed Hastings as Governor of Bengal and

Warren Hastings

(As a founder of the British Empire in India)

In any country the rule of a foreign nation is not established only by making conquests in battles but it gains stability when the victors succeed in maintaining a good administration in the conquered country. This is a great distinction between Mahmud Ghaznavi and Mohammad Ghori, the former defeated the Indians in the battlefields only and did not try to establish his permanent rule in India, while the latter, on the contrary, laid the foundations of his Empire in this country. Kutbuddin Aibak, the Governor of Mohammad Ghori turned out to be the first Muslim King of India and as such Ghori and Aibak are justly called the founders of the Muslim rule in our country.

The English East India Company acquired the same position in the 18th Century. Having been victorious in the battles of Plassey and of Baksar, Clive succeeded in obtaining the Diwani of Bengal, Behar and Orissa from Shah Alam, the then King of Delhi. Thus, Clive laid the foundations of the British Empire in India. Yet, even he could not succeed in establishing a successful administration in these Provinces. This great honour and enviable glory belong to Hastings alone in that he is the pioneer British administrator of India. It was undoubtedly due to the ceaseless efforts, unswerving persistently and undaunted courage of Warren Hastings that the grand palace of British Empire was erected upon the weak foundations laid by Clive. It is, therefore, quite justified to look upon Hastings as one of the founders of the British Empire in India.

Soon after the return of Clive from India, chaos prevailed in the administration of the East India Company. Clives dual

approaching and we had nothing in our thermos or in our water bottles.

My friend said "Misfortunes never come singly but in battalion." With great difficulty we managed to reach a hut and passed a weary night there.

For twelve hours we were in the hut. The poor peasant, his wife and children helped us a great deal in our difficulty.

Early in the morning we could see three cars and one lorry going to Bombay. We stopped the lorry and arranged to take our machine back to Bombay for repairs. The lorry driver charged us very heavily. After reaching Bombay we repaired our machine and again started to Nasik. We stayed there for a few hours, but when we were nearing Malagoan our machine was again spoiled. Even in these critical circumstances my friend never left me. He said "man proposes and machine disposes!" When our machine started giving trouble we had to drop the idea of touring India and we had no other option except to take the train. We caught the train from Manmad Junction and reached home safely with our sick motorcycle.

MOHD. ABDUL LATEEF,
(L. L. B. Previous.)

on a pillion seat, and sang many songs to lighten the troubles of the road. By 6 p.m. we reached Poona city. In this city fortune did not favour us. We were without any kind of hospitality. The inhabitants of Poona city instead of guiding us looked with curious eyes and simply showed us the gates of the hotels. We spent the night in one of the hotels and started the next morning for Bombay. After 70 or 80 miles we had to cross the ghats. The roads on the ghats are very dangerous, but we were steady enough to cross safely. The gigantic hills and the approach to Bombay inspired us to reach the city as soon as possible. Due to the gradual slopes of the ghats we had to keep our feet on the brake, and in doing so lost the catch of the brake. Thus we reached Bombay without brakes.

We had sad experiences in Bombay. We stayed there for a couple of weeks, by which time we had completely over-hauled our machine and started for Agra, some seven hundred miles away.

The journey from Bombay to Agra never gave us a chance to go further. We suffered a lot of misfortunes and troubles. At the very start we were guided wrongly. After covering two hundred miles we had to come back again to the same road and again start for Agra.

By the time we had covered 200 miles we met with a serious accident. As we were going at a slow speed a bull charged us from the front and we were nearly wounded by the big horns of the bull. But we were able to throw the motor-cycle. Our motorcycle was lying down and the machine was working but the bull was ferocious enough to fight with it. After a few seconds the machine stopped and the bull went away. We thanked God for our narrow escape, but the machine gave us great trouble. The rockers were broken into two pieces and the piston was jammed. At this critical hour we were all alone in the midst of the quiet jungle. Evening was

Gulbarga safe. In Gulbarga we had a very good time. To our great luck, we met two Osmanians. They were kind enough to guide us and help us in every respect. Our College friends introduced us to many Gulbarga officers. The officers were very pleased and encouraged us to make a successful tour round India. The very evening a tea party was given by the officers of the District. After this was over we determined to show some acrobatic feats on the motorbicycle.

Nearby there was a good ground; and with the help of my friend I could show some tricks on the motor cycle. It was probably the first time for them to behold extraordinary tricks of this kind, for most of the spectators were very much impressed by our tricks. Among the many tricks, one was this:—

The machine was going at a moderate speed, and on the running machine I stood up on the seat, taking my friend on my shoulders, and showed the steadiness of my balance. This trick impressed them greatly. Many of them begged us not to do such risky things. The next morning we left Gulbarga amidst cheers and within two hours we were seen on the borders of Nizam's dominions.

In one long stretch we found ourselves near Humnabad Customs office. The police man of Nizam's Government showed a red signal and we were made to stop for inquiry. As we had ground our way for several miles in bottom gear, the engine was actually boiling but by the time we had taken our light breakfast the machine was ready again. Again at the same speed we made for Sholapur. But on our way we experienced very many difficulties. Owing to the bad roads our bodies were painful. In Sholapur also we had the same reception as we had in Bidar and Gulbarga. We took our lunch at 2-30 and made our way direct to Poona. This was of course a long and tedious way for us. But my friend Masood was sporting enough to keep a cheerful countenance. He did all the mischief that he could possibly do

The hand shakes were soon over, and we two jumped upon our motor cycle. We turned in our saddle and gave a wave of the hand to those watching us, and so we were off.

Our motor cycle was very good and very noisy. It was a seven horse power Rudge Ulster Racing model. We had our light bedding and a suit case tied to the rear mud-guard, and stuffed the leather bags at the sides with all the repairing materials. The dress we wore was very comic. It was a brown military dress guaranteed by the tailor to wear for ever. On both our shoulders we had thermos flasks and water bottles. We appeared as if going to a war. Before dawn we had covered thirty miles. The scene was singularly romantic. The calm and serene atmosphere was rudely disturbed by the terrible noise of the machine. As we were passing small villages the ploughmen slouching to their work stood still and gazed at us.

In one long stretch we covered a distance of a hundred miles. The morning cleared from grey to bright. The roads were fairly good, but the red dust of Bidar made our machine and our clothes appear all the more romantic.

The first stoppage we made was at Bidar, where we had our breakfast. My friend Masood had a gift of making friends with strangers. As we entered the Bidar Bazaar everybody gazed at us and when we stopped the machine the people came round us. My friend inquired the whereabouts of the Tahsildar or Taluqdar of the district. A man very kindly guided us to the Tahsildar's bungalow. The Tahsildar came out from his house and cordially welcomed us. My friend introduced himself and told him that we were unemployed graduates of the Osmania University and intended touring India. He was surprised to hear such a bold attempt and appreciated our courage. He then cordially invited us to breakfast, and after breakfast was over, we jumped again on our machine and thanked him for his kind hospitality. By 2 p. m. we were able to reach

"Our Motor Cycle trip to Bombay & Agra"

Among all the modern inventions that have caught the fancy of the youth one of the most popular is the motor cycle.

No vehicle is more sporting and more pleasure-giving than the motorcycle. It seems as if it has been particularly meant for young people in the full flush of their powers. The rhythm of the machine seems to synchronise with the beating of the young heart.

In days gone by a good rider on a good horse use to captivate the eyes of the public. Now aged eyes are pleased to see a young fellow going by on a noisy motorcycle at a terrible speed.

To enjoy riding a motorcycle, one must go for long trips as we did last year. One of my friends being very much interested in motorcycling, proposed that we should both go together to Bombay and Agra.

The idea so delighted me that I at once took fire. We started the next morning despite good advice, kindly meant and kindly offered by many of my friends and relatives against such a long trip. Half a dozen courageous fellows dragged themselves out of bed at the abnormally early hour of 5 a.m. and came along, unwashed and uncombed, to bid us farewell.

"Goodbye, old chap", said one.

"Take care of yourselves," said another. "Don't break your necks while breaking the record," said a third.

None the less, he readily went and slept in that room.

As evening drew, he ordered a bed to be set for himself in the front of the apartment, and called for his spectacles, note book and a lamp. All the people departed to the other rooms, and he applied his soul, eyes, hand to composition. In the beginning there was the universalsilence of the night. Immediately the apparitions appeared with shaking of irons and clanking of chains, yet he never raised his eyes, but burdened his soul, and deafened his ears.

The noise grew, and now it seemed to be heard at the door, and next inside the room. He lifted his head and saw and recognised the figures he had been told of. They were signalling to him. They kept rattling their chains over his head. On, looking round again, he saw they were beckoning to him as before and he without delay took up the light and followed them. They moved with great speed, and having pointed to a spot vanished suddenly and left his company. On being thus left alone, he marked the spot with his pencil.

Next morning he applied to the district magistrate and the spot was dug up. A bundle of letters was found, and upon reading the letters it was known that the girl and the boy had loved each other passionately. But the girl was forced to marry another man which she refused. The girl and her lover drank poison and were found dead in the very room. Next morning the old man on hearing the tragic death of his only daughter also committed suicide. Thus the three restless spirits wandered over the earth.

A Haunted House

SHAHARBANO NAQVI, B. A. (Senior)

There is at Jalna a house, grand and spacious, but evil-reputed, where, if anyone lives, he is sure to fall ill. Some years ago we were at Jalna, and we heard several strange and terrifying stories about the house.

A milkman while milking the cow would relate peculiar stories which he himself had heard from the residents in the house.

Some time ago, he said, some people had rented the house. In the dead of night a noise like a clanking of chains was heard. Shortly after a Spectre appeared—an old man with a long snowy beard, and hunch-back. In his hands he held two burning torches, wearing fetters on his hands and shackles on his legs. Behind him appeared a beautiful pair—a bride and a bridegroom in wedding costume, and they looked astonished and restless. The old man greeted them and they sat down in a corner of the room. After some time the old man beat a drum and the pair started to dance round and round in the room till morning. At cock crow all of them disappeared, shrieking and shouting.

After this the inmates by reason of their fears, spent miserable and horrible nights in sleeplessness. The want of sleep was soon followed by illness, and their terror increased till they died. Though the apparitions departed, yet some uncanny atmosphere remained.

It happened some two or three months after, that, a relative of the people came and stayed with them. That room was deserted and condemned to solitude, entirely abandoned to the dreadful ghost. When the new comer was informed of the matter he made inquiries and learned all particulars,

sticks tied to the end of the central bamboo are made to rest on the enclosure. Dried mass and leaves are used to fill in the gaps. Huts thus made are quite rainproof but as there are no ventilators or windows the huts are dark and close,—made closer and stuffier by the smoke of the eternal fire which keeps burning, there being no chimney.

AKBAR H. LATIF,
SENIOR B. A.

In the Chinchu society there is no priest, but there are a number of deities who enjoy a tremendous amount of power. Akas Amma, Bhumi Amma, Talli Amma. Some time back a fourth deity was added to the number already existing—Lingum. The people have unbounded faith in Lingum. A story is told how the people of one Penta, (hamlet) having robbed another Penta of its stored roots, the latter kindled a fire and appealed to the Lingum for redress. Their prayers were answered for the thieves were soon in the grip of a relentless disease, and not till all the loot had been handed back did the outraged 'God' relent and the people get well.

The festivals observed by these people can be counted on one's fingers, but whenever feasts are celebrated, drinking and dancing are the order of the day. Of all the festivals there is only one—the Ugadi feast which is a sort of yearly fixture, the feast taking place about the same time every year—when the Ugadi trees flower. There is one feast among them known as Shiva's feast or Shivaratri, which takes place whenever a panther or a tiger is seen.

A Chinchu tribe is divided into a number of families, and six or seven families live together and form what is called a Penta. Every Penta has its own hunting ground and no intrusion is tolerated. Marriages among them take place easily, as soon as a couple are adolescent. Some are love marriages while others on the results of parents, friendship or ambition. After marriage the girl goes to her mother-in-law's house while the husband builds his own hut and lives by himself till he has learned to earn his living.

The dwellings of the Chinchus are what are generally called 'pointed huts'. These are made in the following manner: a thick stick is planted in the ground, and with this as centre and a radius of about 10 ft. or so, an enclosure of bamboo sticks, about four feet in height, is made. Then long bamboo

The plateau is inhabited by a race of people who speak the Telugu language and are known as the Chinchus. Both men and women are short of stature and in fact, I hardly met a man whose height was more than five feet five inches. They are weak and of poor physique and so thin that one wonders how they have managed to stand at all. They have extremely curly hair like that of the negroes which they tie up behind in knots. So uncivilised are they that they let their nails grow till they become a nuisance and then break them off!

The Chinchu men and women were until recently said to lead a simple Adam and Eve existence, eating herbs and roots and wearing no clothes. But, for some time now, the men have taken to wearing langoties and dhoties, and occasionally throw a shawl over their shoulders. This last serves two purposes. It is a covering as well as a cushion. The Langoti is kept in band of fibre or a thin strip of goatskin. Struck in the girdle are short knives and flints for making fire. 'Clothing' among the women varies: some sport a short wrapping about the middle and hardly covering the knees and no bodice and others, ample saries and tight fittings bodices. Like all women, they are fond of ornaments but being poor have necklaces and bracelets only of beads and cowries. The children run quite naked except for the tiny piece of cloth in front.

The Chinchus are not what we should call a clean people. Except for cooking and drink purposes they use no water; and, as a matter of fact, they neither wash their faces nor bathe.

There is a division of labour among the Chinchus, but it is to a degree like that existing in Burma. The women do the real work; go out into the forest and collect provisions, roots and fruits and vegetables; while the men stay at home, look after the children and make bamboo baskets. Sometimes however the men go out with their bows and arrows to shoot birds and animals and rats or to extract honey. But as a rule the women do the active work.

Farhabad

It was with great pleasure that I heard some months ago that the Government of Hyderabad had at last fixed upon Farhabad as the future hill station of the State. And it was high time too for the premier State of India to have a summer resort of its own. Up to now the well-to-do, the Jagirdars and Nobles of the state have been accustomed to frequent the famous hill stations of India, Ooty, Mahableshwar, Mussourie Simla, etc. from sheer necessity. Excursions to such places are all very well for the wealthy or for people of small families, but people of the middle class simply cannot afford to go to such expensive places. One of the arguments against Hyderabad possessing a hill station was, I remember, that people who wish to go out for a real change would rather go to some place out of Hyderabad and have a complete change of air than save a little money and not have a complete change. However that may be, whether Hyderabad possesses or does not possess a hill station means much more to people of a middling state of life than the people with huge incomes who do not know what to do with them. The small man, the 'average man', wants a change as well as the big man, and this being so, I believe any scheme of forming a local hill station will be a great success.

Farhabad is a forest plateau 2872 ft. above sea level and lies in the Nalumalin Hills in the Mahboobnagar district. The vegetation of the place is varied and abundant, and the air is full of the scent of flowering shrubs. Although as yet no statistics can be obtained as to the average rain fall, the inhabitants of the place assert that it is abundant. As regards fauna, neither big game nor small is scarce, and game like the tiger, the sambhar and the antelope is said to be found in large quantities.

house in the most comfortable way. Here the greatest lesson a girl can learn is that she must spend as much as her purse can allow. She must cut the coat according to the cloth.

(d) Camp for Health:In this camp women are taught the fundamental principles of hygiene, and the necessary daily exercises for the good of the health. Playing games and taking exercise is compulsory.

The women are no doubt given sufficient education and taught their domestic science but the behaviour of men towards the women is certainly condescending and contemptuous. The voice of Nietzsche "Then goest to see a woman? Forget not to take thy whip," it seems, is still echoing in their hearts. But the Nazis have come to realise the importance of motherhood. Hitler himself confers that the mother is the builder and shaper of the soul of her children in the most decisive years of its life—between the fourth and seventh years of age. The Nazis have written large across their banners the old adage:

"*From out the children's room the world is ruled*".

S. K. SINHA.
III Year Arts,

nourish the bodies of their children and must shape the infantile mind to accept Nazi ideas and attitudes in all things. The German woman is the mother of the "Third Reich". As the soil must be cleared, drained, seeded, and harvested, so the children must be reared, made string and healthy, by her.

The Nazis are proud that they regard women as the peasant regards his cow. The core of Nazi theory on women runs as follows: "Woman serves the man, man serves the state, the state must become great. Hence women are to perform "the duty of motherhood" which means the increase of child production. If a man's world is the state, the women's world is her husband, her family, her children and her home for what would become of the greater world, if there were no one to tend and care for the smaller one? The greater world is built upon the very foundation of this smaller world".

The girls of Germany are not trained to be soldiers as in Russia but to take care of the soldiers. But taking care of soldiers means learning early the duties of the house-wife and mother. For this purpose there are three educational units :—

(a) The Rural Camp: To train all village women in all matters relating to agricultural settlements, farms, fields, gardens and barns.

(b) Settlement Work Camp: To actually assist the settlers and peasants in their work, i.e., to get a practical training in rural problems.

(c) Camp for Social Welfare Work: Here the girls are trained in household work. It is deemed necessary to undergo this training as compulsory for every woman. This camp consists of many departments, for example, needle work, cooking, hygiene, etc. They are also taught how to maintain a

The Status of Women under the Nazis

It was in the eighteenth century, the seed time of modern ideas, that our grandfathers became conscious of a discordant break in the traditional conception of women's status. The vague cries of Justice, Freedom, and Equality, which were then hurled about the world, were here and there energetically applied to women. People like Mill, Owen, Sand and Marx advocated the emancipation and suffrage of women with the result that after a few years of toil and labour, women all over the world woke up from their deep slumber and came out into the field of struggle as aspirants to freedom and equality.

The contagion of this movement spread all over the world, especially to England, America, and Russia. Women in these countries became not only free from the exploitation of their husbands and fathers but had their liberty in almost every field of activity, of whether economic, social, or political. They got the franchise and suffrage, the option of choosing their husbands for themselves and freedom of action and thought. But this political freedom which made such progress in England, America, and Russia, did not find favour in Germany. The words of the cynical philosopher Schopenhaur, that women are born to grow beautiful and "to capture the fancy of some man to such a degree that he is hurried away into undertaking the honourable care of them", still echo in the minds of Germans. As such they most proudly confess, that home is their sphere, and bearing and training their children their real world and happiness.

The Nazi philosophy lays upon the women two duties which they must perform for the state. They must generate and

from the haunt of the bustle of life. They exert a gradual but irresistible influence on our personalities, since it is through their guidance that we launch into the activities of a practical life. For those who are endowed with a sensibility of soul, books in general and those of poetry in particular, are the genial friends, whose association always contributes to their joy and satisfaction, and animates their mental powers to create new channels of thought. It is the perusal of books alone, which gives a finishing touch to the accomplishments of a man, and provides him with that potential weapon which serves to bestow upon him a glorious success in practical life.

MOHD. NAIMUDDIN SIDDIQI,
JUNIOR B. A.

So much about the authors. I must confess that inspite of a thirst for knowledge and a relish for books of refined literature, I am not yet acquainted with the ancient literature, which has served to constitute and mould the culture, in its highly developed form. Of course the ancient literature has exercised indirectly and gradually an irresistible influence upon our own civilization.

To trace the history of the world, we must necessarily have regard to the literature in various epochs and ages. The works of political thinkers and philosophers in particular should be considered of great importance; since it is their theories and thoughts which give birth to new trends in the political and social order of the world. It was under this impression that I read Rousseau and Karl Marx, both of whom have exercised a most irresistible influence on the French and Russian Revolutions respectively, and are thus to be regarded as the generators of civilizations. Rousseau's 'Social Contract' and Marx's 'Capital' are marked with a convincing force of expression and a miraculous conciseness and brevity with which these immortals have propounded and represented their theories. They have rebelled in vehement terms against the order of society, have laid the foundation of a new era, and have created new worlds out of their thoughts. In this respect they were saviours of humanity. It is through their works that we come to realize the importance of books in the formation of new trends of thought, which consequently lead to social and political changes.

Thus books are not merely the favourites of the so-called visionaries. On the contrary, they are the most potential factors in our life. Through them changes are brought about not only in national life but in the life of individuals also. It is through books that we receive our inspirations. They irradiate our inner vision, and contribute to make us a successful man and good citizens.

In short, books are a world in themselves. They are the most favourite friends of those who want to live a secluded life,

beauty of poetry, will always prefer it to other divisions of literature. But no other poet leaves upon my mind such an ineffaceable impression as Shelley does. It is the delicacy of his sentiment and the exquisite subtlety of his imagination which exalts him above all the poets of his age. A search for an ideal beauty and a yearning for a divine love are the pre-eminent features of his poetry.

However, I have not confined my study to poetry only—I attach equal importance to other divisions of literature also, such as history, politics and religion.

To confine my opinions to the English literature only, I must mention the name of Goldsmith as my favourite author. His frank humour and sympathy towards humanity—the qualities which have found expression in almost all of his works—exalt him in our eye. Then we come to know the particulars of his Bohemian and irregular life—a feature which, in the opinion of some critics, is a defect which can scarcely be over-looked, and has been, of course, brought into undue prominence—but nothing can lessen our esteem for him. To speak the truth, he has communicated to us all the miseries and vicissitudes of fortune which he himself experienced in his life. He attracts our attention all the time, and animates in us a realization of those feelings which are described in the guise of novel. I have read his Vicar of Wakefield many times over and over again, and have ever felt a peculiar fascination in this so-called "irregular novel". I have dwelt upon this "humble novelist" only with a view to show the esteem which I have towards him as a man and as a writer.

In the range of what is called general literature some other names may be mentioned. The sublimity of sentiment in Milton's Paradise Lost and the diverse feelings represented in Tennyson's 'In Memoriam' have particularly struck me,

The World of Books

Being temperamentally a lover of solitude, I have ever regarded books as my favourite companions. And of course one who is possessed of a keen response to the pleasures of reading books, may find a peculiar fascination in this occupation.

Books have been written in all ages and at all times. In fact they are the most valuable heritage in which nations may rightly take a pride. The perusal of books creates a new realm of thought and contemplation for us, and tends to contribute the expansion of our knowledge, as well as to the animation of an elevated joy and enlightenment.

It would be scarcely reasonable to think that a book-man is essentially a visionary. We find numerous examples in the history of the past as well as that of the present, of scholars who were at the same time men of action.

Having thus endeavoured to clear the position of my fraternity—namely that of bookmen—and to protest against the charges that are levelled against them, I must mention some of the characteristics of this occupation, which has hitherto been the dominant feature of my academic career.

Being keenly responsive to the influence which poetry exerts on the human soul, and the realm of meditation it creates for us, I have always favoured poets in particular, among all kinds of men of letters. And so poetry occupies the most eminent position in the range of my studies.

For one who is disgusted by the bustle and barbarism of a busy life, there is a peculiar allure in the strain of a poet. And I believe that those who possess a quick sensibility to the subtle

and self-interest, would bring the emancipator an immense accession of economic and strategic strength and provide her with a secure foothold on the Black Sea.

Thus with the creation of an independent Ukraine, the territorial ambitions of Germany in Europe would come to an end and it remains to be seen whether the Ukraine will be the big European issue in 1939.

M. MOINUDDIN, M. Sc.

Ruthenia is the only outlet to the Ukraine for Germany. After the Sudeten-German crisis, Czechoslovakia was brought completly under the Nazi sway which has helped Germany to a great extent in her aims in the Ukraine for providing a passage to Ruthenia. Domination of the Ukraine by Germany meant an unprecedented supremacy of Germany in the Middle and South East Europe. Italy could not possibly have remained the equal of Germany and that is why the demand of a common frontier in Rutheina by Hungary and Poland was encouraged by the Italian Government. With the help of a common Ukraine frontier in Ruthenia they wanted to establish a sort of barrier against Germany right from the Baltic Sea down to the Mediterranean, which would have been detrimental to the interests of Germany both in her aims for Nazi propaganda and expansion toward the East. Germany resented this demand and strongly opposed it.

The Ukraine apart from its resources of raw materials is of strategic importance to Germany in checking Communist propaganda and hence serves as a key point in its future undertakings. The long felt need of Germany to make itself self-sufficient economically would to a considerable extent be solved by the occupation of the Ukraine, the granary of Europe.

Russia too is not unaware of these developments. The Ukraine is now governed as a Federal Unit under the Soviet Republic. A small western part of it is under Polish administration. A regular Nazi propaganda is carried out and recently there has been a demand for the independence of the part of Ukraine under Polish administration. This is suspected to be a German move.

Poland, Rumania and the Balkan countries will never be safe if Germany gets a hold on the Ukraine. Russia would be specially hard hit since she would lose one-fifth of her population, the coal fields and industrial area and access to the Black Sea. An autonomous Ukraine linked to Germany by gratitude

With these considerations in view, Britain began to intervene in the Czechoslovakian question and tried to decide the matter through mutual compromise. The efforts ended in smoke. Hitler was becoming more and more defiant in his demands. The 1st of October was decided to be the last date for handing over the territory, otherwise Hitler would take it by force.

At this juncture the British Premier brought himself into contact with the German Dictator and arranged a conference to decide the question by means of negotiations between the great European powers are striving to maintain peace in Europe.

After the cession of Sudetenland the Republic had to yield to its neighbour. Thus Czechoslovakia is now to a considerable extent under Nazi influenee.

During the German-Czech tension, Hungary and Poland had also demanded the cession of their respective territories from the Republic. In a short time Poland was able to achieve its aim, but Hungary needed arbitration by Germany. The Vienna award was the outcome of talks between the powers and the arbitrators through which the demanded territories were ceded by the Republic.

Satisfied with their territorial gains Poland and Hungary began to demand a common frontier in Ruthenia or the so called Carpathian Ukraine. Italy afraid of the increasing influence of Germany in middle and South East Europe, supported the cause of Hungary and Poland in the common frontier problem. This gave rise to a bitter feeling among the powers which resulted in the recent tension between Germany and Poland on the problem of the Jewish drive in Germany. Many Polish Jews were to be expelled from Germany under unconditional orders and this led to the inauguration of Polish-Russian diplomatic talks, thereby opening a new page in the politics of Europe.

Ukraine

The position of Ulkraive under the modern polilical developments in Europe is growing more and more critical. This unexplored part of Europe with its immense agrioultural and mineral resources has been the goal of Nazi expansion in Eastern Europe. This idea of the German penetration in an easterly direction can be traced to the pre-war days, when a well known German strategist Hoffman chalked out a plan for Germany to expand its territories in the East rather than come into confliet with the powerful Democracies in the West. Hindenberg and his colleagues lent a deaf ear to this plan whereas Herr Hitler, the present Chancellor of the German Reich and the leader of the Nazi party is blindly following it.

The first step towards the execution of this plan is the Austrian annexation in the earlier months of 1938. This enabled Germany to commanding a greater in fluence in the Danubian countries both for economic and strategic purposes.

Czechoslovakia, under the influence of Russia and France, was a pricking thorn in Germany's territorial expansion. The country with a proud national spirit well equipped and strong never feared its powerful neighbours. The frontier of Czechoslovakia towards Germany was so well guarded that it served as a model for other powers of Europe to copy. With the annexation of Austria this frontier lost much of its importance. Germany's next demand was for the cession of the Sudetenland territory which was detached from Germany after the Great War and added to the Republic The tension had grown severe. Russia and France bound by treaties to the Czechoslovak Republic objected to it and were preparing to render help in case of a clash. A European War was hanging in the air. Britain could not possibly keep herself aloof. If France was brought in the battlefiled, Britain had to go to her help.

It would not be inappropriate if I concluded this article with the missing link of Darwin's theory. He is eccentric in his behaviour and foolish in his actions. He comes on the stage as a buffoon in social gatherings to entertain the eager audience.

"D'ARTAGNAN"
(OSMANIA.)

taining by his clever repartees and with sayings. He does not rag anybody himself but asks some one do it for him. Prominent among those who make fun of others for his delectation are the uncle and the nephew. The latter had been to a foreign university for two years and returned to his uncle altogether changed. Anyhow both of them have achieved the doubtful honour of being good at ragging.

There is an other man who stands head and shoulders above the rest in playing practical jokes on the freshers. He is proud of his follies and achievements in this particular field. His high spirits vanish if only he is reminded of his school life. He has adopted a false means of retaliating for an injury done to him.

It is worth while to say somethink about the leader of the opposition. He shows himself to be a Socialist and a man free from all narrow prejudices but one who studies his character deeply and observes his actions minutely finds him just the opposite of what he pretends to be. He adopts fair as well as foul means to gain his ends. But notwithstanding many obvious defects, his greatness as an orator is quite beyond dispute. Because of this he has gained many to his side. Fortunately or otherwise he has found a puppet who, being incapable of the responsibility entrusted to him dances to the tune of his leader.

Next comes a man who is supposed to be a good speaker in Urdu. Where the argument is loose he makes up by force of expression. He rather acts on the stage, in the old fashion of Indian actors, than makes a good speech. He has over estimated his powers and always betrays himself in abusing them.

A young man of fairly good countenance, who had his own reputation few years back, now rejected and dejected is content with becoming a taxi-driver. He asked me not to write anything about him in this article, but I could not refrain since I have written impartially about some of my dearest friends,

and the debater a fool 'who is ignorant of his policy.' The fun is he wishes to correct him 'who is obstinate and is never willing to be corrected.' He is fond of satirizing those who differ from him not because he is of a vicious nature but simply because he finds it easier to write a satire than anything else.

Then there is another man, having nothing in common with the former except the name. He is proud of having no friends, and speaks harshly of those who have any. He has a peculiar conception of life and thinks that school or college life is not for friendship and that the time for friendship begins just after college life ends. He does not like most people and most people do not like him. He is not amiable nor friendly in his behaviour. He really possesses much book-learning and erudition. But he will leave college with his taste unrefined and his character not formed. He is considered a diamond shining in a coal mine by those who like him. But those who have a scientific outlook and a saner attitude to life consider him no better than an allotropic modification of carbon.

There comes another man shaking hands with one and all in the corridors. He is popular but no body can assign any good reason for it. He is indeed an efficient canvasser but he only canvasses among the freshers. This qualification has stood him in good stead in securing many posts. If nothing else, he knows the constitution of the institution in which he has worked since his admission to the college.

His assistant is an equally good man possessing almost all the qualifications of the former except a year's seniority.

Who is this man with the coloured glasses? Are his eyes too sensitive or does he stare at objects of beauty through the glasses? Perhaps the latter. Why does he fight shy of the company of students in spite of his long stay of five years in the University? He associates only with the favoured few, and he spends his leisure hours with them in the college, enter-

Personalities

(Continued)

This is a companion article to "personalities published in the last issue of the Osmania Magazine. At the very outset I should like to make it quite clear that in both these articles we have included only a very small number of personalities. As the years roll on and new personalities enter our college to take the place of the old ones, similar articles will be needed to deal with them. As far as this article is concerned I would say that it is neither my purpose to ridicule these persons nor to force their faults and weaknesses into the limelight, but to portray their characters from the point of view of the majority of their contemporaries. Hence I should not be afraid of any errors of judgment for I am not a judge but one who faithfully transcribes the statements of the Witnesses.

Let me start by saying some thing about the judge himself. He is a young man with an attractive face who walks like a lady and writes like an angel. He is never seen single but is always accompanied by his bosom friend. One can safely prophesy that this pair due to greater zeal and purer motives might one day overtake 'the international pair' in the race of affection and might achieve even greater fame than the classical pair, David and Jonathan. This Jonathan with whom our judge is always seen is simple-minded and childish and yet exercises a great influence over the character of David. As a result of this the judge now takes interest in trifles, hates sober discussions while political subjects do not attract his attention. Thus he can lend his ear to nothing except to gossip about actors and actresses; glances at nothing except the latest picture from Hollywood. Apart from this, any discussion is foolish

curing many diseases by the herbs which they bring from the forest and so well can they do this that even a doctor who has spent more than half of his life in the study of medicine, can do no better. Many of them are perfect in the art of finding, from the face of the earth, whether there is water near or at a great depth, which a geologist can only do after studying for a number of years and spending a large sum of money and amount of energy in the acquisition of this knowledge.

Hunting, which in cities, is enjoyed by those who are well to do, is a common, every-day business for the foresters. They have neither guns nor bullets. Their hunting is on a more elaborate basis. Hunting a tiger which is a very great act of bravery for most people, is a very ordinary thing for the forester. What he does is simple and easy to understand. As soon as a tiger is seen coming towards him, the forester, having an open-work basket meant for carrying grass, leans against the bark of a strong tree. The man sits under the basket with a big knife in his hand. As soon as the tiger jumps to attack him, the man underneath the basket stabs.

After spending about a month in this manner we returned home and when our holidays ended we again set off towards our respective schools and colleges.

S. M. Mustafa Hasan Abidi,
Senior Intermediate.

Though we had not much hunting, we saw remarkable things and learned of strange happenings.

The various modes of living and the typical dress of people in foreign countries seems strange to visitors unaccustomed to them, while the visitors seem strange to the inhabitants. A man living in the Tundra forest will be much astonished at a man from a warm country. His typical dress of goat skin and his hut with a roof of the same material, will be laughed at by the other. People living in magnificent palaces and splendid buildings will regard with awe the poor peasants dwelling in the forest where life is in great danger from the wild beasts. The foresters are surprised to see the grandeur and pomp displayed by the rich who take great delight in artificial things, vying always with nature.

How healthy bold and radiant-faced are the men dwelling in the forest, enjoying the fresh breeze come straight from heaven! How full of life and vigour having the warm blood running in their veins are those men who appear to city dwellers so vulgar and rough! How happy are the men who after a very hard day's labour enjoy the company of their innocent children!

No doubt they have to face danger's in many ways, but one who comes on the stage, sooner or later learns to act. Had the men living in the forest been ignorant of this, no trace of humanity would have been found on earth. Adam was not placed in a palace from Heaven and his descendants for centuries had no houses to dwell in. They were leading happy lives having none of the anxieties of the modern world to wrack their brains. Generally we see that in antiquity men lived to a considerable age. It was all on account of living in forests, enjoying the natural scenery that their frame was strengthened and they lived for long periods.

Forest life has in many cases been found very useful to men at large. Some of the poor peasants have a knack in

"And out again I curve and flow
To join the brimming river
For men may come and men may go
But I go on for ever."

This stanza reminded me of the mortality of human beings; that these people now taking a bath in the Ganges would pass away and their places would be taken by their descendants, just as they were taking the place of their fathers, but the river would still flow on in its own way.

There was a grove of guava trees, and sitting on the verandah in the afternoon under the shade of these, gazing at the flowing current through the gaps between their trunks, our days would pass. Every day there was the ebb and flow of the tide on the Ganges, the shifting of the shadows of the trees from west to east; the rejoicings of the village children in the evening and the songs of the women carrying pails of water, singing their hymns in Hindi, would never be forgotten. In short we all enjoyed ourselves, and I was the more glad to see my father getting strong.

Some days would be cloudy from early morning, the opposite woods black, and black shadows moving over the river. Then with a rush would come the vociferous rain, blotting out the horizon; the river swelling with suppressed heavings. In such cases as this the villagers would assemble in the evening to thank God for His bounty in anticipation of a good crop.

Getting weary of the daily routine in that village we thought of having a change. All of us began to ponder over the question as to what should be done. My father proposed that we should go hunting in the thick forest ten miles further. This being unanimously passed, we resolved to start the next morning.

A Family Holiday

It was in the beginning of summer that my brother, uncle and two of my cousins who where studying in different schools and colleges in the U. P. came back home to enjoy the vacations. Our village, situated on the banks of the Ganges, was known as Mustafabad. As we were finding the vacations dull, we resolved on a picnic.

On the appointed day we started at dawn with the necessary equipment. We went to a village on the other side of the Ganges to spend some days there for our recreation. The whole of that day the water of the Ganges was very turbulent. In the evening we came to a small village situated in the vicinity of the place where we had landed.

We had a great curiosity to see a village on the other side of the Ganges. It was the first opportunity that we happened to see one. Its clusters of cottages, its thatched pavilion, its lanes and bathing places, its games and gatherings, its fields and markets, in short its life as a whole greatly attracted us. It was a very delightful scene to see the poor peasants going to the holy river after being encircled the whole greatly attracted us. It was a very delightful scene to see the poor peasants going to the holy river after being encircled the whole day in the bounties of nature and taking a bath in the evening and thanking God in verses composed by the ancient Hindu poets. The Ganges rising in ripples welcomed her worshippers in full acclamation with her sonorous voice. The water was now less noisy and the horizon could be seen shaking under the water which was so calm and serene that it recalled to my mind a stanza of "The Brook."

The East still has something to teach the West as it always had. Our philosophers have attained to the spiritual side of things more than their fellow-thinkers on the other side of the Mediterranean. They have inherited this truth about life from their masters who searched for it not in the happy environment of men and manners but in the lovely, natural and rugged surroundings of hills and dales.

Society has not a little to do with the expulsion of happiness from modern civilised life. The West has experienced the wisdom of the little saying that 'truth is stranger than fiction.' With the total elimination of truth from modern life it has become alien to human nature. Our lives are regulated mostly in a farcical manner based mainly on fictitious episodes.

Only equality and duty, truth and morality combined with an institution standing for these worthy ideals can breathe into us a sense of the blessedness that can be got from life.

S. M. ABBAS, SENIOR, B. A. CLASS.

In the last chapters of his 'Outline of World History' Mr. Wells tries to conjecture the state of affairs in a future civilized world with supermen adorning and regulating its numerous wholesome affairs with all the precision of divine activity. The range and scope of human happiness, according to him, will have developed into a perfected state. Modern machinery will also have culminated in a vast scheme to serve humanity in producing means of simple and easy not less than of luxurious living. 'Gathered together at least under the leadership of man, the student-teacher of the universe, unified, disciplined, armed with the secret powers of the atom and with knowledge as yet beyond dreaming, life, for ever dying to be born afresh, for ever young and eager, will presently stand upon this earth as upon a footstool, and stretch out its realm amidst the stars, which will have disclosed their secrets to man and in so doing advanced him to attain perfect happiness even from sordid materialism which in our own time does not seem to consist with it.

It must be the present and not the remote future that should interest us. One nation and one race throughout the whole world is as impracticable as is the mass destruction of all flying machines. They did not come before they were wanted but rather late. What is needed is not the complete ruin of the modern mechanical age so much as a sense of duty and a strength of the highest morality.

The evolution of some form of government which teaches not only equality, unity and justice—which democracy is vaunted to do—but also morality and duty. Imparting of knowledge so that it may lead forthcoming generations to realize that they are the messengers of true happiness to mankind, not in pursuing but in renouncing, is the only means of getting near to the reality of things. The more we cry for happiness, the more we recede from it. The more indifferent we are towards it, the more we find it.

and pleasure-giving than seeking pleasure itself. God is not always in His heaven, he is amidst us too; and all is not right with the world unless we do something to eliminate wrong. Milton and Goethe and Carlyle are being and must be more often read them Byron and Browning.'

If there is anything that can bring happiness back to us it is the conception of equality—equality not in mere opinion but in rank, in offices and in position in life. Islam taught the world that all mankind is one, that every man is every other man's brother and that no one deserves to be rated or ranked higher than another unless it is because of one's higher station in moral life. Only morality can procure us pleasure—doing good not for fame or popularity but for its own sake. The satisfaction one derives from doing good is real pleasure. It is a spiritual pleasure and surpasses physical pleasure inasmuch as the former does not demand reciprocation while the latter is merely purposeful and repercussive and does not even last long, its duration being confined to the return of the impulse.

Socialism in its infancy is a poor affair. In its rudimentary stages the entire abolition of wealth and nobility grows too much on the nerves even of the pioneers and promoters of the movement to ensure happiness. The rich die for the want of riches, the poor because of them. When socialism has run for about a generation it becomes the best form of government humanity has ever known. Children who have seen their parents in farcical luxury realize that efficiency and ability do move to endure happiness and well-being than wealth. Children who have seen their parents exult to the limit of their ability and skill are the happiest and best children ever born. Coupled with a sense of this awakening adequate education imparted to produce types not only of the highest skill and efficiency but also of the highest moral order, a nation comes to be born which stands on the threshold of a new era worthy to make a bold stand against all crude forms of ruinous tyranny and a model institution for mankind to take lessons from.

country without for a moment considering his own personal interests or prejudices, is a grievous mistake. Popularity does not always consist with efficiency, and lust for personal gain is not alien to human nature. We do well to propagate unpopular notions against unduly popular persons lest they shirk their duty towards their country at critical junctures.

Well might Mr. Galsworthy have added half a dozen more new factors that have come into the life of the civilized world only to spread and add more discontent than otherwise, in his address to America just after the peace treaties. His conception of democracy is the best that can be conceived. But alas it is not practicable. 'Human nature is elastic and hope springs eternal'. Who doubts all that? But a party vested with unlimited political powers through the growing need of the populace for unity as much as for equality destroys the elasticity of human nature, and leaves only hope which is more often than not a blind hope depending mainly on the interests of the bureaucracy. The age-long craving for happiness is not of recent birth. Men of all ages have tried to evolve institutions which to them were of the highest value and esteem to bring about harmony in life and to eliminiate all discordant notes which stand in the way of coping with human expansion and requirements.

It is as essential to discover a perfect form of education to provide happiness as it is to bring into being an ideal constitutional institution. Children should be taught to understand their relation with life at large and the past they shall have to play in making it beautiful and sublime. They should be made to grow in the knowledge of the transitoriness of life as of all earthly things. Haldane's message to the students of Edinburgh University should be the keynote of everyone of us, and ringing in our ears always it should enable us to hear more clearly the great and noble truth that 'blessedness is better than happiness and that seeking God is more pleasant

It is said that the universe is expanding. So is democracy. It began with the deadening of feudal loyalty, to represent the perfect 'government of the people, for the people, by the people. 'The president as the head of its multifarious activities, with his growing popularity and the ever-increasing administrative and executive powers at his disposal, less frequently due to his ability than to that desire in human nature which finds expression in lavish hero-worship, guides his nation through ruin and destruction to ruin and destruction. It sounds incredible but is not so. Democracy works its way up to dictatorship and back again to democracy, after it has gone through serious economic and financial shatterings.

Individual representation throughout a nation is bound in time to produce set ideas about economic, financial and political aims unless it is checked often by units of varying opinions. It is more so when a nation has recently come through a grave crisis and when a single person does everything right and lifts his nation from a precarious condition to security. There one heaves only one voice—the voice of the nation. And this one voice is so characteristically representative of the president's own that if it is allowed to proceed unchecked and unopposed very soon the voice of president becomes the voice of the nation. The entire nation becomes so preoccupied with one aim, and opinions are identical to so great an extent that they become the one voice of that one personality which ultimately becomes the paramount power in whose dictates, wise or otherwise, the nation finds its true expression. Such has become the rather lamentable case of Mr. Gandhi who, with all his wisdom and ability; lacks a balanced mind.

Naturally this is what the popular person wants: that he should be the only representative of the faith and hope of his nation. And to expect that with as much power as he grows to command at his disposal, he will do only what is good for his

Writing at Large

Pleasure is and ought to be merely the by-product (for want of a better word) of our existence; not only because it is difficult to attain and impossible to retain but also because it has the unique property of transforming everything it is brought to bear upon into self-interest and egotism which do not of course consist with humanity. It is the degenerate institution of regulating our ephemeral lives entirely in opposition to that manner of life which we are expected to lead. It goes even against the basic principles of creation, morality, duty and of that strength of faith and hope in the pursuit of which eminent practical thinkers have found the significance of the soul of man, although they have come to the startling truth that 'man has been sent to the world to accept it not merely to know it; that 'life is something to be endured and if possible enjoyed,' that 'it is a progress from want to want, not from enjoyment to enjoyment' and that 'living luxuriously is mostly living by proxy.

Their views are pessimistic, but it is an optimistic pessimism. The truth of life and the secrets of the soul are no longer hidden to them. They have felt what they were made to feel—the station and the importance of man in the toil and turmoil and the uncertain vicissitudes of life. They know life to be rotten but they have learnt to endure it and this is the cause of their exaltation amidst endless suffering. They are surely not happy—they have seen and felt the worst pangs that life has to offer. And they are certainly not sad—they have got to the root cause of melancholy. They lead the life which it was designed they should lead. They do not make pleasure the prime ideal of their existence. They do not deflect from truth and righteousness and they 'live their lives in God.'

After a month the police found a wandering band of men and women, in which this woman was also included. But I did not get any of my property back save my fountain pen, which she was trying to sell to a policeman and with which I am now writing this story.

SYED HAMEEDULLA HUSAINI,
(III Year.)

A strange story, but true

I was sitting in my drawing room, talking with two friends. I had just come from College and had taken off my shoes, feeling as much satisfaction as a labourer feels throwing a heavy stone from his head.

Meantime a shrill, thin voice came in from the door, "May I come in," and just then a woman about twenty-five, wrapped up in old ragged clothes entered without troubling to wait to hear the answer to her call. All of us were amazed. She came forward and opening an old cloth thrust forward a piece of paper to us. We looked in it. There were written some lines in Urdu and some in English in good-hand writing. The sentence that drew our attention was: "If you will help this poor lady, who has arrived from Quetta after the earthquake, you will have a good reward from her."

We looked at her face which was blushing, and her fair eyes were saying that she was descended from a noble family, but by the harsh claws of poverty, compelled to beg.

I took out some silver coins and handed them to her, and moreover I searched my friend's pockets, who were somewhat Scotch in character, and gave her what I got. She went out, satisfied and murmuring as if saying prayers.

Then we went out of the house to seek some pleasure in the city, and returned at about eight o'clock at night.

I went to my room and found it quite empty, the lock was broken and there was nothing inside except the carpet on the floor. I soon ran to the police station and notified all that had happened. There I saw all my neighbours laughing at each other at their folly—the folly which I had also committed.

in mnay ways an unprecedented age. Whatever we, the sons of India of my generation may have been privileged to do in the past and up till the present, the future lies with younger men and women; and institutions like yours must both regard themselves and be treated as those arsenals of the mind and the heart and of the body where the arms and ammunition and all the equipment are made for the battle that lies ahead. Equip yourselves well with those weapons of learning art, culture and science which a generous University and life within it alone can bring, for these are the greatest weapons of peace and will be your safety armoury in the future—a future which, I assure you, does not lie in bringing the conflicts of the world within your precincts but in endeavouring to remove them wherever they may be found. This is the message which I today give from myself and which I also bring to all you students from a sister University which watches your fortunes with interest; and we wish you and your Alma Mater a long and fruitful life.

In honour of the special convocation an "At Home" was given on the lawns adjoining the Address Hall for the guests and students. The University was closed on 11th January in honour of the Maharaja's visit.

value the compliment paid to its Chancellor and I should like publicly to express on its behalf its deep gratitude to His Exalted Highness for the generous donation made by him to the Benares University as a token of the friendly relations subsisting between the two Universities.

Nothing has touched me more in your Address, Mr. Vice-Chancellor, than the feeling reference you have made to the personal friendship which it is my privilege to enjoy with His Exalted Highness. I also had the privilege of your late illustrious Ruler's friendship, and I value this friendship all the more today, knowing His Exalted Highness's position as the Premier Prince of India, when the unity of the Princes of India is an essential need in any endeavour side by side with British India, to further the common progress of the land of our birth.

I have had occasion, for the first time to-day, to visit the Osmania University and to see its fine buildings, its plan of future construction and its work. I have also had an insight, from the talks I have had with your distinguished Chancellor, Sir Akbar Hydari, and your Vice-Chancellor, Nawab Mahdi Yar Jung, both of whom I have had the pleasure of knowing for a number of years, into the aspirations which govern the present and inspire the future shaping of your University. Its establishment will be one of the many landmarks of the beneficent reign of your Exalted Ruler.

To you, students, I can only say that you are fortunate in having such noble surroundings and such ideals, as for example the imparting of higher instruction in one of the principal languages of India to inspire your education.

You are still young and though we are all proud of the ancient civilisation which is our common heritage, we are, as a whole, in the world of today with its rapid development and changes, a young nation stepping into the arena of a new and

His Highness played an important part in the first Round Table Conference in London where a deep impression was made by his personality and high ability.

In recognition of his great services, of which I have mentioned only a few for the sake of brevity, the Oxford University conferred on His Highness the honorary degree of D.C.L., whilst Cambridge presented him with the LL.D. He has, in addition, the honour of being an A.D.C. to His Majesty the King-Emperor whilst the British Government has bestowed on him the highest Orders and distinctions.

We in Hyderabad feel a sentimental attachment to His Highness in view of the fact that our own August Sovereign and Master, His Exalted Highness the Nizam, has enjoyed during a prolonged period relations of the utmost friendship and cordiality with His Highness of Bikaner. He is at present an honoured guest of His Exalted Highness the Nizam who has, as a mark of his friendship and sympathy, given a donation of one lakh of rupees to the Benares Hindu University towards the endowment of a chair of Indian Culture, with a view to promoting Hindu-Muslim Unity.

The visit of His Highness the Maharajadhiraj of Bikaner to-day to the Osmania University is a matter of pride and gratification to us, and we feel that we are honouring ourselves giving him an honorary degree. I therefore propose that in this Special Convocation the degree of Doctor of Laws of the Osmania University be conferred on His Highness the Maharajadhiraj of Bikaner.

The Maharaja of Bikaner's reply was as follows :—

It is with pleasure that I utilise this opportunity afforded to me of addressing the students of this University and I thank you all for the honour done to me to-day, which both as Maharaja of Bikaner and a Chancellor of the Benares University I deeply appreciate. The University which I represent will also

D.C.L., LL.D., the Ruler of Bikaner State for the conferment on him, *honoris causa*, of the degree of LL.D.

His Highness is among those Ruling Princes whose reputation is not confined to India but extends beyond its boundaries. The valuable services he has rendered to the country in many different spheres and the distinctions he has won both in peace and in war are chronicled in the history of India and of the British Empire, and will be remembered by generations to come. With regard to his distinguished services, it is sufficient to state briefly that His Highness took a personal part in the war in China and the Great War, thus acting up to the martial traditions of his family and setting an example of that personal valour which is the proudest heritage of Rajputs of ancient race. But apart from military prowess, Providence has gifted him with political wisdom and sagacity. Thus during the Great War he was able, as a member of the War Cabinet, to take part in international discussions; and when peace was concluded he was a signatory to the Treaty on behalf of the Indian Empire. In addition to all this, His Highness has had the distinction of representing India on more than one occasion in the League of Nations. He was also elected the first Chancellor of the Chamber of Princes and in that capacity made an earnest endeavour to bring about concord and unity among the Members of the Princely Order. Recently, a reorganizing Committee of that Chamber which was held under the chairmanship of His Highness, put forward certain proposals which if acted upon will help materially in bringing about this result. A clear proof of the interest His Highness takes in education is seen in the fact that he is the Chancellor of an august and learned body, the Benares Hindu University. In his own State of Bikaner, in addition to the many schemes carried out by him for the betterment of the condition of his people, His Highness has made great efforts for the promotion of public education, and more especially the primary education of girls.

Special Convocation

On 9th January 1939, a Special Convocation of the Osmania University was held in the Address Hall, University Buildings, to confer the honorary degree of Doctor of Laws on His Highness the Maharaja of Bikaner.

The hall was crowded with students, professors and guests. Among the distinguished guests who were seated on the dais, besides the higher authorities of the University, were Maharaja Sir Kishen Pershad Bahadur and Sir James Egerton, formerly tutor to H.E.H. the Nizam. The procession of the Fellows of the University entered the hall followed by the Chancellor, the Right Honourable Sir Akbar Hydari.

This was the first occasion, in the history of the Osmania University when a special convocation was held to confer an honorary degree.

The announcement of a donation of one lakh of rupees given to the Benares Hindu University for the endowment of a chair in Indian Culture was much appreciated by the audience present. Such actions bridge the gulf between the two major communities of India and the policy of the rulers of Hyderabad has always been to bring into closer contact the Hindus and the Muslims so that before the Nizam there can be no question of religion, caste or creed. A few years ago a similar donation of one lakh of rupees was given to the institution at Shantinakathi.

The following is the speech delivered by Hon'ble Nawab Mahdi Yar Jung Bahadur:—

I beg to present to you to-day General His Highness Maharajadhiraj Raj Rajeshwar Narendra Shiromani Sri Sir Ganga Singh Bahadur, G.C.S.I., G.C.I.E., G.C.V.O., G.B.E., K.C.B.,

Cultural Progress

Hyderabad under its August Ruler is making a rich contribution to every branch of literature, every seat of learning, every treasure of knowledge and institution of art, because H. E. H. the Nizam himself is a great scholar of his age. His mastery of Persian and Arabic, apart from Urdu and English, could be discovered in conversation, when he freely uses and quotes literary passages. Those who have read his Urdu and Persian verses, cannot but accept his scholarship. He is a second Haroon-al-Rasheed.

In short "the Nizam has elevated the depressed without depressing the elevated; he has filled the treasury without depleting the coffers of his subjects; he has created a modern administrative machinery without destroying the tradition, the ceremonies and the etiquette of the dynasty of Asaf Jahi. May he live long to guide the destinies of his fine country and see in his life-time his beloved Hyderabad as the garden of India."

created that culture, which they preserve dearly. The last 27 years of Hyderabad's History form an eventful epoch of peace of prosperity. The inauguration of the Executive Council is the most outstanding feature of H. E. H. the Nizam's rule.

Judiciary and Executive

In 1921, H. E. H. the Nizam separated the Judiciary from the Executive and this bold attempt has once again constituted a definite lead to the whole of India and has done something for which the British Indian people have been clamouring for the last half a century. The Rail, Road and Air co-ordination has also given a lead to the whole of India. The creation of the City Improvement Board is a memorable event of H. E. H. the Nizam's rule. The function of the Board is to clear slums and build hygienic quarters for the poor and lay out grounds and parks for children. The underground drainage system is another feature of the city's progress.

Along with the capital, the district towns are also receiving their due share in matters of sanitation, water supply and electricity. The medical organisation in the city and the districts can be compared with the best of its kind in British India. A recent development is the Tuberculosis Sanatorium and the Leprosy Hospital. A gratifying development also is a summer resort at Farahabad.

The Government is alive to the awakening of the people and have constituted a Reform Committee under the presidentship of Dewan Bahadur S. Aravamudu Iyengar whose report is eagerly awaited.

Maker of Modern Hyderabad

In the words of Moulana Shaukat Ali, old Hyderabad was picturesque, but the present day city is going to prove to be one of the first of modern towns when all projects and schemes of improvement are undertaken in the near future.

accepted on all hands. Along with the agricultural progress, the government has taken two large-scale industries namely Sugar and Textiles under its control and the other industries like Paper and Oil are also engaging the attention of the Government.

Education

With the establishment of Osmania University, with Urdu as its medium of instruction, Hyderabad again has given a lead to the whole of India and has created history. What little awakening we notice in the younger generation of Hyderabad is due to Osmania University alone. Another first class College, the Nizam College, which is affiliated to Madras University is imparting education in English language. Two Intermediate Colleges, one at Aurangabad and the other at Warangal are affiliated to Osmania University. Apart from this, a Technical College has also been established. A number of High, Middle, and Primary Schools both in Osmania and Madras courses are scattered all over the country.

To introduce free and compulsory primary education, the Government have formulated a Bill which will very soon become a law and solve the education problem of Hyderabad. That day will be a red-letter day in the annals of this historic city. The Mackenzie Scheme aims at the industrialization of the education system and it will be welcome in every corner of the State.

In the words of Hali, the great Urdu poet 'People of Hyderabad live in perfect amity, being tolerant, true, sincere and friendly to one another." All participate in one another's festivals freely. Under their benign Government, they all enjoy equal rights, none having preference, and every one whether he be Parsi, Hindu, Muslim or Christian, looks upon the Deccan as his own mother country. Hyderabad has evolved a culture of its own. Hindus and Muslims by unity and oneness have

Wonderful Changes

During the last 27 years, what wonderful changes have come over Hyderabad. Palatial buildings like the Jubilee Hall, Osmania Hospital, High Court; Osmania Museum, Town Hall, Osmania Unani Hospital, Muazzam Jahi Market State Library and embankments like Nizamsagar and Osmansagar and Himayat Sagar came into existence and speak loudly of the rapid progress that has been made during the last quarter of a century. Historical buildings like Golconda Fort and Char Minar and Mecca Masjid, have done much for the glorification of Hyderabad. Not only the physical characteristics but the intellectual side, have changed. Thanks to the indefatigable efforts of His Exalted Highness the Nizam, Hyderabad can be compared with pride and advantage to any part of India. At the accession of the present Nizam the finances of Hyderabad were in a crucible, but very soon His Exalted Highness was able to husband the finances of the country and put them on a solid and sound basis. The rapid progress of Hyderabad was mainly due to its sound finances. It is a remarkable achievement of H. E. H. the Nizam's reign. The most remarkable feature of the policy is that it imposes no fresh taxation, such as the burden of income tax. The purchase of the railway is one of the outstanding triumphs of Hyderabad's financial policy.

Rural Re-organisation

As Hyderabad is mainly an agricultural country, the Government has devised means to better the condition of the rural population. The Debt Conciliation Regulation, the Lands Alienation Regulation, Money-lending Regulations are calculated to promote the welfare of the agricultural community. The Government has established a model village at Patancheru and with the help of the Agricultural Department, is trying to induce the agriculturist to adapt himself to the changing times. The present condition of the agriculturist of the Dominions is better than in any of the British provinces. This has been

His Exalted Highness's Work for the State

Twenty Seven Years Of Progress

(By S. K. BURHANULLAH, IV YEAR, OSMANIA)

"Everywhere there are evidences; in irrigation you have more than one magnificent project in the course of construction or under examination; your railway policy is destined to play an incalculable part in the development of the country's commerce and industry. Co-operative societies are receiving impetus which will give them their due share in the general plan of development, but of course that which strikes one's eye, returning after many years, is the greatest town improvement scheme. So much has been done already that I am sure in a few years you will make this ancient city of Hyderabad a fitting and worthy capital of the ruler of the Premier State and Faithful Ally of the British Government," thus observed Lord Hardinge, ex-Viceroy of India, who visited Hyderabad in December 1930, and this bears testimony to the progress of Hyderabad during the last 27 years of reign of His Exalted Highness the Nizam. In the words of Sir Samuel Hoare, we call our August Ruler, an "Ideal Man", who spares no pains in bettering the condition of the subjects. The happiness of his subjects was his happiness and their sorrow, his sorrow. If he sleeps, he sleeps only to be able to work for the welfare of his subjects and if he eats, eats for the sake of his subjects. His plain living and high thinking are the source of inspiration to many of his subjects. He resembles the Caliphs of Islam in respect of simplicity and dignity, which are the two qualities that distinguish the culture of the East. He is really a faqir, or saint in the majestic robes of a monarch. The citizens of Hyderabad are very proud of their Ideal King.

examination and so wins the Hydari Gold Medal. He has won many laurels both in the University and elsewhere. We wish him success and hope that he will gain the Walker Medal next year. We also congratulate the other successful candidate Mr. Mohamid Ali Abbasi.

This year the Science Union is shaking of its drowsiness and holding lectures regularly. Hoping to overcome their financial difficulties, they gave a Variety Show which was a success although they did not raise quite the sum hoped for.

The past term has been a busy one and a long list of functions of all sorts makes us wonder whether more use might not be made of the first two terms. For outdoor events the monsoon is of course a hinderance but not for indoor functions. The difficulty has been largely reduced by the large Address Hall.

Mr. Ghazi and Mr. Mahajir won the trophy for the Osmania University in the All India Urdu eloqution competition held at Aligarh. Mr. Ghazi stood first and Mr. Mahajir got a special prize. We congratulate both the speakers for their success.

Our next issue will be the Editor—Number. We hope that all the Ex-Editors and the Ex-Assistant Editors of the Osmania Magazine will kindly contribute for the next issue.

Finally we wish to make it quite clear that it is not our aim to supply only readable material to the students but also to encourage them and help them on their way to journalism. Hence we have published several articles by junior students. This issue is unique in being almost representative of the students, and we have not published articles by outside contributors to increase the bulk and standard of the Magazine.

Editor.

that other students will follow the example of Shaharbano Naqvi.

"The World of Books" is an article written by Naimuddin Siddiqi in the extempore competition held during the College—Day activities, for which he received the first prize.

We have had to withhold some articles due to want of space. We promise to publish them in the next issue. Some of them however, are too long for the Magazine. They are almost theses and we hope that the students will pay greater attention to precision of style and suitability.

On 14th November 1938 a meeting was held in the University to express our sorrow at the death of Mustapha Kemal Ataturk, the ruler of Turkey. The work of this great man is so well known that we need not dilate upon it here. A similar meeting was held for Maulana Showkat Ali on 28th November 1938.

This year we have had a brilliant success in games. The University won the finals both in Football and Cricket. We congratulate the Captains, Secrataries and players of both the teams and hope that the success will be repeated.

The University authorities have made arrangements for physical Instruction for day—scholars on Wednesday. We hope that the students will try to make the most of it by their regular attendance.

In the Hyderabad Civil Service competition the University was more succesful than last year. It is satisfactory to note that, although only two of our candidates were taken, those two occupied the first places. Although quantity is lacking, quality seems to be present. Mr. Abbas Ali Khan, a former Assistant Editor, and the present President of the Osmania Students Union stood first in the Hyderabad Civil Service competitive

Editorial and News

The twelfth year of the Osmania Magazine's career begins with this issue which is in time and not late like some of its predecessors. We took charge of the publication in the last week of November and it will be in the hands of the readers in March. We have been successful in publishing a double number in three months which our predecessors found difficult to publish in six months and complained of the "lack of co-operation from the students" and had to write in the Editorials that "we were disappointed in nine out of ten cases in getting articles." I thank those who have kindly contributed to the English Section.

The Osmania University has conferred an Honorary degree of L.L.D. to The Maharaja of Bikaner in a special convocation. We have given the speech delivered by the Maharaja, who is one of the best speakers among the princes.

To encourage the students of the University we have decided to set four subjects to the students to write during the summer holidays. Eight prizes will be given, two for each subject. Every student is allowed to write on more than one subject. The articles should not exceed ten pages of foolscap size.

1. A short Story.
2. Any place of historical interest which you have visited.
3. "Science is both a blessing and a curse."
4. Modern architecture.

The articles should come before the 15th of May on the following address.

Mir Abid Ali Khan C/o. Mr. Mir Yassen Ali Khan Jagirdar near Kachiguda Station No. 3148.

At long last, we have been successful in getting an article from the Osmania University College for Women. We hope

MR. MIR ABBAS ALI KHAN, B. A. (OSMANIA),

A former Assistant Editor, and the present president of the Osmania Students union stood first in the Hyderabad Civil Service competitive examination and so wins the Hydari Gold Medal. He has won many laurels both in the University and elsewhere.

CONTENTS

Vol XII Nos. 1 & 2 Page

1. Editorial ..

2. His Exalted Highness'
Work for the State 27 Years of Progress
By S. K. Burhanulla, (IV Year, Osmania.) .. 1

3. Special Convocation. .. 6

4. A Strange Story but True.
By Syed Hameedullah Hussaini, (II Year.) .. 11

5. Writing at Large,
By S. M. Abbas (Senior B. A.) .. 13

6. A Family Holiday.
By S. M. Mustafa Hassan Abidi (Senior Inter.) . 19

7. Personalities (continued).
By D'Artagnan (Osmania). .. 23

8. Ukraine.
By M. Moinuddin, M. Sc. .. 27

9. The World of Books.
By Mohd. Naimuddin Siddiqi (Junior B. A.) .. 31

10. The Status of Women under the Nazis.
By S. K. Sinha, (III Year Arts.) .. 35

11. Farhabad.
By Akbar H. Latif (Senior B. A.) .. 38

12. Haunted House.
By Shaharbano Naqvi, (Senior B. A.) .. 42

13. Our Motor Cycle Trip to Bombay & Agra.
By Mohd. Abdul Lateef, (LL. B. Previous.) .. 44

14. Warren Hastings.
By Syed Baqir Riza Wasti, B. A. .. 49

15. Osmania University Cricket Club
Report for 1938 to 1939
By Mullick Arjun M. Patel. .. 56

Annual Subscription.

		Rs.
From Government	... ...	12
,, Universities, other Institutions and State Officials	...	8
,, General Subscribers	... ...	6
,, Old Boys, Aided Societies and Reading Rooms	...	5
,, Present Students, Osmania University	... ...	4
,, Abroad	... ...	Fifteen Shillings.
,, Old Students, Abroad	... ...	Ten Shillings.
,, Single Copy	... ...	Two Rupees.

Note :—Registrations and V. P. P. Charges Extra.

Can be had of :

OSMANIA MAGAZINE OFFICE

OSMANIA UNIVERSITY

HYDERABAD-DECCAN.

The Osmania Magazine

Vol. XII Nos. 1 & 2

ADVISORY BOARD

President.
Qazi Mohammed Husain Esq., M.A., LL.B., (Cantab.) Pro-Vice-Chancellor.

Advisor, English Section.
Prof. F. J. A. Harding, M.A. (Oxon).

Advisors Urdu Section.
Dr. Moulvi, Abdul Haq, B.A. (Alig.), D. Litt. (Allah.)
Dr. Syed Mohiuddin Qadri Zore, M.A., Ph.D. (London).

Honorary Treasurer.
Prof. Wahidur Rahman, B.Sc.

MANAGING COMMITTEE

1347—48 F.

President.
Qazi Mohammed Husain Esq., M.A., LL.B. (Cantab.), Pro-Vice-Chancellor.

Advisor, English Section.
Prof. F. J. A. Harding, M.A. (Oxon.)

Advisors Urdu Section.
Dr. Moulvi, Abdul Haq, B.A. (Alig.), D. Litt. (Allah.)
Dr. Syed Mohiuddin Qadri Zore, M.A., Ph. D. (London).

Honorary Treasurer.
Prof. Wahidur Rahman, B. Sc.

Secretary.
Mohd. Abdul Ali Khan, B.A. (Osman.)
Managing Editor & Editor, Urdu Section.

Mir Abbas Ali Khan, B.A. (Osman.)
President, Students' Union.

Mir Abid Ali Khan, (B.A. Final).
Editor, English Section.

Mohd. Shamshuddin, B. A.
Asst. Editor, Urdu Section.

THE

OSMANIA MAGAZINE

BEING

THE JOURNAL OF THE STUDENTS

OF

The Osmania University

HYDERABAD-DECCAN.

EDITOR

MIR ABID ALI KHAN (B. A., Final).

Vol. XII 1939 Nos. 1 & 2

Printed at

THE OSMANIA PRINTING WORKS,

87 - E & F - Kingsway, Sec'bad.